www.iqbalkalmati.blogspot.com

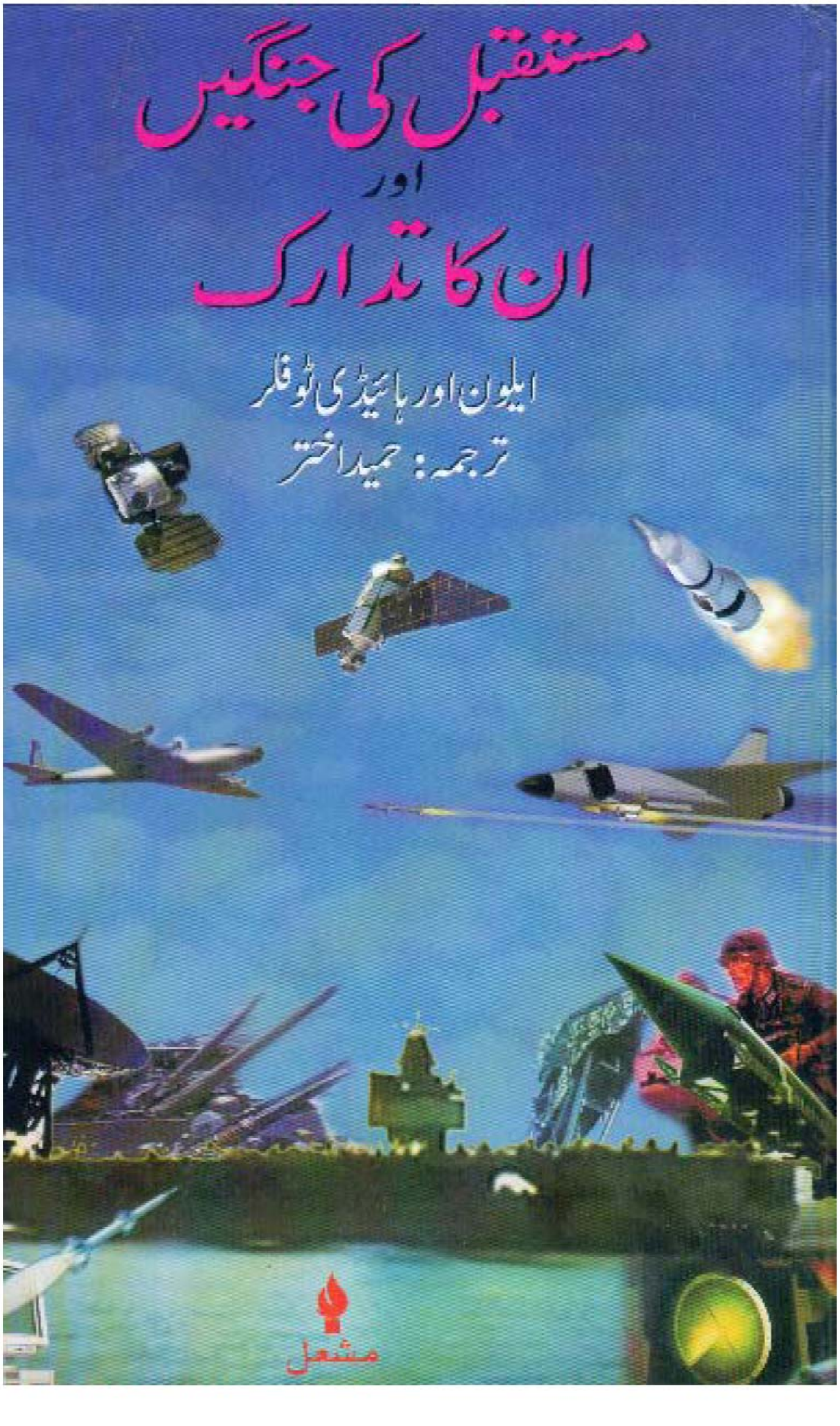

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مستقبل کی جنگیں
اور
ان کا تدارک

ایلون اور ہائیڈی ٹوفلر
ترجمہ: حمید اختر

مشعل
آر۔بی۔۵، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس
عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔54600، پاکستان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ترتیب

پیش لفظ	5
تعارف	11
پہلا حصہ	
آویزش؟	15
خوشی کا دور ختم	20
تہذیبوں کا تصادم	27
دوسرا حصہ	
انقلابی حقیقت پسندی	38
تیسری لہر کی جنگ	85
جنگی اقسام کا تصادم	111
تیسرا حصہ	
تلاش00	118
فضائی جنگیں	131
داونچی کے خواب	161
خونریزی کے بغیر جنگ	171
چوتھا حصہ	
علم	189
جاسوس کا مستقبل	208
پانچواں حصہ	
خطرہ	242
جن کھلا چھوڑ دیا	257
خوابوں کی دنیا	277
تین حصوں میں بٹی دنیا	289
چھٹا حصہ	
امن کی شکلیں	300
اکیسویں صدی اور گلوبل سسٹم	326
توازن کا خاتمہ	339

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پیش لفظ

''مستقبل کی جنگیں اور ان کا تدارک'' کو اکیسویں صدی کی کتاب کہا جا سکتا ہے- اگر چہ یہ بیسویں صدی کے آخری عشرے میں لکھی گئی اور اسی زمانے میں شائع ہوئی- اس سے پہلے ایلون اور ہیڈی ٹوفلر' دونوں میاں بیوی کی ''فیوچر چرشاک''، ''پاور شفٹ'' اور ''تھرڈ ویو' کے عنوان سے ایسے ہی یا اس سے ملتے جلتے موضوعات پر حیرت انگیز تصانیف شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں-ان کی موجودہ تصنیف میں گزرے ہوئے کل اور انسانی تاریخ کے تجربات وحوادث کی روشنی میں' آنے والے زمانوں میں بنی نوع انسان کو پیش آنے والے مسائل کا نہ صرف انتہائی بالغ نظری سے احاطہ کیا گیا ہے بلکہ اس کرۂ ارض کو امن اور سلامتی کا ایک گہوارہ بنانے کے لئے اس پر آباد نسل انسانی کی رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیا گیا ہے-

زیرنظر تصنیف تو اب سے پانچ چھ برس قبل پہلی بار منظر عام پر آئی تھی' لیکن اس سے پہلے ''تیسری لہر'' (جس کا اردو ترجمہ مشعل نے شائع کیا ہے) نے اپنی اشاعت کے پہلے ہی سال دنیا بھر میں تہلکہ مچا دیا تھا- اسے بجا طور پر تہذیبوں کی داستان قرار دیا گیا تھا- نئی کتاب ایک لحاظ سے اس کا تسلسل ہے' مگر اسے انسانی سماج کی اس سے اگلی کڑی سمجھنا چاہیے- اس میں اس کرۂ ارض پر رہنے والے اربوں انسانوں کی زندگی' ان کے مسائل اور ان کو پیش آنے والے متوقع خطرات کا انتہائی باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ہے- ٹوفلر جوڑے کے تجزیے کے مطابق' نسل انسانی اب تک' تبدیلیوں کی دو عظیم لہروں میں سے گزر چکی ہے- تبدیلی کی پہلی لہر____ زرعی انقلاب نے اپنے اظہار میں دس ہزار سال گزارے- دوسری لہر یعنی صنعتی تہذیب کے عروج نے تقریباً تین سو سال لئے- آج تاریخ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی رفتار پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ یہ تیسری لہر پوری تاریخ کو شکار بنا کر چند ہی عشروں میں اپنی نئی تہذیب تشکیل کر ڈالے- زیر نظر کتاب میں تیسری لہر کی اس نئی دھماکہ خیز تہذیب کے، جس نے کرۂ ارض کے ایک بڑے حصے پر پہلے ہی قبضہ جما لیا ہے، اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے اور دنیا میں رونما ہونے والے واقعات اور تیزی سے اس کی شکل تبدیل کرتی ہوئی تبدیلیوں کی جو چاپ سنائی دے رہی ہے، اسے اس کے فاضل مصنفین نے نہ صرف سنا، بلکہ سمجھا بھی ہے اور اس سے اکتساب کر کے آنے والے زمانوں کی اچھائیوں اور برائیوں کی تصویر کشی کی ہے-

اس کتاب کے مصنفین کی طرف سے دنیا بھر میں رونما ہونے والے دہشت گردی کے واقعات کی روشنی میں جن امکانات کی نشاندہی کی گئی ہے، اس کی اصابت کا یقین گیارہ ستمبر 2001ء کو نیو یارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون پر دہشت گردی کی وارداتوں کے بعد آسانی سے کیا جا سکتا ہے- ایسے ہی جن دیگر خدشات کا اظہار اس کتاب میں کیا گیا ہے، وہ یقیناً حقیقی اور بنی نوع انسان کے لئے خطرے کی علامت ہیں- مصنفین کا یہ بیان کہ ''دہشت گردوں کو کسی ریاست کے تحفظ کا مسئلہ درپیش نہیں ہوتا-'' دانش مندوں کے لئے غور وفکر کے نئے در وا کر دیتا ہے- سرد جنگ کے برسوں پر محیط زمانے میں اگر سوویت روس اور امریکہ، انسانی تباہی کے لئے تیار کئے جانے والے ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے سے محترز رہے تو اس کی وجہ ان کی حکومتوں کی، اپنے اپنے ملکوں کے تحفظ کی ذمہ داری تھی، لیکن دہشت گردی کی بڑھتی ہوئی وارداتوں میں ملوث سرپھرے، نسلی، لسانی اور مذہبی جنونیوں کے پاس کھونے کے لئے کچھ نہیں، سوائے اپنی ذات کے اور وہ بھی کبھی کبھار- اس لئے کتاب کے مصنفین نے ان کی طرف سے انسانی زندگی کو پیش آنے والے متوقع خطرات کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ، بدلے ہوئے حالات میں حکومتوں اور انسانی معاشروں کی ترقی میں دلچسپی رکھنے والے اداروں کی توجہ ان کی ذمہ داریوں اور ان ضروری اقدامات کی طرف بھی مبذول کرائی ہے، جو اس برائی کا سدباب کر سکتی ہیں- یہی نہیں، انہوں نے ان خطرات کی نشاندہی بھی کر دی ہے، جو دہشت پسندوں کے ہاتھ خطرناک ہتھیاروں تک پہنچنے سے پیش آ سکتے ہیں- ان کا یہ دعویٰ کہ کوئی عجب نہیں ایسا وقت بھی آ جائے جب مجرموں کے سنڈیکیٹ یا دہشت پسندوں کے لسانی اور مذہبی گروہ ایٹم بم تک تیار کر لیں یا کسی سے حاصل کرنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں کامیاب ہو جائیں' چند برس قبل تک یہ محض خیالی دعویٰ معلوم ہوتا تھا مگر ٹیکنالوجی کی ترقی عام ہونے اور کثیر تعداد کی اس شعبے میں رسائی کے بعد آج کے حالات میں اس پر یقین کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے- سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسے مجرم اور دہشت پسند گروہ جب ملکوں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے مطالبات منوانے پر تُل جائیں گے تو اس کرۂ ارض کے باسیوں کا کیا حشر ہوگا؟

ٹوفلر جوڑے نے اپنے تھیسس میں ایسی صورت حال سے نکلنے کے راستے بھی تجویز کئے ہیں' جس طرح ان کے بہت سے پرانے دعوے اس وقت مبالغہ آمیز نظر آتے تھے' جب یہ پہلی بار سامنے آئے' مگر بعد میں ان میں سے بیشتر درست ثابت ہوئے اسی طرح اس دنیا کو جو جنگ کے خطروں اور دہشت گردوں کی مذموم کارروائیوں کی زد پر ہے' امن کا گہوارہ بنانے کے لئے ان کی یہ تجاویز یقیناً غور وفکر کی متقضی ہیں اور یہ امر اطمینان بخش ہے کہ امریکہ اور یورپ کے دانشور حلقے ہی نہیں' حکمران بھی ان پر سنجیدگی سے توجہ دے رہے ہیں- جنگوں میں وسیع پیمانے پر ہونے والی ہلاکتوں کی بجائے' کم سے کم جانی نقصان کے ذریعے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کی تجویز پر ایک حد تک' امریکہ نے نوے کے عشرے میں خلیج کی جنگ کے دوران عمل بھی کیا اور اس کے بعد امریکہ کے پالیسی سازوں اور فوجی ماہروں نے ٹوفلر جوڑے سے باقاعدہ رابطوں کے ذریعے مہلک ہتھیاروں کی تیاری اور وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے' بالخصوص شہری علاقوں کو جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنے کے بارے میں بار بار تبادلہ خیال کیا ہے' جس سے یہ امید بندھتی ہے کہ آئندہ اگر کوئی بڑی جنگ ہوئی تو شاید وہ اپنی ہلاکت آفرینی میں دوسری جنگ عظیم کے مقابلے میں کہیں کم ہوگی-

ٹوفلر جوڑے کا یہ دعویٰ دنیا بھر کے دانشوروں اور کاروباری دنیا کے بارے میں فیصلہ کا اختیار رکھنے والوں کی توجہ کا مستحق ہے کہ دوسری لہر کی تہذیب جو صنعتی انقلاب کے بعد' تین سو برس تک دنیا پر حکمران رہی' وسیع پیمانے پر پیداوار' وسیع ہلاکتوں کی جنگوں اور وسیع منڈیوں پر استوار تھی اب زوال پذیر ہو چکی ہے- اب جس طرح وسیع پیمانے کی پیداوار کا وہ پرانا طریقہ متروک ہو چکا ہے' اسی طرح ' اس سے جڑا ہوا وسیع ہلاکتوں کا جنگی نظام بھی ختم ہونے کے قریب ہے- ان کی یہ مثال لائق توجہ ہے کہ دوسری لہر کے جاپان کو اپنی صنعتوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی بقا کے لئے کوریا' منچوریا اور کچھ دوسرے علاقوں پر بزور قبضہ کرنا پڑا مگر ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ' تیسری لہر کی تہذیب اختیار کرنے کے بعد جاپان' نو آبادیوں کے بغیر اور اپنا خام مال نہ ہونے کے باوجود آج اس دور کے مقابلے میں کہیں زیادہ امیر اور خوش حال ہے۔ ضرورت اب اس بات کی ہے کہ جس طرح دولت کی پیدائش کے طریقے بدلنے سے' تیسری لہر کے زمانے کے ممالک میں جنگ کے طریقے بدل رہے ہیں' اسی طرح امن کی نئی قسم متعین کی جائے' تاکہ یہ کرۂ ارض کشت وخون کے واقعات سے محفوظ رہے۔

اس انتہائی فکر انگیز کتاب میں اتنے اچھوتے موضوعات اور انسانی معاشرے میں رونما ہونے والی اتنی اہم تبدیلیوں کا جس خوبصورتی سے تجزیہ کیا گیا ہے' ان سب کا احاطہ کرنا اس مختصر تحریر میں ممکن نہیں ہے۔ اس کی گہرائی اور عصری مسائل سے اس کے تعلق کو ماپنے کے لئے' اس کا مطالعہ ہر ذی شعور انسان کے لئے لازم ہے۔ اس میں تہذیبوں کے تصادم' زمانہ قدیم کی لڑائیوں' دولت آفرینی کے طریقوں' میڈیا کی بڑھتی ہوئی اہمیت' ٹیکنالوجی کی تیز رفتار ترقی' مواصلات اور فضائی سیاروں کی فراوانی کا اس تفصیل اور خوبصورتی سے جائزہ لیا گیا ہے کہ ان حقائق سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد قاری اپنے آپ کو واقعی اکیسویں صدی میں سانس لیتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

اس لئے اگر اس کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد واشنگٹن پوسٹ اسے..... غیر معمولی اور آنے والے زمانے کی چونکا دینے والی جھلکیوں پر مشتمل تصنیف قرار دیتا ہے' تو اسے درست تسلیم کرنا پڑے گا۔ نیٹو کے سیکرٹری جنرل مین فریڈ وورنر کا یہ تبصرہ بھی غور طلب ہے کہ ''یہ تصنیف وقت کی ضرورت ہے۔ ایک طرف یہ اقتصادیات اور جنگ کے باہمی تعلق کے بارے میں دور بینی کی ایک تازہ کوشش ہے تو دوسری طرف تہذیب اور اخلاقیات کے درمیان غیر مرئی تعلق کی نشاندہی بھی کرتی ہے۔''

یہ امر بہرحال اطمینان بخش ہے کہ دنیا میں دہشت گردی کی بڑھتی ہوئی وارداتوں' آج کے بظاہر انتہائی طاقت ور ملکوں کی کمزوریوں اور پریشانیوں' بدلتے ہوئے زمانے کی اذیتوں اور انسانوں کے باہمی رشتوں کی تیزی سے بدلتی ہوئی حقیقتوں کا عکس دکھانے کے بعد بھی مصنفین' انسان اور اس دنیا کے مستقبل سے مایوس نظر نہیں آتے' وہ اپنی تصنیف کو رجائیت اور بہتر مستقبل کی اس توقع پر ختم کرتے ہیں کہ ''ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

واقعے کے بعد اگرچہ دنیا میں پچاس سے ساٹھ ہزار تک ایٹم بم تیار کئے جا چکے ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان ہزاروں بموں میں سے کہیں بھی.... غصے میں اٹیم بم استعمال کرنے کی کوشش تک نہیں ہوئی۔ انسانی زندگی کی بقاء اور تحفظ کے جذبے نے اس انگلی کو پوری طرح قابو میں رکھا ہے جو اس (بم) کا بٹن دبانے میں استعمال ہو سکتی تھی۔

اس لئے ان کے خیال کے مطابق دنیا میں امن کے قیام اور انسان کے بہتر مستقبل سے مایوس ہونے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں ہے۔ مگر اس کے لئے ٹوفلر جوڑا یہ وارننگ دینا نہیں بھولا کہ ''البتہ اگر ہم نے گزرے ہوئے کل کی دانش سے کام لینے کی عادت ترک نہ کی تو اکیسویں صدی میں بہتری کے یہ امکانات تیزی سے معدوم ہو جائیں گے۔''

حمید اختر

لاہور، 6 اکتوبر 2001ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تعارف

یہ کتاب آنے والی جنگوں اور ان کے تدارک کے بارے میں ہے، یہ بوسنیا کے اس بچے کے بارے میں ہے جس کا آدھا چہرہ بارود کی نذر ہوگیا۔ یہ اس کی بے بس ماں کے بارے میں ہے جو غم ناک آنکھوں کے اپنے جگر گوشے کے باقی بچے ہوئے آدھے چہرے کو گھورے جارہی ہے۔ یہ آنے والے زمانے کے ان معصوم لوگوں کے بارے میں ہے جو یہ جانے بغیر کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں، مارتے اور مرتے رہیں گے۔ یہ امن کے بارے میں ہے جس کا مطلب ہے کہ یہ نئے چونکا دینے والے ان حالات میں لڑی جانے والی جنگ کے بارے میں ہے، جنہیں ہم انجانے مستقبل کی طرف پیش قدمی کے دوران پیدا کرتے جائیں گے۔

ایک نئی صدی ہمارے سامنے بازو پھیلائے کھڑی ہے۔ ایسی صدی جس میں انسانوں کی بھاری تعداد کو بھوک کے پنجے سے نجات دلائی جا سکے گی۔ جس میں صنعتی دور کی کثافت کا شکار ہونے والوں کو دوبارہ بحال کیا جا سکے گا اور انسانیت کی خدمت کے لئے، کثافت سے پاک ٹیکنالوجی تخلیق کر لی جائے گی۔ ایک ایسی صدی جس میں مختلف النوع، ثقافتیں اور قومیں مستقبل کی تشکیل میں حصہ لے سکیں گی۔ ایسی صدی جس میں جنگ کے طاعون کو پھیلنے سے روکا جا سکے گا۔

لیکن، اس کی بجائے ایسے لگتا ہے، جیسے ہم قبائلی منافرت اور ویران تنہائی کے اندھیروں میں ڈوبنے والے ہیں جہاں جنگیں نئی جنگوں کو جنم دیتی رہیں گی۔ اس نئے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دھماکہ خیز تشدد کے خطرے سے ہم کس طرح عہدہ برآ ہوں گے، اس سے اس امر کا تعین ہوگا کہ ہماری آنے والی نسل کیسے زندگی گزارتی ہے یا شاید کیسے فنا ہو جاتی ہے۔

اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ قیام امن کے بارے بہت سے ذہنی ہتھیار، مایوس کن حد تک فرسودہ ہو چکے ہیں جس طرح بہت سی فوجیں پرانی ہوگئی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جہاں دنیا کے تمام ممالک اپنی فوجوں کو اکیسویں صدی کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ قیام امن کی کوششیں زیادہ تر ایسے طریقوں سے کی جا رہی ہیں جو پرانے زمانے کے لئے زیادہ مناسب ہے۔

اس کتاب کا بنیادی نظریہ اگرچہ واضح ہے، مگر ابھی تک اسے سمجھا نہیں گیا اور وہ یہ ہے کہ ہم جس طرح جنگ لڑتے ہیں وہ اصل میں ہمارے دولت کی پیدائش کے طریقے کا عکس ہوتا ہے۔ لہٰذا جنگ کے تدارک کا طریقہ بھی اس کا عکس ہونا چاہیے۔ ہم امن میں زندگی گزارنے والے خوش قسمت لوگوں نے اس سے زیادہ کسی معاملے کو نظرانداز نہیں کیا۔ آخر ہم سب اپنی اپنی بقا کی انفرادی لڑائی تو لڑتے ہی ہیں، مثلاً زندہ رہنے، روزی کمانے، اپنے خاندان کی دیکھ بھال کرنے اور بیماری کے خلاف لڑائی وغیرہ۔ فوری نوعیت کے ان حقائق کے بارے میں پریشانی ہی کو کافی سمجھا جائے گا۔ اس کے باوجود ہماری یہ ذاتی نوعیت کی لڑائیاں جو ہم زمانہ امن میں لڑتے ہیں......یعنی ہم روزمرہ کی زندگی کیسے گزارتے ہیں۔ یہ بات ماضی، حال اور مستقبل کی حقیقی یا تصوراتی جنگوں سے بڑی شدت سے اثر لیتی ہے۔

آج کی جنگیں، پٹرول پمپ پر پٹرول، سپر مارکیٹ میں اشیائے خوردنی اور اسٹاک ایکسچینج میں حصص کی قیمتوں کو کم یا زیادہ کرتی ہیں۔ یہ زندگی کے ماحول کو کھنڈر بناتی ہیں، حتیٰ کہ یہ ویڈیو فلموں کی شکل میں ہمارے ڈرائنگ روموں میں گھس آتی ہیں۔

ماضی میں ہونے والی جنگیں، وقت کی حدیں پار کر کے آج بھی ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ صدیوں پہلے بہائے جانے والے خون کے دریا جو ایسے مسئلوں پر بہائے گئے جو آج کسی کو بھی یاد نہیں ہیں، گلی سڑی لاشیں، پھولے پیٹ اور سوکھے اعضا والے بچے سبھی آج کی دنیا کی تشکیل میں شریک ہیں جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اسی ایک مثال کو لے لیجئے جس کی طرف شاید ہی کسی کی توجہ گئی ہو کہ ہزاروں سال پہلے لڑی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جانے والی جنگوں ہی نے اس فوجی نظام کو جنم دیا جس سے سب لوگ بخوبی واقف ہیں۔ اختیار کے مدارج و مراتب کا سلسلہ دراصل ان جنگوں کے بطن سے برآمد ہوا۔ مستقبل میں ہونے والی جنگیں اصلی ہوں یا خیالی، ہمارے ٹیکس کے پیسے پر ہاتھ صاف کرتی ہیں۔

اگر خیالی جنگوں نے ہمارے ذہن پر قبضہ کر رکھا ہے تو یہ کوئی حیران کن بات نہیں ہے۔ ہمارے قدیم جنگی ہیرو، ساموارئے، جاں نثار، شاہسوار، جرنیل موجودہ زمانے کے فوجی سپاہی، جو تاریخ کے اوراق میں اور ہمارے ذہنوں میں پرے باندھے ہوئے حرکت کناں رہتے ہیں۔ ادب، مصوری، مجسمہ سازی اور پھر فلموں میں جنگ کے خوف ناک مناظر، بہادرانہ کارنامے یا پھر مختلف انداز سے تصادم سے جنم لینے والے مخمصے، حقیقی اور غیر حقیقی شکلوں میں موجود ہیں۔ جب کہ حقیقی ممکنہ اور بالواسطہ جنگیں ہمارے ذہن کی تشکیل کرتی ہیں، اس کے برعکس بھی ایک حقیقت موجود ہے، جسے بھلا دیا گیا ہے۔ ہم سب میں سے ہر ایک کی زندگی کی تشکیل میں ایسی جنگوں کا بھی حصہ ہے جو لڑی ہی نہیں گئیں۔ یہ روک دی گئی تھیں کیونکہ جنگ کی مخالف قوتوں کو کامیابی حاصل ہوگئی تھی۔

جنگ اور مخالف جنگ ایک دوسرے کا بدل معکوس نہیں ہیں۔ تدارک جنگ، صرف امن کے لئے نعرے لگانے، احتجاجی دھرنے دینے، تقریریں کرنے یا دعائیں مانگنے کا نام نہیں ہے۔ تدارک جنگ، سیاستدانوں بلکہ خود پیشہ ور جنگجوؤں کے ایسے اقدامات یا فیصلوں کا نام ہے جو جنگ کو روکنے یا اس کو محدود رکھنے کے لئے کئے جائیں۔ موجودہ دنیا کی اس پیچیدہ صورت حال میں ایسا وقت بھی آتا ہے جب ایک زیادہ بڑی اور خوف ناک جنگ کو روکنے کے لئے خود جنگ ایک آلہ کار بن جاتی ہے، یعنی جنگ بطور تدارکِ جنگ۔

اعلیٰ ترین سطح پر تدارک جنگ کے لئے تزدیری، اقتصادی اور اطلاعاتی طاقت کا اعلان کرنا پڑتا ہے تاکہ عالمی سٹیج پر ہونے والی تبدیلیوں سے منسلک تشدد کو کم سے کم سطح پر رکھا جا سکے۔

آج جب کہ دنیا صنعتی دور سے آگے تیزی کے ساتھ نئی صدی میں داخل ہو رہی ہے، جنگ اور تدارک جنگ دونوں کے بارے میں ہم جو بھی جانتے ہیں وہ خطرناک حد تک فرسودہ ہو چکا ہے۔ ایک انقلابی معیشت جنم لے رہی ہے جو روایتی خام مال اور معیشت کی بجائے علم پر مبنی ہے۔ عالمی معیشت میں ہونے والی یہ تبدیلی، اپنے ساتھ طریق جنگ میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک متوازی انقلاب کا سبب بن رہی ہے۔

لہٰذا ہمارا مقصد جنگ کو قابل نفرت قرار دینے کے بارے میں وعظ کرنا نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض قارئین، وعظ و نصیحت کی اس عدم موجودگی کو جنگ کا شکار ہونے والوں کیلئے ہمدردی کے نہ ہونے پر محمول کریں۔ اس کا مطلب یہ فرض کر لینا ہے کہ درد سے کراہنے اور غم و غصے کا اظہار بھی تشدد روکنے کے لئے کافی ہے۔ درد کے نتیجے میں بلند ہونے والی چیخیں اور اس پر غم و غصے کا اظہار یقیناً دنیا میں پہلے ہی بہت ہے۔ اگر یہ قیام امن کے لئے کافی ہوتے تو ہمارے مسائل کبھی کے ختم ہو چکے ہوتے۔ اس میں جس چیز کی کمی ہے وہ جذبات کا اظہار نہیں بلکہ جنگ اور تیزی سے تبدیل ہونے والے معاشرے کے درمیان رشتوں کی نئی تفہیم ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ فہم کی یہ نئی گہرائی، عالمی برادری کو عمل کے لئے ایک نئی بنیاد فراہم کر سکتی ہے۔ ایسا ہو جانے کی صورت میں مداخلت کی بجائے مستقبل کے بہتر شعور کے نتیجے میں کی جانے والی احتیاطی تدابیر؟ کا باعث ہوسکتی ہیں جو آئندہ ہونے والی جنگوں کی شکل و صورت کی تفہیم پر مبنی ہو۔ ہم یہاں کوئی امرت دھارا پیش نہیں کر رہے ہیں۔ امن کے لئے ہماری رائے میں یہ ایک معمولی کاوش ہوسکتی ہے کیونکہ طریق جنگ میں انقلاب طریق امن میں انقلاب کا متقاضی بھی ہوتا ہے۔ تدارک جنگ لازماً جنگ کے مساوی تو ہونی چاہیئے جسے روکنا مقصود ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پہلا حصہ

آویزش

غیر متوقع مڈبھیڑ:

یہ داستان ایک غیر متوقع ٹیلی فون کال، واشنگٹن کے نزدیک رات کے اندھیرے میں شہری لباس میں ملبوس ایک امریکی فوجی جرنیل سے ایک موٹل میں ہونے والی ملاقات سے شروع ہوئی۔ اس سے پہلے ہماری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی ہمیں یہ معلوم تھا کہ وہ ہم سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔ یہ سطور رقم کرنے کا بھی ہمارا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

12اپریل1282ء کو شام کے ساڑھے سات بجے چھوٹے قد کا دبلا پتلا گندمی رنگ کا ایک شخص پینٹاگون کے قریب واقع ''کوالٹی ان'' نام کے ہوٹل کی لفٹ سے برآمد ہوکر ہمارے درمیان آ موجود ہوا۔ ڈان موریلی نے اپنا تعارف اٹلی سے نقل مکانی کرنے والے اور اب پنسلوانیا میں مقیم ایک خاندان کے فرد کی حیثیت سے کرایا۔ وہ ''ویسٹ پوائینٹر ''......تھا جو ویت نام کے میکانگ ڈیلٹا میں جنگجو فوجیوں کا سربراہ رہ چکا تھا، مگر جیسا کہ ہمیں بعد میں پتہ چلا اپنی زندگی کی سب سے اہم جنگ کا سامنا ابھی اسے کرنا تھا۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ فوجی حکام بیشتر اپنی گذشتہ جنگ دوبارہ لڑنے کی منصوبہ بندی میں لگے رہتے ہیں، لیکن اس رات ہم نے ڈان موریلی کی باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہی الزام امن کی بات کرنے والے دانش وروں، سیاستدانوں اور احتجاج میں مصروف لوگوں پر بھی عائد کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگ اور امن دونوں قسم کی صورتحال کے بارے میں ان دنوں جو کچھ کہا یا لکھا جا رہا ہے وہ زیادہ تر فرسودہ ہو چکا ہے۔ اس کے متعلق سوچ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچار سرد جنگ کے زمانے کی نشانی ہے اور اس سے بڑھ کر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ سوچ اسی دور کے دھندلکوں میں منجمد نظر آتی ہے۔

ڈان موریلی نے اپنی گفتگو کا آغاز اس خبر کے ساتھ کیا کہ امریکی جرنیلوں کا ایک گروپ ان دنوں1980ء میں شائع ہونے والی ہماری کتاب تیسری لہر کے مطالعے میں مصروف ہے۔ اس کتاب میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ دس ہزار برس قبل برپا ہونے والا زرعی انقلاب، انسانی تاریخ میں پہلی بار کایا پلٹ دینے والی تبدیلی کا باعث بنا اور یہ کہ قریباً تین سو برس قبل وجود میں آنے والے صنعتی انقلاب نے اس تبدیلی کی دوسری لہر کو جنم دیا۔ نیز یہ کہ اب ہم اس نوع کی تیسری تبدیلی کے لئے دباؤ محسوس کر رہے ہیں۔

تبدیلی کی ہر لہر اپنے ساتھ نیا تمدن لاتی ہے۔ ہماری کتاب کے دعوے کے مطابق ان دنوں ہم لوگ ایک نئے انقلابی تمدن کی تیسری لہر ایجاد کرنے کے عمل سے گزر رہے ہیں جس کی اقتصادیات، خاندانی روابط کی شکل، ذرائع ابلاغ اور سیاست بھی اپنی ہوگی۔ ہم یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ موجودہ صورت حال میں جرنیلوں کو اس کے مطالعہ کی ہدایات کیوں دی گئی ہیں؟

اندھی طاقت سے دماغی طاقت تک:

موریلی نے اس کی جو وجہ بیان کی وہ یہ تھی کہ جو قوتیں ہماری اقتصادیات اور معاشرے میں تبدیلیاں لا رہی ہیں یا ان کی کایا پلٹنے کا سبب بن رہی ہیں، وہی طاقتیں جنگ کے عمل میں بھی تبدیلی لانے والی ہیں۔اس لئے ایک گروپ کو، جس سے بیرونی دنیا قریب قریب بے خبر ہے، مستقبل کی ایک انقلابی فوج تشکیل دینے کا فرض سونپا جا رہا ہے۔

اس نے ہمیں بتایا کہ اس گروپ کا سربراہ اور خود اس کا ''باس'' کنساس کا ڈون اے سٹاری نامی ایک جرنیل ہے، جس کی ذمہ داری ، جنگ کے عمل کو تیسری لہر کے حوالوں کی روشنی میں نئے سرے سے ترتیب دینے کی ہے۔ نیز اس حوالے سے فوجی سپاہیوں کو ایسی تربیت دینا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے جس کی مدد سے وہ اپنے دماغ کا استعمال کرتے ہوئے نئے طریقوں سے جنگ لڑیں اور ان ہتھیاروں کی ازسرِنو تصریح کریں جن کی انہیں ضرورت ہوسکتی ہے۔ موریلی کا کام نظریہ سازی اوراس کی تدریس سے متعلق تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کی اصل ذمہ داری تیسری لہر کیلئے نیا فوجی نقطہ نظر تشکیل دینے کی تھی۔

ہم گھنٹوں باتیں کرتے رہے، ہم نے ہر موضوع پر گفتگو کی۔ وڈیو گیمز سے لے کر مستند اداروں کی عدم مرکزیت تک اور ٹیکنالوجی کی سرحدوں سے وقت کے فلسفے تک۔ اس کا کہنا تھا کہ ان تمام موضوعات کا تعلق جنگ کے نئے تصور سے ہے۔

کھانے کے بعد موریلی ہمیں اوپر اپنے کمرے میں لے گیا جہاں اس نے دو پراجیکٹر تیار کر رکھے تھے۔ یہاں اس نے ہمیں جو کچھ بتایا وہ وہی کچھ تھا جس سے کچھ عرصہ قبل اس نے امریکہ کے اس وقت کے نائب صدر جارج بش کو آگاہ کیا تھا۔ ہم سلائیڈوں کے ذریعے سامنے آنے والی معلومات ہضم کرتے اور سوالوں پر سوال داغتے رہے۔ اس کارروائی میں گھنٹوں گزر گئے اور وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔

اس بات کا دہرانا سودمند ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی دس برس پہلے کا واقعہ ہے اور یہ وہ وقت تھا جب ''سمارٹ بم'' کی اصطلاح ابھی دنیا کے ذخیرہ الفاظ کا حصہ نہیں بنی تھی۔ امریکہ کی فوج اس زمانے میں بھی ویت نام کی شکست کی وجہ سے پست ہمتی کی شکار تھی، مگر موریلی کا ذہن ماضی نہیں مستقبل پر مرکوز تھا اور ہم نے دیکھا کہ جو کچھ اس رات اس کمرے میں ہمارے سامنے آیا وہ ایک طرح سے ساری کارروائی کی تمہید تھی جسے دس برس بعد پوری دینا نے خلیج کی جنگ کی صورت میں سی این این پر ملاحظہ کیا۔

حقیقتاً جو کچھ ہم نے اس دن دیکھا اور اس سے جن عوامل کی نشاندہی ہوتی تھی، دنیا کے عوام اس کو اب تک بھی سمجھ نہیں پائے۔ اس کا تعلق فوجی قوت کا نقشہ بدلنے سے ہے اور اس عمل کا پورا ادراک ہمارے ان انکشافات کی مدد ہی سے ہوسکتا ہے جو ہم اس کتاب کے آئندہ ابواب میں پیش کر رہے ہیں۔ ان سے پتہ چلے گا کہ مستقبل کی نئی ابھرتی ہوئی اقتصادیات اور جنگوں کی تیزی سے بدلتی ہوئی صورت حال میں کس درجہ مشابہت ہے اور یہ دونوں شعبے ایک دوسرے میں تبدیلی لانے کے عمل کو آگے بڑھانے میں کس طرح ایک دوسرے کے مددگار بنتے ہیں۔

سیدھی سی بات ہے جب ہم اقتصادی شعبے میں اندھی طاقت کی بجائے دماغی قوت سے کام لینا شروع کریں گے تو لازماً ایسے طریقے ایجاد کرنے پر بھی مجبور ہوں گے کہ جنگ کے میدان میں بھی دماغی قوتوں کو بروئے کار لاسکیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ڈان موریلی ہمیں نئے نئے خیالات سے نوازتا رہا۔ مثلاً وہ بتاتا رہا کہ امریکی فوج کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟ یہ ٹیکنالوجی کے بل پر جنگی حکمت عملی ترتیب دیتی ہے حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ حکمت عملی کی روشنی میں ٹیکنالوجی سے کام لیا جائے۔ پھر یہ کہ ویت نام کی جنگ کے بعد جنگی طریقوں میں سب سے اہم تبدیلی کیا ہوئی ہے؟ ایسے ہتھیاروں کی تیاری جن کی تکمیل کے وقت ان کی درستگی کا یقین ہو۔ فوج سے تعلق کی بنا پر جمہوری ممالک کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟ یہ کہ مقبول عوامی مدد اور اکثریتی حمایت کے بغیر جمہوری افواج جنگ نہیں جیت سکتیں، لیکن ایسی حمایت کے حصول سے قبل ہی بحران کا سامنا ہوسکتا ہے۔ کیا ایٹمی جنگ سے بچنا ممکن ہے؟ ہاں، مگر روایتی طریقے سے نہیں۔ وقت کے فلسفے کے بارے میں ہم نے جو چند پیراگراف تحریر کئے تھے ان میں اس کی دلچسپی کا سبب کیا تھا؟ کیونکہ فوج کو مقام کی سمت کی بجائے وقت کی سمت کا تعین کرنا ہوگا۔ اس کے بعد موریلی نے اپنی دانش درانہ صلاحیتوں کے مظاہرے کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔

طبی معائنے کے بعد مریض جو چند الفاظ کہتا ہے، ماہرین نفسیات انہیں ''افشائے راز'' کا نام دیتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ باقی تمام معلومات کے مقابلے میں یہ کہیں زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ جب ہم راہداری میں کھڑے ان سب باتوں سے جو ہم نے ابھی ابھی سنی تھیں، کچھ حاصل کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے اس وقت موریلی نے اپنا ذاتی بم داغ دیا۔ ''میں 49 برس کا ہوں'' اس نے رازدرانہ لہجے میں بتایا'' اور کینسر کے مرض کی وجہ سے جلد ہی مرنے والا ہوں۔'' وہ چپ ہوگیا۔

پھر اس نے پورے اعتماد سے، جس سے اس کے طویل اور خود احتسابی کے محتاط عمل کا پتہ چلتا تھا، اعلان کیا، ''اگر امریکہ اور ہمارے اتحادیوں نے اس نئے نظریے کو، جس کا خاکہ آج شب میں نے آپ کے سامنے رکھا ہے پذیرائی بخشتی تو میں سمجھوں گا میری زندگی کا مشن مکمل ہوگیا ہے۔

بہتری یا خرابی یا دونوں کے لئے جو کچھ ہوا۔ موریلی کی زندگی کا مشن مکمل ہونے سے بڑھ کر پورا ہوا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ظریفانہ لکیر سے آگے:

اس پہلی ملاقات کے بعد واشنگٹن اور ورجینیا کے فورٹ منرو میں ہمارے مزید اجلاس بھی ہوئے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ڈان موریلی فوجی سپاہی کے کسی روایتی تصور سے مطابقت نہیں رکھتا۔ دانشور لوگ فوجیوں کو خاص طور سے بے رحم اور سادہ لوح ہی سمجھتے ہیں۔ کبوتروں کی طرح سینہ تانے اور چھاتی پر تمغوں کی بہار سجائے جرنیلوں کے سیاسی کارٹونوں کے بارے میں غور کیجئے تو ان کے چہرے ذہانت سے عاری دکھائی دیتے ہیں۔ گلبرٹ اور سلی دان کے طنزیہ گانے ''میں ہی صحیح قسم کا میجر جنرل ہوں'' یا ہز مجسٹی سروس کی بحریہ کے سربراہ پینافور کے بارے میں سوچئے جس نے کہا تھا، ''میں نے کبھی غور و فکر کرنے کی زحمت ہی نہیں کی مگر انہوں نے مجھے ملکہ کی ''بحریہ'' کی سربراہی کا فریضہ سونپ کر اعزاز بخش دیا۔''

مسخرے پن کی اس لکیر کی بنیاد حقیقتاً کسی زمانے میں کچھ بھی رہی ہو اور کچھ دوسرے ملکوں میں شاید اب بھی جاری و ساری ہو، اس کا اطلاق ڈان موریلی یا ان افسران پر ہرگز نہیں ہوتا جن سے، اس نے ہمیں ملایا۔ موریلی اصل میں تو ایک دانشور تھا جو کبھی کبھار فوجی وردی بھی پہن لیتا تھا۔ وہ یقیناً نظریوں سے محبت کرنے والا ایک بلند مرتبہ شخص تھا۔ اس کے جسم و جاں سے جو گرمجوشی پھوٹتی تھی اس سے وہ دوسروں کی کمزوریاں نہیں ڈھونڈتا تھا بلکہ شائستگی اور شرافت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کی حسِ مزاح بھی قابل قدر تھی اور اطالوی لطیفوں کا ذخیرہ تو ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ ایک افسر کی مدد سے اس نے آئل پینٹنگز سمجھنے کی استعداد حاصل کی اور اس کے عوض میں اس افسر کو شطرنج کھیلنے کے گُر بتائے۔

وہ کلاسیکی اور جدید دونوں قسم کی موسیقی کا رسیا تھا۔ خود بھی گا لیتا تھا اگرچہ اچھا گلوکار نہیں تھا۔ سائنسی ناولوں سے لے کر تاریخ سے متعلق اور سوانح عمریوں تک سبھی قسم کی کتابوں کے مطالعہ کا عادی تھا۔

جس دوسرے امریکی جرنیل سے ہماری ملاقات ہوئی، وہ موریلی کو اطالوی نشاۃِ ثانیہ کا مظہر قرار دیتا تھا۔

ڈان موریلی ایک سنجیدہ آدمی تھا۔ اسے خود بھی یہ معلوم تھا، لیکن اس کی صحبت میں گزرا ہوا وقت بہت دلچسپ ہوتا۔ وہ اگرچہ مر رہا تھا، مگر زندگی سے بھرپور نظر آتا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آخری دفعہ جب ہم اس سے ملے تو وہ جلدی میں تھا۔ اپنے جانشین سے متعارف کرانے کے لئے اس نے فورٹ منرو میں ہمیں مدعو کیا۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ اسی روز یعنی فروری1984ء کو دوپہر کے کھانے کے بعد جو اس کی بیوی نے تیار کیا تھا اور جس میں جنگی مشقوں میں حصہ لینے والے متعدد دوسرے افسران نے بھی شرکت کی تھی ، وہ ہمیں باہر کھڑی ہوئی گاڑی کی طرف لے گیا۔ ایک لمحے کے لئے ہم تنہا ہوئے تو اس نے کہا:

''ڈاکٹروں نے مجھے زندہ رہنے کے لئے 6 ماہ تک کا مزید وقت دیا ہے۔ فوج میری ریٹائرمنٹ کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ میں باہمی تعارف اور ملاقاتوں کی قدر کرتا ہوں اور اس بات پر پشیمان ہوں کہ ان کو مزید وسعت دینے کا اب موقعہ نہیں رہا۔'' ہم نے اسے بتایا کہ اس کے ساتھ گزارے ہوئے وقت سے ہم نے بھی بہت کچھ حاصل کیا۔ اس موقعہ پر اس نے گاڑی کا دروازہ کھول کر ہاتھ ہلاتے ہوئے آخری الوداعی اشارہ کیا اور سارجنٹ نے گاڑی چلا دی۔

ان ملاقاتوں سے جو پہلے ڈان موریلی اور بعد میں ڈون سٹیری اور دوسرے لوگوں سے ہوئیں، آخرکار ہمیں انسانی معاملات میں جنگ کے ڈرامائی، المناک اور سماجی عمل سے متعلق نتائج وعواقب کا ادراک کرنے اور ان امور کو نئے طریقوں سے سمجھنے میں مدد ملی۔

اگر کبھی جنگ جیسی اہم ذمہ داری کو محض جرنیلوں کی ذمہ داری قرار نہ دینے کی بات کی گئی تھی تو اب اس بات پر غور کرنا بھی ضروری ہوگیا ہے کہ اس اہم کام کے لئے جاہلوں پر انحصار کرنا درست نہ ہوگا خواہ وہ وردی والے ہوں یا بلا وردی کے اور یہی بات ''تدارک جنگ'' کے عمل پر بھی صادق آتی ہے۔

خوشی کا دور ختم

باخبر بالغوں سے اگر یہ پوچھا جائے کہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد سے، اب تک کون کون سی جنگیں لڑی گئی ہیں تو وہ بلاتامل جنگ کوریا (1950-53ء)۔ ویت نام کی جنگ (1957-75ء)۔ عرب اسرائیل جنگیں (1967-73ء)۔ خلیجی جنگ (1990-91ء) اور شاید بہت سی دوسری جنگوں کی فوراً ہی نشان دہی کر دیں گے۔

لیکن اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے کہ 1945ء میں امن کے نفاذ کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بعد سے دنیا کے طول وعرض میں150 سے160 تک جنگیں اور تصادمات وقوع پذیر ہو چکے ہیں یا یہ کہ ان کاروائیوں میں تقریباً72لاکھ سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ یہ تعداد صرف مرنے والوں کی ہے، زخمی ،تشدد کا شکار ہونے والے اور وہ جن کی صورتیں مسخ ہوگئی ہیں ان میں شامل نہیں۔ نہ ہی اس میں ان شہریوں کی اس سے بھی بڑی تعداد شامل ہے جو جنگ کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اصل جنگی کاروائیوں کے بعد پیدا ااہونے والے حالات کے نتیجے میں ختم ہونے والے بھی ان اعدادوشمار سے الگ ہیں۔

ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ پوری جنگ عظیم اول کے دوران میں مرنے والے سپاہیوں کی تعداد اس سے کچھ ہی زیادہ یعنی 84لاکھ کے قریب بنتی ہے۔غور طلب بات یہ ہے کہ غلطی کے زیادہ سے زیادہ امکان کے باوجود اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلح تصادم کے مقابلے میں، دنیا نے 1945ء یعنی جنگ ختم ہونے کے بعد کے زمانے میں کچھ زیادہ خونریزی کی ہے۔

جب اس تعداد میں شہری ہلاکتیں بھی شامل کی جاتی ہیں تو مرنے والوں کی تعداد کا اندازہ تین کروڑ بیس لاکھ سے لے کر چار کروڑ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس تعداد میں بھی زخمی شامل نہیں ہیں، نہ ہی عورتوں کی عصمت دری،عضو بریدگی، بیماریوں کا شکار اور کنگال ہونے والے اس میں شامل ہیں۔

برونڈی اور پولیو یا قبرص اور سری لنکا، مدغاسکر اور مراکش میں لوگ گولیوں کی زد میں آتے رہے۔خنجر زنی کا شکار ہوتے رہے، بموں اور گیس کی تباہ کاریاں ان کا مقدر بنیں اور اس کے علاوہ یہ ایک دوسرے کو قتل کرنے کے عمل میں بھی مصروف رہے۔ اقوام متحدہ کے رکن ممالک کی تعداد اس وقت تقریباً دوسو ہے، ان میں سے ساٹھ ممبر ملکوں کے درمیان کسی نہ کسی قسم کی جنگ جاری ہے۔''سپری'' (سٹاک ہام کی بین الاقوامی تحقیقاتی انسٹی ٹیوٹ) نے صرف1990ء کے دوران میں 31 مسلح تصادمات کی نشاندہی کی ہے۔

1945ء سے1990ء تک2340 ہفتوں میں سے حقیقتاً اس کرہ ارض نے صرف تین ایسے ہفتے گزارے ہیں جنہیں صحیح معنوں میں جنگ و جدل سے خالی قرار دیا جا سکتا ہے۔ 1995ء کے بعد سے اب تک کے دور کو زمانہ ''بعد از جنگ'' کا نام دینا ایک ایسا المیہ ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جس کی حدیں ستم ظریفی سے جا ملتی ہیں۔

اگر ہم پلٹ کر ان تمام وحشیانہ واقعات کا جائزہ لیں تو ایک واضح مثال ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔

تین کھرب ڈالر کا پریمیم:

یہ بات اب واضح ہو چکی ہے کہ چند عشرے قبل تک امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان جو کش مکش جاری و ساری تھی اس کی وجہ سے1950ء کے بعد کے زمانے میں عملاً دنیا کے استحکام کی صورت ظہور پذیر ہوئی۔ دنیا بھر کے ممالک دو واضح طور پر بٹے ہوئے کیمپوں میں تقسیم تھے۔ ان سب میں سے ہر ایک کو معلوم تھا کہ اس وقت کے عالمی نظام میں وہ کہاں فٹ ہوتا ہے۔ ساٹھ کے عشرے کے بعد سے دونوں ایٹمی سپر طاقتوں کے درمیان براہ راست تصادم کے نتائج ''باہمی یقینی تباہی'' کی صورت میں تسلیم کئے جا چکے تھے۔اس صورت حال کا نتیجہ یہ تھا کہ گرم جنگیں ویت نام، ایران، عراق، کمبوڈیا، انگولا، حبشہ یا تیسری دنیا کے ان سے بھی زیادہ دورافتادہ مقامات پر تو لڑی جا سکتی تھیں۔ بڑی طاقتوں کی سرحدوں کے اندر ان کے وقوع پذیر ہونے کا ہرگز کوئی امکان نہیں تھا۔ نہ ہی ان بڑی طاقتوں کی اقتصادیات کو ایسی جنگوں سے کوئی خطرہ تھا۔

حالیہ برسوں میں سپر طاقتوں اور ان کے اتحادیوں کی طرف سے فوجی مقاصد کے حصول کے لئے ایک کھرب ڈالر سالانہ خرچ کئے جا رہے ہیں۔ اتنی بڑی رقم، ایک طرح سے بڑی طاقتوں کی طرف سے انشورنس پریمیم کے طور پر خرچ کی جا رہی ہے اور اس کا مقصد گرم جنگوں کو اپنے علاقوں سے دور رکھنا ہے۔

دونوں سپر طاقتیں امریکہ اور سابق سوویت یونین اپنے حاشیہ نشینوں اوراتحادیوں کی بعض آویزشوں کو واضح طور سے ہوا دینے، ہتھیار مہیا کرنے، مدد بہم پہنچانے اور نظریاتی بارود سے لیس کرنے میں لگی رہیں، مگر شاید اس سے بھی زیادہ ان کا کردار عالمی چوکیداروں کا سا تھا جس کے ذریعے وہ دنیا میں استحکام کا باعث بنی رہیں۔ یہ سپر طاقتیں اپنے پر انحصار کرنے والے چھوٹے ملکوں کے باہمی اختلافات دور کرانے اور مقامی جھگڑوں کے خاتمے کے لئے ان کے درمیان ثالثی وغیرہ کے فریضے بھی انجام دیتی رہیں اور یوں عام طور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے اپنے حاشیہ نشینوں کو قطار میں لگائے رہیں تا کہ وہ خود غیر محدود ایٹمی جنگوں کے خطرات سے محفوظ رہ سکیں۔

1983ء میں شائع ہونے والی ایک کتاب ''پری ویوایِنڈ پریمسز'' میں ہم نے اس امر کی نشاندہی کی تھی کہ ایک دن ایسا آئے گا جب ہمارے بچے سرمایہ داری اور سوشلزم کے درمیان ہونے والی عالمی جدوجہد کو تمسخرانہ نظر سے دیکھیں گے اور اس کا مذاق اڑائیں گے، بالکل اسی طرح جس طرح ہم ان دنوں تیرہویں اور چودہویں صدی میں ہونے والی جنگوں کو تحقیر کی نظر سے دیکھتے ہیں، سرد جنگ کی اصطلاح آج پہلے ہی نازک قسم کی دقیانوسیت کی شکل اختیار کر چکی ہے، کیونکہ 1991ء کے بعد سے سوویت یونین بھولی بسری داستان بن چکا ہے اور دونوں ایٹمی سپر طاقتوں نے جو دورُخا فوجی ڈھانچہ دنیا پر مسلط کر رکھا تھا وہ بھی زمین بوس ہو چکا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا اسے غیر معمولی قرار دینا غلط نہ ہوگا۔

غلامی اور مقابلہ بازی:

سرد جنگ کے ڈھانچے کی ٹوٹ پھوٹ کا پہلا ردِعمل اجتماعی مسرت اور خوشی کی صورت میں سامنے آیا۔ تقریباً نصف صدی تک یوم حساب کی گھڑی ٹک ٹک کرتی رہی اور دنیا سانس روکے منتظر رہی۔ اس لئے اس بے معنی مسرت کو سمجھنا آسان ہے، جس کا اظہار سرد جنگ کے خاتمے کی وجہ سے کیا جا رہا تھا اور دیوار برلن کے انہدام کو جس کی علامت قرار دیا جا رہا تھا، عام طور سے سنجیدہ سیاست دان بھی ہمیں اس نئے دور کے قصیدے سناتے رہے۔ پنڈتوں نے نزول امن کے مژدے سنائے، امن کے بڑے فوائد کا انتظار شروع ہوا۔ خیال تھا کہ جمہوریتیں تو اب ہرگز ایک دوسرے کے خلاف جنگ آزما نہ ہوں گی۔ بعض مفکروں نے تو یہ کہنا بھی شروع کر دیا کہ غلامی اور ڈوئل بازی کی روایتوں کی طرح جنگوں کا معاملہ بھی اب عجائب گھروں کی زینت بن جائے گا۔

بلاوجہ کی رجائیت کے اظہار کا یہ پہلا موقعہ نہیں تھا۔ ایچ جی ویلز نے 1914ء میں لکھا کہ ''بیسویں صدی کے آغاز میں لوگوں کے'' سامنے آنے والی واضح حقیقت یہ ہے کہ اب جنگوں کا وقوع پذیر ہونا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ افسوس کہ یہ دعویٰ ان لاکھوں لوگوں کے لئے حقیقت نہ بن سکا جو پہلی جنگ عظیم میں جسے ہر قسم کی جنگوں کے خاتمے کے لئے لڑی جانے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

والی جنگ کا نام دیا جاتا ہے، فنا کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔

ایک دفعہ یہ مرحلہ سر ہوا تو امیدوں نے پھر سفارتی خلاء بھرنا شروع کر دیا۔1922ء میں اس وقت کی عظیم طاقتوں نے اس اصول پر اتفاق کیا کہ وہ اسلحے کی دوڑ کم کرنے کے لئے اپنے متعدد جنگی جہازوں کو سمندر میں غرق کرنے کے لئے تیار ہیں۔

ہنری فورڈ نے1928ء میں اعلان کیا، ''عوام اتنے باشعور ہو چکے ہیں کہ اب کسی بڑی جنگ کا خطرہ باقی نہیں رہا۔'' اسلحہ پر پابندی کے جوش میں امریکی صدر ہرٹ ہوور کو1932ء میں ہتھیاروں کے ناقابل برداشت بوجھ میں کمی کی، جو بقول ان کے دنیا بھر کے محنت کشوں کی پیٹھ پر سوار ہوا تھا، بات کرنی پڑی۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ تمام ٹینکوں، کیمیائی ہتھیاروں، سبھی متحرک توپوں اور بمباری کرنے والے ہر قسم کے طیاروں کو تباہ کر دیا جائے۔''

اس بیان کے سات ہی برس بعد، انسانی تاریخ کی سب سے تباہ کن دوسری جنگ عظیم کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ 1945ء میں جب ہیروشیما اور ناگاساکی، کی ایٹمی دہشتوں کے جلو میں یہ جنگ اختتام پذیر ہوئی تو اقوام متحدہ کی بنیاد پڑی جس کے بعد دنیا ایک دفعہ پھر مختصر عرصے کے لئے اس واہمے میں گرفتار نظر آئی کہ مستقل امن اس کی مٹھی میں ہے، حتیٰ کہ سرد جنگ اور ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا۔

لبلبی دبانے کا عمل:

سوویت یونین کی کاوشوں کی روشنی میں ایک دفعہ پھر دیرپا امن کی کوششوں نے ایک نیا نظریہ (حقیقتاً نئے پیکیج میں پُرانا نظریہ) وقت کا فیشن قرار پایا۔ مغربی بالخصوص امریکی دانشوروں کے ایک وسعت پذیر گروہ نے اس بحث کا آغاز کر دیا کہ آنے والے کل کی شکل کا تعین فوجی کاروائیوں سے نہیں بلکہ اقتصادیات کے موثر ہونے سے ہوگا۔

1986ء میں یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، لاس اینجلس کے رچرڈ روزی کرینس نے اپنی کتاب ''دی رائز آف ٹریڈنگ سٹیٹ''میں یہ موقف اختیار کیا کہ اقوام عالم چونکہ اقتصادی لحاظ سے آزاد ہو رہی ہیں، اس لئے ان میں باہمی جنگ و جدال کا رجحان کم ہو رہا ہے۔ عالمی قوت بننے کے لئے اب فوجی طاقت نہیں، تجارت میں برتری درکار ہے۔ اسی طرح پال

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کینیڈی نے1987ء میں ''دی رائز اینڈ فال آف گریٹ پاورز'' میں فوجی اور اقتصادی قوتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے فوجی توسیع پسندوں کے عزائم میں پوشیدہ خطرات کی نشان دہی کی تھی۔

اب فوجی حکمت عملی کے ماہر ایڈورڈلٹ واک نے اس بحث کا آغاز کیا کہ نئے اور جغرافیائی معاشی پہلو کے تقاضوں سے بھرپور اقتصادی عہد میں فوجی قوت کی اہمیت میں کمی آ جائے گی۔ واشنگٹن کے بین الاقوامی اقتصادی ادارے کے ڈائریکٹر سی فریڈ برگ سٹن نے بھی یہی نعرہ لگایا اور اس بات پر زور دیا کہ نئے عالمی نظام کے حفاظتی مسائل میں اقتصادیات کی برتری لازمی ہے۔

ماہر اقتصادیات لیسٹر تھورو نے بھی یہی راگ الاپنا شروع کیا کہ ''فوجی محاذ آرائی کی بجائے اقتصادی مقابلے کی بات کرنا ایک قدم آگے بڑھانے کے مترادف ہے۔'' وہ لکھتا ہے:''عالمی ممالک کے درمیان آج کے بعد سے اصل مقابلہ اس میں ہوگا کہ بہترین مصنوعات کون تیار کرتا ہے، معیار زندگی بلند کرنے کی دوڑ میں کون آگے ہے اور بہترین تعلیمی صلاحیتوں سے مالا مال اچھے ہنرمند میدان میں کون لاسکتا ہے۔''

اس جغرافیائی معاشی پہلو والے اقتصادی نظریے کو، امریکہ کے صدارتی انتخاب میں کلنٹن کی کامیابی کے لئے بارود کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس نظریے کے پاسبانوں کا کہنا تھا کہ اگر یہ نظریہ درست ہے تو پھر امریکہ کے فوجی بجٹ میں کمی کر کے اس وقت کے نظرانداز کئے جانے والے سماجی پروگرام میں حکومت کے بجٹ خسارے میں مزید اضافہ کئے بغیر مزید سرمایہ کاری ممکن ہے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک اور بہتر نتیجہ یہ ہوسکتا ہے کہ کلنٹن انتظامیہ اس طرح اپنی توجہ داخلی مسائل پر زیادہ دے سکتی ہے؛ (کلنٹن کا اپنے پیشرو پر یہ الزام تھا کہ اس نے زیادہ توجہ خارجہ امور پر مرکوز رکھی)۔ یہ بھی کہا گیا کہ اگر کل کا میدان جنگ عالمی اقتصادی شعبہ ہی ہے تو امریکہ کو یہ جنگ لڑنے کے لئے ''اقتصادی سکیورٹی کونسل'' کی ضرورت بھی ہوگی۔

آج کے دور کی خون آلود سرخیوں کی روشنی میں بالآخر اس محاذ پر خاموشی چھا گئی۔ معیشی پہلو والے اقتصادی نظریے کی ترغیب کم سے کم تر ہوتی گئی' کیونکہ ہمارے چاروں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طرف تشدد کا راج تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ قومی سیاسی رہنما خالی کھاتے دار نہیں ہیں۔ دنیا کو جنگوں کے جہنم میں جھونکنے والے ماضی کی طرح وہ جنگ میں کودنے سے پہلے محض اقتصادی جمع تفریق کا حساب کتاب نہیں کرتے۔ اس کی بجائے سیاسی قوت پر قبضہ جمانا' اسے وسعت دینا یا اسے قائم رکھنا ان کا اصل مقصد ہوتا ہے۔

اقتصادی امور کے بارے میں' جب کبھی محتاط اندازے اس تصویر کا جزو بنتے بھی ہیں تو یہ عام طور سے غلط گمراہ کن اور دیگر معاملات میں الجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جنگیں غیر حقیقت پسندانہ رویوں' غلط اندازوں' غیروں سے بیزاری' کٹرپن' مذہبی انتہاپسندی اور خالص بدقسمتی کے نتیجے میں شروع ہوتی ہیں' جب کہ ہر حقیقت پسندانہ تجزیہ یہ ظاہر کرتا رہا ہے کہ امن کی پالیسی' ترجیحی طور پر سبھی کے لئے سودمند ہے۔

اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ جغرافیائی معیشی پہلو سے مملو اقتصادی جنگ' فوجی تصادم کا متبادل نہیں ہوسکتی۔ البتہ یہ اصل جنگ سے قبل اشتعال کا باعث ضرور ہوسکتی ہے' جیسا کہ امریکہ اور جاپان کے اقتصادی مسابقے کے نتیجے میں1961ء میں جاپانیوں کا پرل ہار بر پر حملہ......کم از کم اس معاملے میں کہا جا سکتا ہے کہ لبلبی پر ہاتھ کا دباؤ بڑھانے کی نوبت مقابلے کی وجہ سے آئی۔

حوصلہ افزائی کی بات الگ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جغرافیائی معیشت کے نظریے کو دو بلکہ اس سے بھی زیادہ بنیادی وجوہ کی بنا پر ناکافی قرار دیا جائے گا۔ یہ سیدھا سادہ بھی ہے اور فرسودہ بھی' سیدھا سادہ اس لئے کہ اس کی رو سے عالمی قوت کی تعریف صرف دو شعبوں تک محدود ہو جاتی ہے یعنی اقتصادی اور فوجی' فرسودہ اس لئے کہ یہ علم کے' جس میں سائنس' ٹیکنالوجی' ثقافت' مذہب اور دیگر اقدار شامل ہیں بڑھتے ہوئے اثرات کو نظرانداز کر رہا ہے حالانکہ یہی علوم تمام اقتصادیات اور فوجی اثرات کا منبع ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ نظریہ اس اہم ترین عنصر کو نظرانداز کر رہا ہے جو اکیسویں صدی میں کسی بھی عالمی طاقت کے رتبے کا تعین کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم جغرافیائی اہمیت کے معیشی دور میں نہیں بلکہ جغرافیائی اہمیت کے اطلاعاتی یا معلوماتی عہد میں داخل ہورہے ہیں۔

یہ امر حیرت کا باعث نہیں ہونا چاہیے کہ انہی اسباب کی بناء پر' ان دنوں بارودی اثرات سے پاک جغرافیائی اہمیت سے بھرپور اقتصادی نظریے کی بات کچھ کم ہی سننے میں آ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہی ہے۔

یہ قصۂ فخر وانبساط کی تاہ ترین لہر کے ایک آدھ روز بعد ہی تمام ہوا۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ دنیا پھر مقامی جنگوں کی گرفت میں آنے والی ہے مگر اب پھر ایک خطرناک غلط فہمی کا سہارا لیا جا رہا ہے اور وہ یہ کہ اب بھی اس خیال کو وسیع پیمانے پر تسلیم کیا جا رہا ہے کہ گزشتہ نصف صدی کی جنگوں کی طرح مستقبل میں لڑی جانے والی جنگیں بھی چھوٹے ملکوں اور دورافتادہ خطوں تک محدود رہیں گی۔

اس سلسلے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے نائب وزیر دفاع کا ایک خصوصی بیان حال ہی میں سامنے آیا ہے؛ ''ہم نے شمالی امریکہ مغربی یورپ اور جاپان میں امن کے علاقے بنا لئے ہیں جن کے بارے میں یہ کہنا درست ہوگا کہ حقیقتاً وہاں جنگ کی بات ناقابل فہم ہوچکی ہے۔'' تاریخ مگر ایسی ہی ناقابل فہم جنگوں سے بھری پڑی ہے ذرا سراجیوو کے کسی شہری سے پوچھ دیکھئے۔

شاید یہ بات اتنی خوفناک ہے کہ سوچی بھی نہیں جاسکتی کہ عام لوگ اب بھی کسی بڑی جنگ کے چھڑنے کو خارج از امکان نہیں سمجھتے۔ یہ جنگ براہ راست بڑی طاقتوں کے مابین ہو یا چھوٹے ملکوں کے درمیان شروع ہو اور بعدازاں بڑی طاقتیں اس میں شامل ہو جائیں۔ تاہم خوفناک حقیقت یہی ہے کہ خونریزی سے کنارہ کشی کا عہد جس میں سبھی لڑائیاں چھوٹے چھوٹے ممالک کے مابین دور دوراز علاقوں میں لڑی گئیں۔ ایک چیخ کے ساتھ اختتام پذیر ہونے والا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہمارے بنیادی دفاعی مفروضوں پر نظرثانی کی ضرورت ہوگی۔

تہذیبوں کا تصادم

یہ حقیقت آہستہ آہستہ عوام پر منکشف ہو رہی ہے کہ صنعتی تہذیب کا دور ختم ہونے کو ہے۔ اس کے زوال کے آثار اس وقت ظاہر ہو رہے تھے جب ہم نے اپنی کتاب ''فیوچر شاک'' (1970) میں ''صنعتی دور کے عام بحران'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس کے ساتھ جنگوں کا خطرہ کم نہیں ہوا بلکہ بڑھ گیا ہے اور یہ کہ اب نئی قسم کی جنگیں ہوں گی۔

آج کچھ لوگ جدت پسندی کے دور کے بعد کے حالات بیان کرتے ہوئے ''پوسٹ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ماڈرن'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں لیکن1980ء کے اوائل میں جب ہم نے اس کا ذکر ڈان موریلی اور ڈون سٹیری سے کیا تھا تو ہم نے اس کی بجائے پہلی یعنی زرعی لہر دوسری یعنی صنعتی لہر کے درمیان فرق کا حوالہ دیا تھا اور اب بات ہے فوجوں کی تیسری لہر کی۔

چونکہ تصادم کے بغیر معاشرے میں کوئی بڑی تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوسکتی' اس لئے ہمارا یقین ہے کہ جدت پسندی کے دور کے بعد کے وقت کو عارضی قرار دینے کی بات کرنے کی بجائے' اسے تبدیلی کی لہر کا تاریخی استعارہ قرار دینا زیادہ بہتر ہے۔ اس سے اس کے متحرک ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ لہریں حرکت کی مظہر ہوتی ہیں جب لہریں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں تو طاقتور متحارب زیریں لہریں وجود میں آتی ہیں۔ جب تاریخی لہریں متصادم ہوتی ہیں تو پوری تہذیب معرکہ آرائی کی لپیٹ میں آ جاتی ہے اور اس عمل سے ایسے بہت سے معاملات روشنی میں آ جاتے ہیں جو اس کے بغیر آج کی دنیا میں بے معنی اور فالتو نظر آتے ہیں۔

حقیقتاً ایک دفعہ جب ہم لہری تصادم کا نظریہ ہضم کر لیں تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ کرہ ارض پر اس وقت طاقت کے ردوبدل کا جو عظیم مظاہرہ نظر آ رہا ہے وہ مشرق ومغرب یا شمال اور جنوب کے درمیان ہونے والی تبدیلی نہیں ہے۔ نہ ہی یہ مذہبی اور لسانی گروپوں کے درمیان ہونے والی کوئی تبدیلی ہے بلکہ اس وقت جو بہت گہری' اقتصادی اور داؤ پیچ وغیرہ کی تبدیلیاں ہوتی نظر آ رہی ہیں' وہ دنیا کی تین واضح' ایک دوسرے سے مختلف اور عملاً باہمی متصادم تہذیبوں میں اس کی تقسیم ہے۔

پہلی تہذیبی لہر کا تعلق جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کلیتاً زمین سے تھا۔ مقامی طور پر اس نے جو شکل بھی اختیار کی ہو' اس سے متعلق لوگ جو زبان بھی بولتے ہوں۔ ان کا تعلق جس مذہب اور عقیدے سے بھی رہا ہو' یہ زرعی انقلاب کی پیداوار تھی۔ آج بھی انسانوں کی اکثریت جدید دور سے قبل کے معاشرے میں غیرمفتوحہ زمین پر اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتی ہوئی زندگی اور موت کا اسی طرح سامنا کر رہی ہے جس طرح صدیوں قبل ان کے آباؤ واجداد نے کیا تھا۔

تہذیب کی دوسری لہر کی بنیاد یا آغاز کا معاملہ متنازعہ ہے۔ بعض مورخ اس کے آغاز کو نشاۃ ثانیہ بلکہ اس سے بھی پہلے کے زمانے سے منسلک کرتے ہیں لیکن عام اندازوں کے مطابق عوام کی اکثریت کے لئے زندگی کا ڈھرہ اب سے تقریباً تین سو برس سے قبل تک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تبدیل ہونا شروع نہیں ہوا تھا۔ یہ نیوٹن کی سائنس کا زمانہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب سٹیم انجن کو پہلی دفعہ اقتصادی مقاصد کے حصول کے لئے استعمال میں لانے کا سلسلہ شروع ہوا اور برطانیہ، فرانس اور اٹلی کی سرزمین پر پہلی بار صنعتی کارخانے نمودار ہوئے۔ کسان شہروں کا رخ کرنے لگے۔ جرات مندانہ اور نئے خیالات کا ابلاغ شروع ہوا۔ ترقی کا خیال اور انفرادی حقوق کے تحفظ کا نظریہ سامنے آیا۔ روس کا سماجی کنٹرکٹ کا تصور ظہور پذیر ہوا۔ سیکولرازم کی ضرورت محسوس ہوئی، ریاست اور گرجا کی علیحدگی کی بات ہونے لگی اور یہ انوکھا خیال مقبول ہوا کہ رہنماؤں کے انتخاب کا معاملہ مشیت ایزدی پر چھوڑنے کی بجائے عوام کی مرضی سے حل ہونا چاہیے۔

ان میں سے بیشتر تبدیلیوں کا مقصد نئے طریقے سے یعنی کارخانوں کی پیداوار کے ذریعے دولت پیدا کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے جلد ہی مختلف قسم کے عناصر نے متحد ہوکر ایک سسٹم تشکیل دے دیا۔ بڑے پیمانے پر پیداوار، مصنوعات کا وسیع پیمانے پر استعمال، اس طرح تعلیم عام کرنے، ابلاغ کے ذرائع کو وسعت دینے وغیرہ کے یہ سب اقدامات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے اور یہ خصوصی اداروں کے زیراہتمام اور ان کی رہنمائی میں اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ سکول، کارپوریشنیں اور سیاسی جماعتیں سبھی اس سسٹم کا حصہ تھیں۔ حتیٰ کہ خاندانی ڈھانچہ بھی تبدیل ہوا۔ زرعی دور کے بڑے بڑے خاندانوں میں بھی جونسلوں تک ساتھ دیتے تھے، اب چھوٹے گھروں میں رہنے کا رواج ہوا۔ یہ صورت صنعتی معاشرے کے تقاضوں کے عین مطابق تھی۔

جو لوگ ان بڑی تبدیلیوں کے تجربوں میں سے گزر رہے تھے ان کو زندگی یقیناً افراتفری کی شکار نظر آتی ہوگی لیکن بہرحال یہ تبدیلیاں، حقیقتاً ایک دوسرے سے مربوط تھیں۔ یہ جدیدیت تک رسائی کے لئے محض چند ابتدائی اقدامات تھے، جدیدیت، یعنی بڑے پیمانے پر صنعتی معاشرے کا قیام جو دوسری لہر کی تہذیب کا مظہر تھا۔

مغربی یورپ کی تاریخ کے ایوانوں میں، یہ نئی تہذیب پوری گھن گرج کے ساتھ داخل ہوئی اور یورپ میں ہر قدم پر اس کی مدافعت کی گئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بڑا تنازعہ:

صنعتی دور میں داخل ہونے کی کوشش کرنے والے ہر ملک میں' دوسری صنعتی لہر معہ تجارتی گروپوں اور پہلی لہر کے زمینداروں کے درمیان' جن کی اعانت کے لئے گرجا (جو خود بھی بڑے بڑے رقبوں پر قابض تھا) بھی موجود ہوتا'' تلخ بلکہ بسااوقات خونی تصادم ہونے لگے۔ کسانوں کی بہت بڑی اکثریت کو زمینوں سے بیدخل کرکے ان ''شیطانی فیکٹریوں'' کے لئے مزدوروں کی فراہمی کا عمل شروع ہوا۔ ان فیکٹریوں کی تعداد اس وقت کے حالات میں برابر بڑھتی گئی۔

ہڑتالیں اور بغاوتیں' بلوے' سرحدی تنازعے اور قوم پرستی کے جذبات اس وقت ابھر کر سامنے آگئے جب پہلی اور دوسری لہر کے درمیان مفادات کے تصادم نے اہم ترین آویزش کی شکل اختیار کر لی۔ کشیدگی کے اس مرکز سے دوسرے تصادمات بھی نمودار ہوئے۔ یہ صورت حال تقریباً ان سبھی ممالک میں دیکھنے میں آئی جو صنعتی دور کی طرف گامزن تھے۔ امریکہ میں اس نے شمال کے صنعتی تجارتی مفادات اور جنوب کی زرعی اشرافیہ کے درمیان جسے مغلوب کرنا مقصود تھا خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے چند ہی برس بعد جاپان کا میجی انقلاب برپا ہوا اور دوسری لہر کے جدت پسند' پہلی لہر کے روایت پرستوں کے مقابلے میں ایک دفعہ پھر کامیاب و کامران ہوئے۔

دوسری لہر کی تہذیب کے پھیلاؤ اور دولت آفرینی کے نئے اور عجیب طریقے سامنے آنے کی وجہ سے ملکوں کے باہمی رشتے بھی غیر مستحکم ہوگئے اور طاقت کا خلاء اور غیرروایتی ہاتھوں میں اس کی منتقلی کا عمل شروع ہوگیا۔ صنعتی فروغ کی وجہ سے قومی منڈیاں وسعت پذیر ہوگئیں اور قوم پرستی کے نظریوں کو بڑھاوا ملا۔ قومی سالمیت کے نام پر لڑی جانے والی جنگوں نے جرمنی' اٹلی اور دوسری اقوام کو لپیٹ میں لے لیا۔ غیرمتوازن ترقی' منڈیوں کے لئے مقابلوں کی دوڑ' اسلحے کی پیداوار کے لئے نئی صنعتی تکنیک کا نفاذ' یہ سب ایسے معاملات تھے جن کی وجہ سے طاقت کا پرانا توازن برقرار نہ رہ سکا اور جن کی وجہ سے ہونے والی جنگوں نے یورپ کو انیسویں صدی کے وسط اور آخر میں اپنے ہمسایوں سے دور کر دیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اصل میں، اس وقت عالمی طاقت کا مرکزی سسٹم خلافت عثمانیہ اور زار روس کے جاگیردارانہ اور فرسودہ انتظامی ڈھانچے سے نکل کر صنعتی یورپ کی طرف منتقل ہونا شروع ہوا۔ تبدیلی کی اس دوسری لہر کے نتیجے میں ظاہر ہونے والی جدید تہذیب نے رودبارِ اوقیانوس کے شمالی ساحلوں پر تیزرفتاری سے اپنی جڑیں پھیلانا شروع کر دیں۔

بحراوقیانوس کے کناروں پر آبادقومیں جب صنعتی ترقی کے راستے پر گامزن ہوگئیں تو انہیں دور دراز کے علاقوں میں منڈیوں کی ضرورت اور خام مال کی بہم رسانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس طرح دوسری لہر کی ترقی یافتہ قوتوں نے نوآبادیوں پر قبضہ کرنے کی کاروائیوں کا آغاز کیا اور یوں انہوں نے ایشیا اور افریقہ کی پہلی لہر کے زیراثر موجود باقی ماندہ ریاستوں اور قبائلی علاقوں کو اپنے تسلط میں لے لیا۔

صنعتی اشرافیہ جس نے طاقت کے حصول کی جدوجہد میں اپنے ملکوں میں کامیابی کے جھنڈے گاڑے تھے، آخرکار اس شکل میں عالمی قوت بننے کی جدوجہد میں بھی سرخرو ہوئی۔

دوحصوں میں بٹی ہوئی دنیا:

اب دوبارہ اسی بڑے تصادم کا سامنا تھا یعنی دوسری لہر کی صنعتی قوتیں، پہلی لہر کی زرعی قوتوں کے مقابلے میں تھیں لیکن اب یہ کشمکش مقامی نہیں عالمی سطح پر تھی اور یہ وہی جدوجہد تھی جس نے دنیا کی نئی شکل متعین کی مگر یہ صورت اب سے کچھ عرصہ قبل تک ہی برقرار رہ سکی، بیشتر حالیہ جنگوں کی راہ اسی نے ہموار کی۔

مختلف قسم کے قدیم اور زرعی گروپوں کے درمیان ہونے والی قبائلی اور علاقائی جنگیں بھی جاری رہیں اس لئے کہ یہ تو زمانہ قدیم سے چلی آ رہی تھیں لیکن اس وقت ان کی اہمیت بہت محدود تھی اور ایسی لڑائیوں کے نتیجے میں اکثر دونوں فریق کمزور ہو جاتے جس کے بعد دونوں ہی نئی صنعتی نوآبادیاتی طاقتوں کے شکنجے میں آ جاتے۔ مثلاً جنوبی افریقہ میں یہی ہوا جب سیسل روڈھز اور اس کے مسلح فوجیوں نے قبائلیوں اور زمینداروں سے جوفرسودہ اور ناکارہ ہتھیاروں کی مدد سے باہم دست وگریباں تھے وسیع رقبے چھین کر قبضے میں کر لئے، دوسرے مقامات پر ہونے والی اس نوع کی بظاہر غیرمتعلقہ جنگیں بھی اس امر کی غماز تھیں کہ یہ متحارب ریاستوں کے درمیان عالمی تصادم کا اظہار نہیں بلکہ تہذیبوں کی محاذ آرائی کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

علامت ہیں۔

لیکن صنعتی عہد میں جو بڑی اور تباہ کن جنگیں ہوئیں وہ بین الصنعتی لڑائیاں تھیں۔ ایسی لڑائیاں جنھوں نے دوسری لہر کی اقوام کو، جیسے جرمنی اور برطانیہ ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر کوئی کرہ ارض پر اپنا اقتدار قائم کرنے اور پہلی لہر سے متعلق دنیا کی آبادی کو اپنی غلامی میں رکھنے پر تلا ہوا تھا۔

اس کا حتمی نتیجہ ایک واضح تقسیم کی صورت میں ظاہر ہوا۔ صنعتی عہد نے دوسری لہر کی تہذیب سے متعلق دنیا کو قابض اور مقبوضہ دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ قبضے میں لئے جانے والے ان بہت سے ملکوں کا تعلق پہلی لہر کے آزردہ اور محکوم ممالک سے تھا۔ ہم میں سے اکثر نے اس دنیا میں ہوش سنبھالا جو تہذیب کی پہلی اور دوسری لہر کے درمیان بٹی ہوئی تھی اور یہاں یہ صاف ظاہر تھا کہ طاقت کس کے ہاتھ میں ہے۔

تین حصوں میں منقسم دنیا:

آج عالمی تہذیب کی صف بندی کچھ مختلف ہے۔ ہم طاقت کے ایک بالکل ہی مختلف اور ایسے ڈھانچے کی طرف پوری تیز رفتاری سے رواں ہیں جو دنیا کو دو میں نہیں بلکہ تین متضاد اور متحارب تہذیبوں میں تقسیم کر دے گا۔ پہلے حصے یا تہذیب کی علامت اب بھی ہل اور پھاوڑا ہے، دوسرے کا تعلق اسمبلی لائن (صنعت) سے جبکہ تیسری تہذیب کمپیوٹر کی ہے۔

تہذیب کی اصطلاح کو تصنع آمیز قرار دیا جا سکتا ہے۔ بالخصوص امریکی کانوں کے لئے تو اسے قبول کرنا شاید مشکل ہو لیکن کوئی بھی دوسری اصطلاح، ٹیکنالوجی، خاندانی زندگی، مذہب، ثقافت، سیاست، تجارت، وراثت، لیڈر شپ، اقدار، جنسی اخلاقیات اور علمیات جیسے موضوعات کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ معاشرہ کی ان سبھی جہات میں تیز رفتار اور انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔

کسی نئی تہذیب کے آمد کے ساتھ ہی یہ بنیادی اور عام، سبھی قسم کی اشیاء پر اثر انداز ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یوں آج ہمارے سامنے بے شمار ایسی چیزیں موجود ہیں۔ ماضی میں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، نہ ہی وہ ہماری دسترس میں تھیں یا پھر معاشرہ بھی ان کے حق میں نہ تھا۔ ان چیزوں میں انسانی دل کی اکھاڑ پچھاڑ سے لے کر Frisbee تک، دہی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فروش کے لائسنس کے اجراء اور کنٹیکٹ لیز کے بارے میں مشاورت تک نیز فضا میں چہل قدمی سے لے کر گیم بوائے بارود تک' یسوع مسیح کے لیے یہودیوں کے رویے سے لے کر نئے زمانے کی عبادت گزاری تک' لیزر سرجنوں سے لے کر سی این این تک اور ماحولیاتی بنیاد پرستی سے لے کر انتشار کے نظریے تک سبھی کچھ اس نئی تہذیب کے ساتھ وارد ہوا ہے۔

ان تمام سماجی' فنی اور تہذیبی عناصر کو فوراً تبدیل کر دیں تو آپ دیکھیں گے کہ نہ صرف ایک تغیر رونما ہوا ہے بلکہ کایا پلٹ ہوگئی ہے اور یہ کہ معاشرے کی محض ہیئت ہی نہیں بدلی بلکہ مکمل طور پر ایک نئی تہذیب کی تشکیل نو کا آغاز ہوگیا ہے۔

لیکن کرہ ارض پر ایک نئی تہذیب کو متعارف کرانے کے بعد اس پر امن و امان قائم رکھنے کی توقع رکھنا سادگی اور بھولپن کی انتہا ہوگی کیونکہ ہر تہذیب کی اپنی اقتصادی (اور اس طرح سیاسی اور فوجی) ضروریات ہوتی ہیں۔

تین حصوں میں بٹی ہوئی دنیا میں پہلی لہر کا شعبہ زرعی اور معدنی وسائل مہیا کرتا ہے۔ دوسری لہر کا شعبہ سستی لیبر اور بڑے پیمانے پر صنعتی پیداوار دیتا ہے جبکہ تیسری لہر سے متعلق شعبہ علم اور اسکے استعمال کے زور پر وسائل پر قبضے کی بلندیوں تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

تیسری لہر سے متعلق اقدامات دنیا کو اطلاعات' ایجادات' اختراعات' مینجمنٹ' ثقافت اور پاپ کلچر کے علاوہ ایڈوانس ٹیکنالوجی' سافٹ ویئر' تعلیم' تربیت' طبی دیکھ بھال کے طور طریقے اور مالی اور دیگر خدمات فروخت کرتے ہیں۔ ان میں فوجی تحفظ کی خدمت بھی شامل ہوسکتی ہے جس کی بنیاد تیسری لہر کی اعلیٰ فوجی قیادت قرار دی جا سکتی ہے (خلیج کی جنگ میں اعلیٰ تکنیکی مہمات کی مالک قوتوں نے کویت اور سعودی عرب کو حقیقتاً یہی خدمات مہیا کی تھیں)۔

غریبوں کی اکھاڑ پچھاڑ:

تیسری لہر کی دماغی صلاحیتوں پر استوار اقتصادیات کی روزافزوں پیداواری صلاحیت (جسے قریب قریب صنعتی سوسائٹی کی آخری یادگار کہا جا سکتا ہے) پہلے ہی فرسودہ ہو چکی ہے۔ پیداوار پر کنٹرول اور اعلیٰ روایتی پیداوار کو محدود کرنے کی کوشش' صنعت کے پر کترنے کے مترادف ہے۔ خدمات بٹ چکی ہیں' غیر محسوس اثاثوں کو جیسا کہ معلومات وغیرہ ہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ غیر تعلیم یافتہ اور غیر ہنرمند مزدور بے روزگاری کا شکار بنائے جا رہے ہیں۔ پرانے صنعتی ڈھانچے اپنے ہی وزن تلے دب کر رہ گئے ہیں۔ جی ایم بتھیلم سٹیل جیسے اداروں کو جو کھلی پیداوار کے زمانے میں لوہے کی صنعت پر غالب تھے اب تباہی کا سامنا ہے۔ بڑے پیمانے پر مصنوعات تیار کرنے والے شعبوں میں لیبر یونینیں سکڑ کر رہ گئی ہیں۔ پیداوار کے ساتھ ذرائع ابلاغ کو بھی محدود کیا جا رہا ہے اور دیوقامت ٹی وی نیٹ ورک' نئے چینلوں کی صورت میں میدان میں لائے جا رہے ہیں۔ خاندانی نظام سکڑ کر رہ گیا ہے۔ خاندان کے جس مرکزی تصور کو جدید اور معیاری سمجھا جاتا تھا اب وہ اقلیتی صورت میں باقی ہے جبکہ یک ولائیتی گھرداری' دوبارہ شادی شدہ جوڑے' بغیر بچوں کے خاندان اور اکیلے رہنے والوں کے گھر روزمرہ کی بات ہو چکی ہے۔

کلچر' ایک ایسے کلچر سے جس میں تمام معیار متعین اور تمام سماجی درجے مقرر ہوتے ہیں ایسے کلچر میں بدل گیا ہے' جس میں خیالات' تصورات علامات بگولے کی طرح رقص کناں ہیں اور ہر شخص اپنے انفرادی خصائص سے اپنی تصویر خود تیار کرتا ہے۔ معینہ اقدار یا تو چیلنج کی جاتی ہیں یا پھر انہیں نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے معاشرے کا پورا ڈھانچہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ دوسری لہر کے معاشرے کی یک رنگی تیسری لہر کی تہذیب کی رنگا رنگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اس کے بدلے میں نئے سسٹم کی پیچیدگی اس کے مختلف یونٹوں کے درمیان معلومات کے زیادہ سے زیادہ تبادلے کا تقاضا کرتی ہے۔ کمپنیاں' حکومتی ایجنسیاں' ہسپتال' ایسوسی ایشنیں' دیگر ادارے اور افراد غرضیکہ سبھی شعبے معلومات کے بھوکے نظر آتے ہیں۔ یہ صورت حال کمپیوٹر' ڈیجیٹل ٹیلی کمیونیکیشنز' نیٹ ورکس اور ابلاغ کے نئے طور طریقوں کی ضرورت کا شدت سے احساس دلاتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی ٹیکنالوجی کی ترقی عارضی تبدیلیوں اور روزمرہ زندگی کی رفتار بھی تیز تر ہو جاتی ہے۔ تیسری لہر سے متعلق اقتصادیات میں اتنی تیزی آ جاتی ہے کہ جدید عہد سے قبل کے مال سپلائی کرنے والے اس کے ساتھ قدم ملا کر نہیں چل سکتے۔ اس کے علاوہ چونکہ خام مال' محنت اور وسائل کی جگہ اب معلومات کی بنیاد پر کام ہوتا ہے۔ تیسری لہر کے ممالک کا پہلی اور دوسری لہر کے حصہ داروں پر' منڈیوں کے سوا انحصار کم سے کم ہو جاتا ہے۔ وہ ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوسرے سے لین دین آپس ہی میں زیادہ کرتے ہیں۔ آخر یہ ہوگا کہ نئی معلومات پر مبنی اپنے علم کے زور پر وہ بہت سے ایسے کام بھی خود ہی کرنے لگیں گے جو اس وقت وہ ملک کر رہے ہیں جن میں سستی محنت مہیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایسے کام وہ ان سے کم وقت میں بہتر طریقے سے اور نسبتاً سستے ذرائع سے کر سکیں گے۔

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تبدیلیاں مالدار اور غریب اقتصادی یونٹوں کے درمیان موجود رابطوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیں گی۔

ہاں یہ تعلق پورے طور پر توڑنا تو ممکن نہیں ہے' البتہ آلودگی اور بیماری کے حملوں کو روکنا اور تیسری لہر کے ملکوں کی سرحدوں کی طرف ہجرت کے عمل کو روکنا قطعاً ممکن نہ ہوگا۔ غریب ممالک نے اگر ساز باز کے ذریعے امیر ممالک کے خلاف اپنے ماحول کو ڈھال بنا لیا تو سبھی کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو سکتا ہے۔ انہی اسباب کی بناء پر تیسری لہر کی تہذیب اور دونوں پرانی لہروں کی تہذیبوں کے درمیان کشیدگی بڑھتی رہے گی اور عالمی اجارہ داری کے قیام کی خاطر نئی لہر آخر تک لڑائی جاری رکھے گی بالکل اسی طرح جس طرح دوسری لہر کے جدت پسندوں نے پہلی لہر سے پہلے کے جدیدیوں کا تین صدیوں تک مقابلہ کیا۔

ڈک سوپ کا عجوبہ:

تہذیبوں کے تصادم کے تصور کو اگر ایک دفعہ پوری طرح سمجھ لیا جائے تو بہت سی عجیب وغریب باتوں کا ادراک کرنے میں آسانی ہوتی ہے' مثلاً آج کا قوم پرستی کا شعلہ فشاں جنون قوم پرستی قومی ریاست کا نظریہ ہے جو خود صنعتی انقلاب کی پیداوار ہے۔ اس طرح پہلی لہر یا زرعی معاشرے جونہی صنعتی دور میں داخلے کی تکمیل کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی قومیت کا تحفہ آویزاں کرنے کا اصرار شروع ہو جاتا ہے۔ سابق سوویت یونین کی ریاستیں یوکرائن یا اسٹونیا یا جارجیا حق خود اختیاری کا مطالبہ بڑے متشددانہ طریقوں سے کرتی ہیں اور گزرے ہوئے کل کے جدید عہد کی نشانیوں کی بازیافت پر مصر ہوتی ہیں۔ اپنا جھنڈا' اپنی فوجیں اور اپنی کرنسی کی جو دوسری لہر یا صنعتی دور میں قومی ریاست کی نشانی سمجھی جاتی ہیں' طلب گار ہوتی ہیں۔

اعلیٰ ٹیکنالوجی کی دنیا کے اکثر باسیوں کے لئے انتہا پسندانہ قوم پرستی کے اصل مقاصد کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ادراک مشکل ہے۔ ان کی حب الوطنی کا پھولا ہوا غبارہ اکثر لوگوں کے نزدیک مذاق کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے رویے سے مارکس برادرز کی فلم ''ڈک سوپ'' میں دکھائے جانے والے فری دوسینہ کے علاقے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جہاں برتری کی مثال پیش کرتے ہوئے طنزیہ طور پر دو افسانوی قوتوں کو ایک دوسرے کے خلاف برسرِپیکار دکھایا گیا ہے۔

اس کے مقابلے میں قوم پرستوں کے لئے یہ سوچنا تک ناقابل قبول ہے کہ کچھ ملک دوسروں کو اپنی مقدس آزادی پر حملے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ اس کے باوجود تجارت اور سرمائے کی گلوبائزیشن جو تیسری لہر کی اقتصادی ضرورت ہے، قومی سلامتی کے اس تصور کو پنکچر کر دیتی ہے۔

گلوبل ازم کے حدی خواں:

جیسے ہی تیسری لہر کے ذریعے دوسری لہر کے ممالک کی اقتصادیات کی شکل بدلتی ہے، انہیں اپنی سالمیت کا ایک حصہ تجنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اور ایک دوسرے کے اقتصادی اور ثقافتی معاملات میں دخل اندازی کے عمل کو بھی قبول کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً امریکہ اس پر مصر ہے کہ جاپان، تقسیم کاری کے پرچون سسٹم کا ڈھانچہ نئے سرے سے ترتیب دے (اور یوں دکانداروں کی ایک پوری سماجی کلاس کو معہ ان کے کلچر اور اس خاندانی ڈھانچے کے جس کی وہ نمائندگی کرتے ہیں تہس نہس کر دے) اس کے جواب میں جاپان امریکہ سے بچتوں میں مزید سرمایہ کاری کا مطالبہ کرتا ہے نیز طویل المدتی سوچ اپنانے پر زور دیتا ہے اور اس کے تعلیمی ڈھانچے میں ردوبدل کرنے کی تجاویز پیش کرتا ہے۔ ایسے مطالبات کو ماضی میں یقیناً ملکی سالمیت پر ناقابل قبول حملوں کا نام دیا جاتا۔

یعنی صورت حال یہ نظر آتی ہے کہ اقتصادی لحاظ سے پسماندہ خطوں کے شاعر اور دانشور جہاں قومی نغمے تحریر کر رہے ہیں وہاں تیسری لہر کے زیر اثر ممالک کے شعراء اور دانشور، سرحدوں سے ماورا دنیا کے گن گاتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس صورت حال کے نتیجے میں ظہور پذیر ہونے والے تصادمات سے دو بالکل مختلف تہذیبوں کی مختلف النوع ضروریات کی نشاندہی ہوتی ہے جو آنے وال دور میں انتہائی خونریز واقعات کا سبب ہوسکتی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آج کی دنیا کی اگر دو کی بجائے تین حصوں میں تقسیم فی الوقت بالکل یقینی نظرنہیں آتی تو اس کی سیدھی سی وجہ یہ ہے کہ دوسری لہر کی اندھی قوت پر مبنی اقتصادیات کی دماغی قوت پر مشتمل تیسری قوت میں تبدیلی کا عمل ابھی پوری طرح مکمل نہیں ہوا۔

دوسری اور تیسری لہر کی اشرافیہ کو قابو میں لانے کی جنگ خود امریکہ' جاپان اور یورپ میں جاری ہے۔ دوسری لہر کے اہم ادارے اور پیداواری شعبے ابھی موجود ہیں اور دوسری لہر کے زمانے کی سیاسی قوتیں ابھی تک اقتدار کے ایوان میں موجود ہیں۔ اس صورت حال کی ایک جامع مثال بش (سینئر) کی انتظامیہ کے آخری زمانے میں امریکہ میں اس وقت سامنے آئی جب امریکی کانگریس نے150ارب ڈالر کا ''انفراسٹرکچر'' بل پاس کیا جس سے دوسری لہر کے پرانے ڈھانچے کو مستقل کرنا اور سڑکوں' شاہراہوں اور پلوں وغیرہ کی مرمت کرکے ان کی چمک میں اضافہ کرنا مقصود تھا۔ اس کے ساتھ ہی الیکٹرانک سپر کمپیوٹر نیٹ ورک کی' جس کا تعلق لازمی طور پر تیسری لہر کے انفراسٹرکچر سے تھا۔ تیاری میں مدد دینے کے لئے صرف ایک ارب ڈالر کی رقم مخصوص کی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ کلنٹن انتظامیہ نے بھی جو اگرچہ تیز رفتار نیٹ ورکس کے قیام کی زبردست حامی تھی' اخراجات کی شرح کے اس تناسب میں کسی قسم کا رد و بدل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

اعلیٰ تکنیکی مہارت والے ہر ملک میں دوسری اور تیسری لہر کے عناصر کی ملاوٹ' ہر ایک کو اس کی اپنا تربیتی کردار عطا کرتی ہے۔ بہرحال راستہ بڑا واضح ہے' مقابلے کی عالمی دوڑ میں کامیابی انہی ممالک کے قدم چومے گی جو تیسری لہر میں داخلے کے لئے تبدیلی کے عمل کو مقامی سطح پر کم سے کم توڑ پھوڑ اور بے چینی کے بغیر مکمل کرلیں گے۔

اس دوران میں دو برابر کے حصوں میں بٹی ہوئی دنیا کی تین حصوں میں تقسیم کی تاریخی تبدیلی کا عمل' اس کرہ ارض پر طاقت کے حصول کی جدوجہد میں یقیناً تیزی لانے کا باعث ہوگا کیونکہ طاقت کے اس ابھرتے ہوئے سہ جہاتی ڈھانچے میں ہر ملک اپنا مقام متعین کرنے کے لئے کوشاں ہوگا۔ آئندہ جو بھی جنگیں لڑی جائیں گی ان کے سیاق وسباق کا تعین سہ جہاتی دنیا میں ہوگی اور یہ لڑائیاں ہماری سوچ اور فکر سے قطعاً مختلف ہوں گی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوسرا حصہ

تیزی سے آگے بڑھنے کا راستہ

انقلابی حقیقت پسندی

تمام تر قدامت پرستی کے باوجود فوجی اداروں میں ہمیشہ ایسے تغیر پسند افراد بھی موجود رہے ہیں جو ان اداروں میں انقلابی تبدیلیاں لانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ جارج موریلی اور اس کے دوسرے رفقا بھی جنہیں آنے والے زمانے میں فوج کے لڑائی کے طریقوں میں تبدیلیاں لانے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی' ایسی ہی ایک پرانی فوجی روایت کا حصہ تھے۔ حقیقتاً مورخوں نے ''جنگی حکمت علی میں انقلاب'' کے موضوع پر کتابیں تحریر کرکے لائبریریوں کی الماریوں کو لبالب بھر رکھا ہے۔

بہرحال یہ اصطلاح بالعموم بھی فراخدلی سے استعمال کی جاتی رہی ہے' مثلاً کہا جاتا ہے کہ سکندراعظم نے مغربی رخ پر متعین اپنی فوج کے پیدل دستوں کو مشرق کی سمت میں متعین گھڑسواروں کے ساتھ ملا کر ایرانیوں کو شکست سے دوچار کیا تو اس تجربے کو جنگی حکمت عملی میں انقلاب آفرین تبدیلی کا نام دیا گیا۔ تکنیکی تبدیلیوں کے لئے جن میں مثلاً بارود کو متعارف کرانا جہازوں اور سب میرین وغیرہ کو جنگی مقاصد کیلئے استعمال میں لانے کی کاروائیاں شامل ہیں' بھی ''انقلاب'' کا لفظ اکثر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اس صورت حال سے جنگی حکمت عملیوں میں نمایاں تبدیلیاں آئیں اور اس وجہ سے بعد کی تاریخ پر واقعتاً بے شمار مخصوص اثرات مرتب ہوئے' یہاں تک کہ اس کو منی انقلاب کا نام بھی دیا گیا۔ یہ تبدیلیاں بنیادی طور پر پہلے سے موجود ایک کھیل میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نئے عناصر کا اضافہ کرتی ہیں یا پھر پرانے عناصر کی نئی تربیت کا سبب بنتی ہیں' لیکن ایک صحیح اور سچا انقلاب اس سے بہت آگے تک جاتا ہے اور وہ اس کھیل' اس کے ضوابط' ساز و سامان' کھیل میں شامل ٹیموں کے حجم اور نظم و ضبط' ان کی تربیت' نظریئے' حکمت عملی اور تقریباً سبھی کچھ بدل کر رکھ دیتا ہے۔ کوئی ایک ٹیم ہی اس کا سامنا نہیں کرتی بلکہ اس کی زد بیک وقت کئی ٹیموں پر پڑتی ہے۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس عمل کے نتیجے میں معاشرے اور اس کھیل کے درمیان رشتے کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔

مشکل اور پیچیدہ نوعیت کے ایسے انقلاب انسانی تاریخ میں دو دفعہ ہی برپا ہوئے ہیں اور یہ یقین کرنے کے مضبوط شواہد موجود ہیں کہ تیسرا جو اب شروع ہو رہا ہے ان کے مقابلے میں کہیں دور رس ہوگا کیونکہ چند حالیہ دہائیوں میں مروجہ جنگی طور طریقے اپنی افادیت کی آخری حد تک پہنچ چکے ہیں اور ان کا تعلق ہتھیاروں کی دور تک مار کرنے کی استعداد' ہلاکت آفرینی اور رفتار سے ہے۔

اب صورت یہ ہے کہ جو فوجیں آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ضرب کاری لگانے کی اہل ہیں اور تیرفتاری سے میدان جنگ میں پہنچ سکتی ہیں۔ فتح انہی کا مقدر ہوگی جبکہ جن فوجوں کے ہتھیار وں کی مار کرنے کی استعداد محدود ہوگی اور جو اسلحہ کسی کمی سے دوچار ہوں گی اور ان کی رفتار سست ہوگی وہ شکست سے بچ نہیں سکیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں فوجوں اور ہتھیاروں کے دائرکار کو وسعت دینے ان کی آتش باری کی قوت میں اضافہ کرنے اور رفتار بڑھانے کیلئے انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کا خاصا بڑا حصہ بروئے کار لایا جا رہا ہے۔

مہلک ملاپ:

ہتھیاروں کے دور تک مار کرنے کے معاملے ہی کو دیکھ لیجئے۔ پوری انسانی تاریخ شاہد ہے کہ جنگ باز، ہتھیاروں کی مار کرنے کی حد میں توسیع کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔ چوتھی صدی قبل مسیح کی ایک جنگ کا ذکر کرتے ہوئے مورخ ڈائیوڈورس نکولس لکھتا ہے کہ یونانی جرنیل اخی کریٹس نے ایرانیوں کی طرف سے مصریوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے بھالوں کو ڈیڑھ گنا اور تلواروں کی لمبائی کو دگنا کر کے، اپنے ہتھیاروں کی مار کرنے کی حد میں اضافہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کیا۔

منجنیق اور اس قسم کے دوسرے قدیم ہتھیاروں میں350 گز کی دوری تک مار کرنے کی استعداد پیدا کی گئی۔ پانچ سو برس قبل مسیح، چین میں جو کمان استعمال ہوتی تھی اور جو گیارہویں صدی عیسوی تک یورپ میں مروج رہی، سپاہی کو ایسے مہلک ہتھیار سے لیس کر دیتی تھی جس کی مار بہت دور دور تک تھی (یہ کمان اس قدر ہولناک تھی کہ1130ء میں پوپ معصومii نے اس کے استعمال پر پابندی لگانے کی کوشش کی) چودہویں اور پندرہویں صدی تک اس کمان سے نکلا تیر380 گز تک مار کرتا تھا۔ ترکوں نے اس میدان میں صدیوں کے تجربوں کے بعد انیسویں صدی میں تیر کو600 گز تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی، مگر میدان جنگ میں پورے فاصلے تک مار کرنے میں کامیابی کی نوبت کم ہی آتی تھی۔

1942ء میں الیگزنڈر ڈی سیدر سکائی نے اپنی تصوراتی کتاب ''ذکڑی تھروائر پاور'' میں امریکہ کو ایسے لڑاکا ہوائی جہاز تیار کرنے کی ضرورت کا احساس دلایا جو بغیر رکے600 میل تک پرواز کر سکتے ہوں۔ اس وقت اس خواہش کی تکمیل بظاہر ناممکن نظر آتی تھی لیکن فضائی جنگ کی ضرورتوں کے پیش نظر تیار کئے جانے والے اسلحے کو نظرانداز کرتے ہوئے بھی یہ حققت پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس وقت کرہ ارض پر کوئی بھی ایسا مقام نہیں ہے جسے بین براعظمی بلاسٹک میزائلوں، طیارہ بردار جہازوں، سب میرینوں، فوری ایندھن بھرنے اور دور تک مار کرنے والے طیاروں یا ان تمام یا کچھ دوسرے ہتھیاروں کی مجموعی کارکردگی کو بروئے کار لاتے ہوئے ہدف نہ بنایا جا سکتا ہو۔ ہتھیاروں کی دور تک مار کرنے کی صلاحیت نے اب عملی طور پر کرہ ارض کی آخری حدوں کو چھو لیا ہے۔

زیادہ فاصلے پر مار کرنے کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کی رفتار بھی بڑھی ہے۔ جون1991ء میں امریکہ کے محکمہ دفاع نے عوام کو ان کیمیائی لیزر کی تیاری سے آگاہ کیا اور بتایا کہ انٹی میزائل سسٹم کی تیاری کے سلسلے میں یہ دس لاکھ واٹس انرجی پیدا کر سکتا اہے۔ یہ کیمیائی لیزر، اگر اس کے ہدف کی صحیح طریقے سے نشان دہی کی جا سکے، روشنی کی رفتار سے دشمن کے میزائل تک پہنچ سکتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ رفتار کی انتہائی ممکنہ حد ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جہاں تک ہلاکت آفرینی کا تعلق ہے، یہ حقیقت ہے کہ صنعتی انقلاب کے زمانے سے لے کر آج تک روایتی ہتھیاروں کی ہلاک کرنے کی قوت کئی گنا بڑھ چکی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سٹیم انجن اور فیکٹریوں کے وجود میں آ کر دنیا کو بدلنے کے وقت تک غیرایٹمی ہتھیاروں کی ہلاکت آفرینی اس وقت اوسطاً ایک لاکھ گنا زادہ ہو چکی ہے۔ جہاں تک ایٹمی ہتھیاروں کی تباہ کاریوں کے اندازے کا معاملہ ہے، یہ کام چرنوبل کے نقصانات سے سو یا ہزار گنا بڑھا کر اس خطرے کا احساس کیا جا سکتا ہے۔گزشتہ نصف صدی کے دوران ہی میں ایسے حالات پیدا ہوگئے ہیں کہ کرہ ارض کی تباہی کے خطرے کے موضوع پر سنجیدہ بحث مباحثہ کی شدت سے ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ ہمارے زمانے میں فوجی ترقی کے تین مہلک ذرائع کا ملاپ ہوگیا ہے۔ ہتھیاروں کی دور دور تک مار کرنے کی صلاحیت ، بڑھی ہوئی رفتاراور ہلاکت آفرینی میں شدت نے تاریخ کے اس لمحے میں اپنی آخری حدوں کو چھو لیاہے اور یہ سارا کام موجودہ نصف صدی میں ہوا ہے۔ اگر کچھ اورنہیں تو صرف یہ ایک حقیقت ہی جنگی حکمت عملی میں انقلاب کی اصطلاح کا جواز مہیا کرنے کے لئے کافی ہے۔

کھیل کے خاتمے کے بعد:

بات یہیں ختم نہیں ہوتی، جوہری ہتھیاروں کے پہلی دفعہ استعمال ہونے کے ٹھیک بارہ برس بعد1957ء میں دنیا کا پہلا خلائی جہاز جنت کی وسعتوں میں گردش کرتا ہوا نظر آیا جس سے فضائی جاسوسی، جہازرانی، مواصلاتی سرگرمیوں، موسمیات اور فوجی کاروائیوں کے سینکڑوں مزید امکانات کے لئے ایک بالکل ہی نیا میدان سامنے آ گیا۔فوجی مقاصد کے لئے سمندر اور ہوائی جہازوں کے استعمال کے سوا انسانی تاریخ میں اس سے قبل اتنے دور رس اثرات کا حامل کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔

اس کے چند برس بعد چاند پر انسان اتارنے کی امریکی کوششوں کے سلسلے میں اس وقت کے امریکی صدر جان ایف کینیڈی نے کہا تھا: ”فضا میں برتری کے آخرکار کیا معانی اورفوائد ہوں گے، اس بارے میں یقینی طور پرکوئی پیش گوئی کرنا اگرچہ مشکل ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ فضا میں ی برتری زمین پر ہمارے مستقبل کی کنجی ثابت ہو۔“

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جنگی اور فوجی طور طریقوں میں زبردست قسم کی یہ تبدیلیاں گزشتہ 34 برس کی مختصر مدت میں سامنے آئی ہیں اور یہ وہی لمحہ ہے جس میں کرہ ارض کی غالب تہذیب، دوسری لہر یا صنعتی معاشرہ کے زوال کا آغاز ہوا۔ یہ تبدیلیاں ایسے وقت میں ظہور پذیر ہوئیں جب صنعتی عہد کا کھیل ختم ہو رہا تھا اور یہ قریب قریب وہی وقت تھا جب ایک نئی قسم کی اقتصادیات اور نئے معاشرے نے واضح صورت اختیار کرنا شروع کر دی تھی اور جب اس طرح کچھ اقوام ابھی صنعتی عہد کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ اسی طرح تیسری لہر یا مابعد صنعتی عہد کی تہذیب امریکہ، یورپ اور ایشیائی بحرالکاہل کی پٹی کے ساتھ پھیلے ہوئے ممالک میں پھل پھول رہی ہے۔

اس حقیقت کی وضاحت کرنے میں اس بات کے ذکر سے آسانی ہوتی ہے کہ اب جو فوجی انقلاب ہمارے سامنے وقوع پذیر ہو رہا ہے وہ اس کے بارے میں اب تک غور وفکر کرنے والوں کی سوچ کے مقابلے میں کہیں زیادہ گہرا اور دوررس ہوگا۔ ایک فوجی انقلاب، صحیح معانی میں اس وقت برپا ہوتا ہے جب ایک نئی تہذیب پرانی تہذیب کو چیلنج کرنے کے لئے ابھرتی ہے۔ جب پورا معاشرہ کایا پلٹ کے عمل سے گزرتا ہے اور فوج کو بیک وقت ہر سطح پر ٹیکنالوجی اور کلچر سے تنظیم، حکمت عملی، طریق کار، تربیت، نظریے اور نقل وحرکت کے نئے طریقے اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ جب یہ سب کچھ ہوتا ہے تو اقتصادیات اور معاشرے سے فوج کے رشتے میں بنیادی تبدیلی آ جاتی ہے اور زمین پر فوجی طاقت کا توازن تہس نہس ہو کر رہ جاتا ہے۔

اس سے پہلے اتنا جامع انقلاب انسانی تاریخ نے شاید ہی دیکھا ہو۔

پہلی لہر کی جنگ:

پوری انسانی تاریخ میں جس طرح مرد عورت لڑتے جھگڑتے نظر آتے ہیں، اس سے ان کے طریق کار کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس رومان پرور عقیدے کے باوجود کہ زمانہ قدیم کی قبائلی برادریوں میں زندگی، رواداری اور امن کی برکتوں سے مالا مال تھی۔ زرعی عہد سے قبل خانہ بدوشوں اور گلہ بانی سے متعلق گروہوں کے درمیان خونریز تصادم برابر ہوتے رہے ہیں۔ مورس آرڈیوں نے اپنی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کتاب ''جنگ کا ارتقا'' میں ایسے بین الگروہی تصادمات کی نشاندہی کی ہے جن میں متعدد قدیم قبائل اپنے آپ کو موجود پاتے۔ یہ چھوٹے چھوٹے گروہ قتل، عورتوں کے اغوا یا پھر طاقت کے کھیل میں حصہ لینے کی کوششوں کا بدلہ لینے کے لئے معرکہ آرا ہوتے رہتے، مگر یہ طے شدہ بات ہے کہ تشدد اور جنگ ایک ہی چیز نہیں ہے۔ یہ بہت بعد کی بات ہے جب باہمی آویزشوں نے صحیح معنی میں جنگ کی صورت اختیار کی۔ یعنی جب منظّم ریاستوں کے درمیان خونریز تصادمات کی نوبت آئی۔

زرعی انقلاب نے انسانی تاریخ میں تبدیلی کی پہلی لہر کو جنم دیا تو اس نے بالآخر ابتدائی ''پری ماڈرن'' معاشرہ کی تدریجی تشکیل کی طرف قدم بڑھایا۔ اس کی بنیاد پر انسانوں نے مستقل بستیاں بسائیں اور متعدد دوسری سیاسی اور سماجی اختراعات کی راہ ہموار کی، ان میں اہم ترین اختراع بجائے خود جنگ تھی۔

دو وجوہ کی بناء پر زراعت جنگ کا ذریعہ بن گئی۔ اس نے قومیتوں کو پیداوار کا عمل شروع کرنے اور اقتصادی طور پر فالتو اجناس کا جس پر قبضے کے لئے محاذ آرائی کا امکان ہو سکتا تھا، ذخیرہ کرنے پر مائل کیا۔ اس طرح ریاست کے وجود میں آنے کی کاروائی تیز ہوئی اور ان سب چیزوں نے مل کر اس صورت حال کو جنم دیا جو حربی سائنس کو وجود میں لانے کی پہلی شرط ٹھہری۔

عہد جدید سے قبل کی سبھی لڑائیوں کے مقاصد بہرحال اقتصادی ہیں۔ جنگوں سے متعلق لٹریچر اس کی وجوہ میں مذہبی جنون پرستی سے لے کر اس مخلوق میں موجود جارحیت کے وجود تک ہر چیز کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ اس کے باوجود اقتصادیات اور تحریک امن کے ممتاز ماہر ئیتھ بولڈنگ کے الفاظ میں ''جنگ، غنڈہ گردی، حملہ آور ہونے کی کوششوں اور گاہے بگاہے ظہور پذیر ہونے والے تشدد سے قطعاً مختلف چیز ہے، اس کے لئے زرعی شعبے سے فالتو اجناس کے ایسے ذخیرے درکار ہوتے ہیں جو ایک مقررہ جگہ پر جمع ہوں اور کسی ایک اتھارٹی کی مرضی کے مطابق استعمال کے لئے رکھے گئے ہوں، یعنی اس کے حکم سے استعمال کئے جا سکتے ہوں۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رسمیں ریتیں، موسیقی اور اوچھاپن:

ماضی کے جنگجوؤں اور فوجی حکمت عملی کے ماہروں کو جنگ اور زمینی رشتوں سے پوری آگاہی تھی۔ قدیم چین کے عظیم لارڈ شانگ نے تومیکاولی کے اٹھارہ سو برس بعد تیار کئے جانے والے سیاسی منشور سے سینکڑوں برس پہلے سیاستدانوں کے لئے ہدایت نامہ تیار کر دیا تھا۔ اپنی اس قدیم تحریر میں نے واضح طور سے لکھ دیا تھا کہ ''ملک کا انحصار زراعت پر ہے اور قیام امن کا دارومدار جنگ پر۔''

شا گیا نے 359 سے 338 قبل مسیح تک چن کی ریاست میں خدمات انجام دیں۔ اپنی اس اہم سیاسی اور فوجی تصنیف میں وہ حکمرانوں کو بار بار یہ مشورہ دیتا ہے کہ ریت رسم، موسیقی اور ہلکے پن کے ایسے اثرات سے جو انکی توجہ زراعت اور جنگ سے ہٹا سکتے ہوں، محفوظ رکھنے کیلئے لوگوں کو دور رکھنے کی کوشش کریں۔

> ''جو بھی حکمران ملک کا انتظام چلاتا ہے وہ اگر زمین کی پوری پیداواری صلاحیت کو کام میں لانے کا سامان بہم پہنچا سکتا ہے اورعوام کو تامرگ جنگ میں حصہ لینے کو تیار رکھ سکتا ہے، وہ شہرت اور نفع دونوں کے مزے لوٹے گا۔''

آبادی کم ہو جانے کی صورت میں شانگ حکمرانوں کو ہمسایہ زمینداروں اور جاگیرداروں کے سپاہیوں کو ورغلا کر اپنے علاقے کی طرف ہجرت کی ترغیب دینے کا مشورہ دیتا ہے اور کہتا ہے ان سے دس برس تک فوجی خدمات نہ لینے کا وعدہ کروا دو اور ان کو زراعت کے شعبے میں کام پر لگا دو اور یوں اپنی موجودہ آبادی کو میدان جنگ میں جھونکنے کا سامان پیدا کرو۔''

فوجی نظم و ضبط قائم رکھنے کے سلسلے میں لارڈ شان کا نسخہ اس کی خصوصی سوچ کا مظہر ہے۔ ''جنگ کے لئے پانچ آدمیوں کا دستہ تیار کیا جاتا ہے۔ ان میں سے اگر ایک کام آ جاتا ہے تو باقی چاروں کے بھی سر کاٹ دو۔'' دوسری طرف وہ فتح مند ہونے والے افسران کے لئے جنس، غلاموں حتیٰ کہ 300 خاندانوں پر مشتمل کسی ٹیکس ادا کرنے والے گاؤں کی بخششیں دینے کا مشورہ دیتا اہے۔

لارڈ شانگ، سن زو کا جس کی کتاب ''جنگ کا فن'' فوجی کلاسیک کی حیثیت اختیار کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چکی ہے، ہم عصر تھا۔ سیموئل بی گرفتھ نے اس کے ایک حالیہ ایڈیشن کے دیباچے میں لکھا ہے، ''بہار اور خزاں کے موسموں میں فوجوں کی تعداد کم ہو جاتی۔ ان کی تنظیم بھی ڈھیلی ڈھالی نظر آتی اور ان کی رہنمائی سے بے توجہی بھی عام ہوتی۔ ساز و سامان کی کمی اور تربیت کا فقدان بھی واضح ہوتا حتیٰ کہ ان کی سپلائی سے بھی اغماض برتا جاتا۔ اس زمانے میں بہت سی مہمیں محض اس لئے ناکامی کا شکار ہو جاتیں کہ فوجیوں کے پاس کھانے کو کچھ نہ ہوتا۔ درپیش مسائل کو جلد از جلد حل کرنے کی کوشش کی جاتی۔ شہروں کا محاصرہ بہرحال جاری رہتا، مگر فوجوں کو اکثر طویل وقفوں کیلئے کھیتوں میں رکھا جاتا اگرچہ ایسی کاروائیاں معمول کی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔''

ایک موسمی مصروفیت:

جہاں تک خوراک اور زراعت کا تعلق ہے، قدیم یونان میں صدیوں بعد بھی صورت حال کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ زرعی معاشرے میں مجموعی پیداوار کم اور محنت کے معاوضے کی وصولی سست رو تھی۔ فالتو پیداوار اتنی کم تھی کہ آبادی کے 90 فیصدی حصے کو زمین پر کام کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑتا تھا۔ کسی ایک بیٹے کے فوجی خدمات کیلئے روانہ ہونے کا مطلب اس کے خاندان کی اقتصادی تباہی کے مترادف ہوتا تھا۔ اس طرح بقول مورخ فلپ ایم ہٹی کے یونانی جب جنگ و جدل میں مصروف ہوتے تو یہ جنگیں موسمی مصروفیتوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ سرما کے مہینوں میں جب کھیتوں میں کام کرنے کی ضرورت نہ ہوتی جنگ کے لئے سپاہیوں کی شکل میں رضا کار آسانی سے مل جاتے۔

لیکن ان کیلئے جلد سے جلد واپس کھیت پر پہنچنا ضروری ہوتا تھا۔ یونانی زراعت کی پیداواری تثلیث، زیتون، انگور اور اجناس کی فصلوں کی کٹائی کے لئے ان کام کرنے والوں کی شدت سے ضرورت محسوس کرتی ہے۔ ''اس طرح ان کسانوں کو سال میں مختصراً ایک یا دو ہی ایسے فارغ مہینے مل سکتے تھے جس میں وہ جنگوں میں حصہ لے سکتے۔'' یہ ہے ''دی ویسٹرن وے آف دی وار'' کے کلاسیکل سکالر وکٹر ہنسین کی رائے۔

جنگی خدمات کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنے والے سپاہیوں کو اکثر تین دن کی خوراک ساتھ لانے کے لئے کہا جاتا۔ اس کے ختم ہونے کے بعد ان کی خوراک کا انحصار

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان دیہات پر ہوتا جہاں وہ متعین ہوتے۔ مورخ جان کیگن کے بیان کے مطابق شہری ریاستوں کے درمیان جنگ کے دوران میں میدان جنگ میں ایک ریاست دوسری ریاست کے سپاہیوں کو قتل کرنے کے بعد اسے جو بدترین قسم کا نقصان پہنچا سکتی تھی وہ اس کی زرعی تباہی کا سامان ہوتا تھا۔ صدیوں بعد بھی جب تاریخ ان قدیم یونانی ریاستوں کو نگل چکی ہے کہانی وہی کی وہی ہے۔ پہلی لہر کے معاشروں میں جنگیں زراعت کے سلسلے ہی میں لڑی جاتی رہیں۔

تاریخ کے کسی بھی عام اصول کے مطابق پہلی لہر کی فوجوں کے پوری طرح منظّم نہ ہونے، ان کی بے سروسامانی اور عدم رہنمائی کی عام کیفیت میں متعدد اہم متشنیات کی نشان دہی بھی ہوتی ہے۔ ان کے عروج کے دور میں رومی لشکروں کو کون سرسری اور غیر منظّم قوت قرار دے سکتا ہے؟ اس کے باوجود سن زدعہد فوجوں کے ڈھیلے ڈھالے کردار کے متعلق گرنتھ کے تبصرے کو انسانی تاریخ کے طویل عرصے اور دنیا کے متعدد دوسرے حصوں کی فوجوں پر بھی یقیناً لاگو کیا جا سکتا ہے۔

یہ صورت حال عدم مرکزیت کی گرفت میں واقع ان زرعی معاشروں پر زیادہ صادق آتی تھی جو بڑی زمینداریوں کے تسلط میں تھے۔ وہاں شاہ اپنی کسی بھی فوجی مہم میں اپنے سپاہیوں کی اعانت کے لئے ان زمینداروں کا محتاج ہوتا تھا، مگر وہ ان کی خدمات محدود مدت ہی کے لئے طلب کر سکتا تھا۔ مورخ کارل اے وٹ نوبل نے اپنی ماہرانہ تصنیف ''مشرقی مطلق العنانیت'' میں لکھا ہے، ''فیوڈل ملک کے کسی بھی حکمران کے پاس فوجی کاروائی کی اجارہ داری نہیں تھی۔ اصولاً وہ اپنے لوگوں کو محدود مدت کے لئے بھی طلب کر سکتا تھا جو ابتدا میں تین ماہ تھی اور بعد میں چالیس دن پر محیط ہوتی تھی۔ چھوٹی ملکیتوں والے تو بیس دن، دس دن یا اس سے بھی کم وقت کے لئے فوجی خدمات کے لئے فارغ کئے جا سکتے تھے۔

اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ رعایا اور اس کے ماتحت بھی اپنی پوری قوت حکمران کے سپرد نہیں کرتے تھے بلکہ یہ لوگ اپنی خدمات جزوی طور پر پیش کرتے۔ یہ جزو بھی اکثر لمبے عرصے تک جنگی مصروفیات میں مشغول رہنے سے احتراز کرتا۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاہ کا پورا کنٹرول صرف اپنے سپاہیوں پر ہوتا تھا۔ اس کی فوجی قوت کا باقی حصہ عارضی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یونٹوں کی شکل میں ہوتا جس کی جنگ کرنے کی صلاحیت ، ساز و سامان کا معیار اور وفاداری سبھی کچھ مشکوک ہوتا تھا۔

شہری حربی سائنس کی تاریخ رقم کرتے ہوئے رچرڈ شیلے ہارٹیگن کہتا ہے، "کوئی بھی یورپی فیوڈل لارڈ جو بیرونی حملے کا شکار ہوتا اپنے نیم فوجی سپاہیوں کو صرف عارضی مدت یعنی حملہ آور کے پسپا ہونے تک فوجی خدمات کے لئے روک سکتا تھا مگر کسی دوسرے پر حملہ کرنے والا حکمران ان لوگوں کو سال میں صرف چالیس دن تک میدان جنگ میں روکنے کا مجاز تھا۔

قدیم چینی اور یونان کے باشندوں کی طرح ان کی بھی کھیتوں میں ضرورت ہوتی تھی۔

تنخواہوں کی عدم ادائیگی:

اس کے علاوہ پہلی لہر کی فوجوں سے متعلق سپاہیوں کی تنخواہ کی ادئیگی میں بے قاعدگی کارفرما تھی اور عام طور سے یہ نقدی کی بجائے جنس کی صورت میں دی جاتی۔ نقد ادائیگیوں کا انتظام اس وقت ویسے بھی ابتدائی شکل میں تھا۔ قدیم چین کی طرح فاتح جرنیلوں کو کبھی کبھی اراضی کی جسے زرعی معیشت میں مرکزی حیثیت حاصل تھی شکل میں ادائیگی کی جاتی۔ فوجی افسران کے سلسلے میں کارکردگی بہرحال عام سپاہیوں کے مقابلے میں بہت بہتر ہوتی تھی۔ مورخ ٹیسی ٹس، رومی فوج کا ذکر کرتے ہوئے ایک سپاہی کی شکایت کا ان الفاظ میں حوالہ دیتا ہے: ''زندگی بھر مار کھانے، بار بار زخمی ہونے، شدید سردیاں برداشت کرنے، طاعون سے پر گرمیاں گزارنے، خوفناک جنگ بھگتنے یا قابل رحم زمانہ امن کا سامنا کرنے کے بعد ''جنگی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے والے فوجی دستے کے کسی معمولی سپاہی کو دلدلی زمین یا پہاڑی پر واقع اراضی کا ایک قطعہ دے دیا جاتا ہے اور بس۔'' ازمنہ وسطیٰ کے سپین اور جنوبی امریکہ میں انیسویں صدی تک جنگ میں حصہ لینے والے سپاہیوں کو نقد رقم کی بجائے زمینی قطعات کے ذریعے ہی ادائیگی کی جاتی تھی۔

لہٰذا پہلی لہر کے فوجی یونٹ اپنے حجم، استعداد، حوصلے، ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت اور تربیت میں ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ بہت سے فوجی دستے زرخرید بھاڑے کے ٹٹوؤں یا باغی کمانڈروں کے زیر کمان خدمات انجام دیتے تھے۔ معیشت اور مواصلات

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے مروجہ نظام کو بھی ابتدائی دور کے روایتی نظام کا نام دینا غلط نہ ہوگا۔ احکامات بھی تحریری طور پر نہیں زیادہ تر زبانی ہی دیئے جاتے تھے۔ فوج، اقتصادیات کی طرح زمین سے غیر متعلق ہوتی گئی۔ زمین سے کام لینے والے اوزاروں کی طرح اس زمانے کے ہتھیار بھی غیر معیاری ہوتے تھے۔ زرعی شعبے میں ہاتھ سے کام کرنے والے جنگوں میں بھی دست بدست حصہ لیتے تھے۔ اس دور کے مروجہ ہتھیاروں جیسیگو پھن، تیر کمان، منجنیق اور ابتدائی شکل کے توپ کے گولوں کے محدود استعمال کے باوجود ہزاروں برس تک جنگیں آمنے سامنے کی لڑائی میں ایک دوسرے کو مارنے کی شکل میں جاری رہیں اور سپاہیوں کو جن ہتھیاروں سے مسلح کیا جاتا تھا وہ تھے بلّمے تلواریں، ہتھوڑے اور پھالے وغیرہ ، ان کے استعمال میں کامیابی کا انحصار استعمال کرنے والے کے زور بازو پر ہوتا اور یہ آمنے سامنے اور قریب سے ایک دوسرے پر وار کرنے کی ضرورت کے تحت تیار کئے جاتے تھے۔

بیوریکس کی مشہور منقش ٹپسٹری پر فاتح ولیم کو ایک ڈنڈا ویلڈ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور170-1650 عیسوی کے زمانے تک سینئر فوجی کمانڈروں سے دست بدست لڑائی میں حصہ لے کر دشمن کو ہلاک کرنے کی توقع کی جاتی تھی۔ مورخ مارٹن دان کر یولڈ کہتا ہے کہ فریڈرک اعظم غالباً پہلا کمانڈر انچیف تھا جسے فوجی وردی کے بجائے باقاعدگی کے ساتھ سوتی کپڑے کا سوٹ پہنے دکھایا جاتا رہا۔

وٹ فوجل جن معاشروں کو پانی کی ''حربی قوت'' پر مبنی معاشرے قرار دیتا ہے ان میں اقتصادی اور فوجی حالات مختلف ہو سکتے ہیں لیکن یہی وہ معاشرے ہیں جہاں آبپاشی کے بڑے بڑے منصوبوں کے لئے انسانی محنت کو بڑے پیمانے پر بروئے کار لانے، نوکر شاہی کی ابتدائی شکل کو وجود میں لانے اور زیادہ رسمی اور مستقل نوعیت کی فوجی اسٹیبلشمنٹ کے قیام کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس کے باوجود اصل جنگ بدستور زیادہ تر دست بدست لڑائیوں کے طریقوں تک محدود رہی۔

مختصراً صورت یہ بنی کہ پہلی لہر کے دور کی لڑائیوں پر اس لہر کی اقتصادیات کی وہ مہر نصب تھی جس نے ان کو صرف ٹیکنالوجی کی اصطلاح ہی میں آگے نہیں بڑھایا بلکہ تنظیمی معاملات، مواصلات، نقل وحرکت، ایڈمنسٹریشن، لیڈرشپ کے طریقوں اور ثقافتی مفروضوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے شعبوں میں بھی ترقی سے ہمکنار کیا۔

زراعت کی ایجاد کے ساتھ ہی دولت آفرینی کے نظام میں ہر انقلاب نے اس سے مطابقت رکھنے والے کسی بھی انقلاب کے سسٹم کے لئے جنگ کو ضروری قرار دیا۔

دوسری لہر کی جنگ:

صنعتی انقلاب نے تاریخی تبدیلی کے عمل کا آغاز کر دیا۔ اس لہر نے لاکھوں افراد کے زندگی کرنے کے طورطریقے بدل دیئے۔ جنگ ایک بار پھر دولت آفرینی اور کام کے طریقوں میں تبدیلی کی صورت میں منعکس نظر آئی۔

صنعتی اقتصادیات کا کلیدی اصول جس طرح بڑے پیمانے پر پیداوار تھا۔ اس طرح صنعتی عہد کی حربی سائنس کا اصول وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانا ٹھہرا۔ دوسری لہر کی جنگوں پر اس اصول نے اپنی مہر تصدیق ثبت کی۔

سولھویں صدی کے آخری زمانے میں جب برطانیہ کی کوئلے کی کانوں سے پانی کے اخراج کے لئے بھاپ کے انجن سے کام لینے کا آغاز ہوا، جب نیوٹن نے سائنس کی شکل بدل دی اور جب ڈیسکروٹ نے فلسفیانہ نکات ازسرنو تحریر کرنا شروع کئے۔ جب مغرب میں وسیع پیمانے پر وجود میں آنے والی صنعتی پیداار نے اس زراعت کی جگہ لے لی جو کسانوں کی محنت اور کوشش کی رہین منت تھی تو جنگ کے معاملہ نے بھی تدریجی طور پر صنعت کی شکل اختیار کر لی۔

بڑے پیمانے پر صنعتی پیداوار نے جنگ کے عمل میں بڑے پیمانے پر جبری بھرتی کی راہ ہموار کی۔ اب ایسی بڑی فوجیں وجود میں آ گئیں جن کو معاوضہ مقامی زمیندار یا قبیلے کے سربراہ اور کسی جنگجو سردار سے نہیں بلکہ جدید قومی ریاست سے ملتا تھا۔ جبری بھرتی کا طریقہ نیا نہیں تھا، لیکن ایک پوری قوم کو مسلح کرنے کا تصور انقلاب فرانس کی دین تھا۔ زرعی نظام کے بحران کی عمومی نشان دہی کرتے ہوئے اس نے جدید بورژوازی کے عروج کی راہ ہموار کی۔

مورخ آر آر پامر کے بیان کے مطابق 1792ء کے بعد آنے والی اختراعات کی ایک لہر نے ”جنگ کے طریقوں میں بھی انقلابی تبدیلیوں کے دروازے کھول دیئے جن کے نتیجے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں پرانے زمانے کی محدود جنگوں کی جگہ نئے دور کی غیرمحدودلڑائیوں کا آغاز ہوا۔ انقلاب فرانس سے قبل کی جنگیں عام طور سے شخصی حکمرانوں کے درمیان تصادم کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ اس کے بعد سے جنگوں نے قوموں کے درمیان بڑھتے ہوئے تصادمات کی شکل اختیار کرلی۔ ان لڑائیوں نے آہستہ آہستہ جبری بھرتی کی مدد سے تیار کی جانے والی فوجوں کے درمیان تصادم کی صورت اختیار کر لی۔

سنگین اور کپاس کی جنگ:

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اس خانہ جنگی کے دوران، جس میں صنعتی عہد کی طرف رواں دواں شمال نے زرعی جنوب کو شکست دی تھی۔1862-63ء میں(دونوں فریقوں کی طرف سے) جبری بھرتی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس طرح جاپان میں جو وہاں سے آدھی دنیا کے فاصلے پر تھا، اس سے کچھ ہی عرصہ بعد1868ء میں جبری بھرتی کے طریقوں پر اس وقت عمل شروع ہوا جب وہاں میجی انقلاب کی وجہ سے ملک کا سفر صنعتی عہد کی طرف شروع ہوا۔ وہاں بھی اب جاگیردارانہ زمانے کے روایتی جنگجوؤں کی جگہ جبری طور پر بھرتی کئے ہوئے سپاہیوں نے لے لی۔ اب ہر جنگ کے بعد جونہی کشیدگی کم ہوتی اور بجٹ میں کمی کی ضرورت محسوس کی جاتی،فوجیں ایک دفعہ پھر رضاکاروں میں تبدیل ہو جاتیں۔ البتہ بحران کے وقت وسیع پیمانے پر جبری بھرتی معمول کی بات تھی۔

جنگ کے طریقوں میں بہت بڑے پیمانے پر ہونے والی یہ ڈرامائی تبدیلیاں معیاری ہتھیاروں کی جو بڑے پیمانے پر حاصل ہونے والی صنعتی پیداواری صلاحیت کی وجہ سے تیار ہو رہے تھے، کی وجہ سے بھی سامنے آئیں۔1798ء تک نئے امریکہ میں کپاس کی جننگ کے طریقے کا موجد ایلی وٹنی حکومت سے ہتھیار رکھنے کے ایسے دس سے پندرہ ہزار سٹینڈ تیار کرنے کے ٹھیکے کا طلب گار تھا جس میں سے ہر ایک میں ایک توڑے دار بندوق، ایک سنگین، بندوق صاف کرنے کا ایک گز، صفائی کا دیگر سامان اور پیچ کس وغیرہ رکھنے کی گنجائش ہوتی۔ اس طرح وٹنی نے کارتوسوں کے ڈبے، پستول اور دوسری متعلقہ اشیاء کی مشین سے تیاری کی پیش کش بھی کی اور مشین ہی سے چیزوں کوٹھونکنے، رول کرنے، بور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرنے، گرائنڈ کرنے اور پالش کرنے کے طریقے متعارف کرانے کی بات بھی کی۔

یہ اس زمانے کے حساب سے عجیب وغریب قسم کی پیش کش تھی۔ مورخ چینٹ رسکی اور ایلن نیونز لکھتے ہیں: ''اسلحے کے لئے دس سے پندرہ ہزار سٹینڈ تیار کرنے کا معاملہ اتنا ہی عجیب وغریب اور ناممکن الحصول نظر آتا ہے جتنا کہ ہوا بازی کا معاملہ کٹی ہاک سے قبل دکھائی دیتا تھا۔''

جنگ کی اس صورت حال نے صنعتی عمل کو بھی تیز تر کیا اور یہ تیزی مثال کے طور پر پرزوں کے باہمی تبادلے کا اصول نافذ ہونے کی وجہ سے آئی۔ اس بنیادی صنعتی ایجاد کا استعمال فوراً ہی شروع ہوگیا اور ہر طریقے سے یعنی دستی بندوق سے لے کر بحری جنگی جہازوں میں استعمال ہونے والی چرخی تک، صنعتی عہد سے پہلے کے جاپان میں بھی ابتدائی زمانے کی بعض قدیم مشینیں ہتھیاروں کی تیاری کا کام دیتی تھیں۔

صنعت کے دوسرے کلیدی اصول یعنی مصنوعات کا معیار مقرر کرنے کی ضرورت پر بھی جلد ہی عمل شروع ہوگیا اور یہ محض ہتھیاروں کی تیاری تک محدود نہیں تھا بلکہ فوجی تربیت، تنظیم اور نظریہ سازی کے شعبوں میں بھی اس اصول کو اپنایا گیا۔

صنعتی تبدیلیوں کے نتیجے میں تبدیل ہونے والے جنگ کے طریقے، ٹیکنالوجی کو پیچھے چھوڑ گئے۔ ڈھیلی ڈھالی عارضی فوجوں کی جگہ جن کی رہنمائی کا فریضہ اشرافیہ انجام دیتی تھی، ایسی پیشہ ورانہ فوجوں نے لے لی جن سے اکیڈمیوں کے تربیت یافتہ افسر کام لیتے تھے۔ فرانسیسیوں نے ایسا سسٹم نافذ کیا جو سینئر کمان کے لئے مقررہ افسران کی خصوصی تربیت کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ جاپان نے 1875ء میں فرانسیسی سسٹم کے مطالعہ کے بعد اپنی فوجی اکیڈمی قائم کی۔ امریکہ نے 1881ء میں فورٹ لیون ورتھ کے مقام پر پیدل اور گھڑسوار دستوں کی تیاری کے لئے اپنا سکول قائم کیا۔

یاددہانیوں کی بھرمار:

فوج کی متعدد نئی اور خصوصی شاخوں کے عروج کے بعد یہاں بھی صنعتی شعبے کی طرح محنت کی تقسیم عمل میں لائی گئی۔ فوجی حلقوں میں بھی تجارت کے میدان کی طرح نوکرشاہی کا عمل دخل بڑھا۔ فوجوں نے جنرل سٹاف کے ادارے کو ترقی دی۔ زبانی احکامات کی جگہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تحریری ہدایات نے لے لی۔ تجارتی شعبے کی طرح تحریری یاددہانیوں نے، میدان جنگ میں بھی یکساں طور سے اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا۔

صنعتی قسم کی حقیقت پسندی ہر جگہ کارفرما نظر آنے لگی۔ رِیون اور سوسی ہیریز نے اپنی کتاب ''سولجرز آف سنڈ'' میں جاپان کی شاہی فوج کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''1880ء کے عشرے میں فوج نے ایک ایسا پیشہ ورانہ ادارہ تیار کر کے اسے محفوظ حیثیت سے جما دیا جو خفیہ اطلاعات کی فراہمی ، پالیسیوں کی تشکیل، منصوبہ بندی کرنے، فوجی کاروائیوں کی نگرانی، فوجی بھرتی، ان کی تربیت، فوجوں کو ضروری اسلحہ سے لیس کرنے ، ان کی نقل وحرکت کا انتظام کرنے اور ایک جدید فوج کا انتظام سنبھالنے کی اہلیت سے مالا مال تھا۔

مشینی عہد نے مشین گن، میکانکی جنگی طریقوں اورہتھیاروں کے بالکل نئے اور اختراعی استعمال کا راستہ ہموار کیا، جس سے جیسا کہ ہم پر عیاں ہے، نئے قسم کے داؤ پیچ سے کام لینے کا آغاز ہوا۔ صنعتی ترقی کی وجہ سے بہتر شاہراہوں، بندرگاہوں، توانائی کے بہتر ذریعوں اور بہتر مواصلات کا نظام دیکھنے میں آیا۔ اس وجہ سے جدید قومی ریاست کو ٹیکسوں کے حصول میں بہتر اور موثر طریقے میسر آئے۔ ترقی اور بہتری کی ان تمام صورتوں کے نتیجے میں فوجی کاروائیوں کے بھی بڑے پیمانے پر وسعت اختیار کرنے کے امکانات پیدا ہوگئے۔

دوسری لہر جیسے جیسے معاشرے میں جگہ بناتی گئی، پہلی لہر کے ادارے ختم ہوتے اور نظروں سے اوجھل ہوتے گئے اور ایک ایسا نیا سماجی نظام وجود میں آ گیا جس نے پیداوار، تعلیم، مواصلات، مصنوعات کی کھپت اور تفریح کے وسیع مواقع کی فراہمی کے ساتھ تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی وسیع پیمانے پر تیاری کی ذمہ داری بھی سنبھال لی۔

اسمبلی لائن میں مدت:

امریکہ نے دوسری جنگ عظیم میں اپنی صنعتی بنیاد پر پورا اعتماد رکھتے ہوئے نہ صرف ڈیڑھ کروڑ افراد ہی اس میں حصہ لینے کے لئے محاذ پر بھیجے بلکہ تقریباً ساٹھ لاکھ رائفلیں اور مشین گنیں، تین لاکھ جنگی طیارے، ایک لاکھ ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں، اکہتر ہزار بحری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بیڑے اور بارود کی 41 ارب گولیاں بھی جنگی مقاصد کے لئے تیار کیں۔

صنعتی دور میں جنگ کے ہولناک امکانات بھی دوسری جنگ عظیم کے دوران ظاہر ہوگئے۔ نازیوں نے ساٹھ لاکھ یہودیوں کو کارخانوں کی کارکردگی کے طریقوں پر عمل کرتے ہوئے تہہ تیغ کیا اور موت کو بھی پرزوں کے جوڑ توڑ سے تیار کی جانے والی مصنوعات کی شکل دے دی۔ خود یہ جنگ تمام متحارب ملکوں کے ڈیڑھ کروڑ فوجیوں کو کھا گئی اور شہری اس سے دگنی تعداد سے اس کی وجہ سے لقمہ اجل بنے۔ اس طرح ہیروشیما اور ناگاسا کی شہروں کی ایٹم بم سے ہونے والی تباہی سے پہلے ہی جنگ ہلاکت آفرینی کی انتہائی وسیع دور پر پہنچ چکی تھی۔ مثال کے طور پر 9 مارچ 1945ء کو امریکہ کے 334 بمبار طیاروں نے ٹوکیو پر حملہ کیا اور اس ایک حملے کے نتیجے میں 267171 عمارتیں تباہ اور 84000 شہری ہلاک ہوگئے (زخمی ہونے والے چالیس ہزار افراد اس کے علاوہ تھے)۔ شہر کا سولہ مربع میل علاقہ کلیتاً تباہ ہوگیا تھا۔

بڑے پیمانے پر ہونے والے فضائی حملوں نے انگلستان میں کووینٹری اور جرمنی میں ڈریسڈن کے علاقوں کو بھی نشانہ بنایا۔ پورے یورپ میں آبادی کے بڑے بڑے مراکز ان حملوں کی زد میں آئے۔ سن زد کے خیالات کے برعکس جن میں وہ کہتا ہے کہ کامیاب جرنیل وہ ہے جو لڑائی کے بغیر یا کم سے کم نقصان اٹھانے کی قیمت پر اپنے مقاصد حاصل کر لیتا ہے۔ موجودہ جنگی داؤ پیچ والوں کا جد اعلیٰ کارل دان کازوٹز (1780-1831) بالکل نیا سبق پڑھاتا ہے۔ اگرچہ بعد کی تحریروں میں اس نے بہت سے نازک اور متضاد نکتے بھی بیان کئے ہیں اس کا اصل مقدمہ یہی ہے کہ ''جنگ تشدد کی کاروائی ہے جسے آخری حدوں تک لے جایا جاتا ہے۔''، صنعتی عہد کی جنگوں کو اس مقولے میں منعکس دیکھا جا سکتا ہے۔

بھرپور (جنگ) سے آگے:

کلازوٹز نے ''کامل جنگ''، لکھی، بعد میں آنے والے نظریہ سازوں کو یہ مکمل محسوس نہیں ہوئی۔ یوں پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمن جرنیل ایرک ٹون ڈارف نے ''کامل جنگ'' کے تصور کو مزید وسعت دیتے ہوئے کلازوٹز کو سر کے بل کھڑا کر دیا۔ کلازوٹز جنگ کو سیاست کی توسیع اور فوج کو سیاسی پالیسی کا ہتھیار قرار دیتا ہے۔ لوبان ڈاف کا نکتہ نظر یہ تھا کہ جنگی مقاصد کی تکمیل کے لئے سیاسی نظام کا فوج کے تحت لانا لازم ہے۔ نازی نظریہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سازوں نے موؤن ڈاف کے مکمل جنگ کے نظریہ کو مزید وسیع کرتے ہوئے امن کی حقیقت کو بالکل غیرضروری قرار دیا۔ان کا اصرار تھا کہ زمانہ امن تو محض جنگی تیاریوں کے لئے درکار ہوتا ہے،''جنگوں کے درمیان جنگ کیلئے''۔

وسیع معنوں میں دیکھا جائے تو مکمل جنگ اقتصادی، ثقافتی، پروپیگنڈے کی سطح پر اور پورے معاشرے کو ایک اکائی کے طور پر جنگی مشین میں بدلنے ہی سے لڑی جا سکتی ہے۔ یہ اصل میں صنعتی قسم کی حقیقت پسندی کا اظہار ہے جسے آخری حدوں تک لے جایا جا رہا تھا۔

ایسے نظریوں کی فوجی تشریح کا مطلب تباہی کو آخری حدوں تک پہنچانا ہی ہو سکتا ہے، جس طرح کہ لی ایچ ٹراورٹ نے اپنی تاریخ ''سٹریٹیجک'' سوچ میں لکھا ہے۔فوجی سوچ کا محور ایک صدی سے بھی زائد عرصے تک یہ رہا ہے کہ میدان جنگ میں دشمن کی افرادی تباہی ہی جنگ کا اصل منشا ہونا چاہیے۔ اس اصول کو سبھی تسلیم کرتے تھے۔فوجی منشوروں میں بھی یہی کچھ درج تھا اور سٹاف کالجوں میں بھی اس کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن انیسویں صدی کے قبل کے کمانڈروں اور جنگی اصولوں کے اساتذہ کے لئے بظاہر یہ مکمل قسم کا قاعدہ یقیناً حیرت کا باعث ہوتا۔

لیکن یہ زمانے صنعتی عہد سے پہلے کے تھے،مکمل جنگ اور وسیع پیمانے پر تباہی کا تصور تو صنعتی انقلاب کے بعد اختیار کیا گیا کیونکہ یہ بڑے معاشرے یعنی دوسری لہر کی تہذیب سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔

مکمل جنگ کا نظریہ عملاً فوجی اور شہری اہداف میں کسی قسم کے امتیاز کی گنجائش نہیں چھوڑتا، کیونکہ مکمل جنگ ہر چیز کا احاطہ کر لیتی ہے اور اس میں ہتھیاروں سے لے کر کارکنوں کے گھروں تک اور اسلحے کے ڈپوؤں سے لے کر چھپائی کی مشینوں تک سبھی کچھ جائز اہداف سمجھے جاتے ہیں۔

ٹوکیو پر حملہ کرنے والے طیاروں کا کمانڈر اور بعد میں امریکہ کی سٹریٹیجک فضائی فوج کا چیف کرٹس لی مے جنگ میں وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے کے نظریے کا زبردست مبلغ تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ جنگ شروع ہو جاتی ہے تو پھر اہداف کے تعیّن میں امتیاز برتنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ ہی کسی ایسی ٹیکنالوجی کے بارے میں سوچنا سودمند ہو سکتا ہے جو اہداف کے تعین میں مددگار ہو سکتی ہیں۔فریڈ کپلن ''وزوڈز آف آرماجیڈون'' میں رقم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طراز ہے: ''لی مے کے نزدیک ہر شئے کی مکمل بربادی ہی جنگ جیتنے کا ذریعہ تھی۔'' اہم مقامات پر بمباری کا اہم ترین مقصد اس کی شدت اور وسیع پیمانے پر پھیلائی جانے والی تباہی کے سوا کچھ نہ تھا۔ یاد رہے کہ یہی لی جے امریکہ کے ایٹمی بمباروں کا نگران اور منتظم تھا۔

ساٹھ کے عشرے میں جب جرمنی میں سوویت یونین اور نیٹو کی افواج آمنے سامنے کھڑی تھیں، میدان جنگ میں استعمال ہونے والے ''چھوٹے'' ایٹمی ہتھیار سپر طاقتوں کے اسلحہ کے ذخائر میں شامل کر لئے گئے اور جنگ کے تصوری خلاصوں میں ان کے استعمال، ترتیب اور ایٹمی اور کیمیائی قالین کی طرف صف بند ٹینکوں کی روانگی پچھتاوے کی اس امکانی جنگ کا نمایاں پہلو تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد شروع ہونے والی سرد جنگ کے پورے زمانے میں وسیع پیمانے پر تباہ کاری اور ایٹمی ہتھیاروں کی تباہی کا خوف ہی بلاشبہ دونوں سپر طاقتوں پر غالب رہا۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جب صنعتی تہذیب بام عروج پر پہنچی تو فوجی نظریات کے مطابق جس طرح اقتصادی شعبے میں وسیع پیداواری صلاحیت بڑھی اسی طرح جنگی شعبہ میں وسیع پیمانے پر ہلاکت آفرینی کی ضرورت کے تصور نے جڑ پکڑ لی۔ یہ وسیع صنعتی پیداواری صلاحیت کا جنگی مثنیٰ تھا۔

بہرحال1970ء کے آخری اور1980ء کے عشرے کے ابتدائی برسوں میں جیسے ہی تیسری لہر کی ٹیکنالوجی، خیالات اور نئے سماجی طریقوں اور قوتوں نے دوسری لہر کے بڑے معاشروں کو چیلنج کرنا شروع کیا تو اس کے ساتھ تازہ ہوا کے جھونکے بھی محسوس ہونے لگے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے کہیں امریکی افواج اور کانگرس میں غور وفکر کرنے والے ایک چھوٹے سے گروپ پر یہ حقیقت آشکار ہو رہی تھی کہ امریکہ کے فوجی نظریات میں کوئی بنیادی خرابی موجود ہے۔ ہتھیاروں کی مار کرنے کی حد بڑھانے اور ہلاکت آفرینی میں اضافے کی دوڑ، عملی طور پر پہلے ہی اپنی آخری حد تک پہنچ چکی ہے۔ نیز یہ کہ سوویت یونین کی طاقت کے خلاف جدوجہد نے ایٹمی جنگ کی تیاری اور باہمی یقینی تباہ کاری کے لئے غیر دانش مندانہ دھمکیوں کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا سویت یونین کی جارحیت کے خاتمے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے لئے ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کے بغیر کوئی دوسرا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے؟

جدید جنگ کی ترقی، صنعتی عہد کی جنگی صلاحیت، تضاد کی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ اس وقت فوجی سوچ میں ایک صحیح اور سچے انقلاب کی آمیزش ضروری تھی۔ ایسا انقلاب جو تبدیلی کی تیسری لہر کے نتیجے ہیں، نئی اقتصادی اور نئی قوتوں کا عکس ہوتا۔

فضائی زمینی جنگ:

ڈون سٹیری طویل القامت اور تہ دار قسم کا آدمی ہے۔ بال اس کے سفید ہو چکے ہیں اور آنکھوں کا رنگ بھی سفیدی مائل ہے جن پر وہ لوہے کے فریم والا چشمہ لگائے رکھتا ہے۔ بات چیت کے دوران میں اس کا لب ولہجہ تحکمانہ ہوتا ہے۔ کولوریڈو کی الگ تھلگ پہاڑیوں میں واقع، موسم گرما کی اپنی رہائش گاہ میں دستی طور پر لکڑی کا کام خود کرنے اور اسے پینٹ کرنے میں اسے بہت مزہ آتا ہے۔ یہاں اس نے اپنی لائبریری کی چار ہزار کتابوں کی فہرست بڑے سلیقے سے تیار کر رکھی ہے۔ وہ اور لیٹی اس کی بیوی سال میں ایک بار کینیڈا کا سفر ضرور کرتے ہیں جہاں وہ سٹیڈفورڈ کے شیکسپئر میلے کی تقریبات میں شرکت کرتے ہیں۔ وہ بظاہر کسی یونیورسٹی کا صدر نظر آتا ہے۔ حقیقتاً کچھ وقت کے لئے وہ صدر رہا بھی ہے، اگر چہ یہ کوئی روایتی قسم کی یونیورسٹی نہیں تھی۔

سٹیری نے اس دانشورانہ مشق کی رہنمائی کی جس نے امریکی افواج کو پست ہمتی کے بلیک ہول سے جہاں وہ ویت نام کی جنگ میں پھنس گئی تھی، باہر نکال کر انہیں خلیج کی جنگ میں نہایت موثر کردار ادا کرنے کے قابل بنایا۔ اس نے ایک ایسے ادارے کی تشکیل نو کرنے میں مدد دی جس کا شمار دنیا کے چند اہم اور مستحکم ترین بیوروکریٹک اداروں میں ہوتا تھا۔ یہ ایسا کام تھا کہ صنعتی شعبوں کے بیشتر سربراہ اس قسم کے مگر اس سے بہت کم پیچیدگی کی شکار تنظیموں میں مکمل کرانے میں کم ہی کامیابی سے ہمکنار ہوئے ہیں۔

حقیقتاً سٹیری کا جس سے بیرونی دنیا بالکل ناواقف تھی سایہ خلیج کی جنگ کے دوران عراق کے ڈکٹیٹر صدام حسین کے سر پر مسلسل لہراتا رہا کیونکہ جیسا کہ ہم شروع میں بیان کر چکے ہیں، یہ ڈون سٹیری اور ڈان موریلی ہی تھے جنہوں نے خلیج کی جنگ سے ایک دہائی قبل تیسری لہر کی جنگی حکمت عملی کے بارے میں غور وفکر کرنا شروع کیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سٹیری کا بچپن1930ء کے عشرے کی کساد بازاری کے زمانے میں گزرا۔ کچھ وقت اس نے فرنیچر کے ایک سٹور میں کام کیا اور کچھ عرصے کے لئے کنساس کے سخت کوش زرعی فارموں پر مشتمل علاقے میں ایک اخبار سے منسلک رہا،لیکن ساتھ ہی ساتھ کنساس کے نیشنل گارڈز میں افسری بھی کرتا رہا اور اپنے اسی گھر میں اس نے اختتام ہفتہ کے جنگجوؤں میں پسندیدہ فرد کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

1943ء کے زمانے میں جب دوسری جنگ عظیم کے شعلے کرہ ارض پر پوری طرح بھڑک رہے تھے اور ڈون جنگ میں حصہ لینے کو بیتاب تھا، آخرکار امریکی فوج میں بھرتی ہوگیا،مگر فوج میں شمولیت کے ساتھ ہی ایک باشعور فرسٹ سارجنٹ نے اس کومختلف قسم کے کام پر لگا دیا۔ وہ سٹیری کو کتابوں کے ایک ڈھیر کی طرف لے گیا جن کا انتخاب خود اس نے کیا تھا اور اسے بتایا کہ وہ اپنے آپ کو تین ہفتوں کیلئے ایک کمرے میں بند کر کے ان کتابوں کا مطالعہ مکمل کر لے۔ اس نے کہا: ''سٹیری!تم ویسٹ پوائنٹ کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہو رہے ہو۔'' سٹیری نے جب اس پر احتجاج کیا کہ وہ محاذ جنگ پر خدمات انجام دینے کا خواہش مند ہے تو سارجنٹ نے کہا: ''میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں یہ جنگ ہمیشہ جاری نہیں رہے گی۔ میں پہلی جنگ عظیم کے زمانے سے فوج میں ہوں اور جانتا ہوں کہ فوج کو ہمیشہ اچھے افسروں کی ضرورت رہتی ہیں۔ اس موجودہ صورت میں تم یہ مقام حاصل نہیں کر سکو گے اورمعمولی قسم کے پرائیویٹ (سپاہی) رہو گے مگر میں تمہیں اس سے اوپر پڑھائی کرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

جس وقت سٹیری نے فوجی اکیڈمی سے سیکنڈ لیفٹیننٹ کے طور پر گریجویشن کا مرحلہ طے کیا، اس وقت1948ء کا زمانہ تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی اور وہ ایسی فوج کا افسر تھا جس کے جوانوں اور افسروں کوفوجی خدمات سے سبکدوش کیا جا رہا تھا۔مگر سٹیری معمول کے مطابق ترقی کی منازل طے کرتا رہا۔ پلاٹون لیڈر اور کمپنی کمانڈر سے بٹالین سٹاف افسر کے عہدے تک، اسلحے کے متعلق اس کی مہارت تسلیم شدہ حقیقت تھی۔ پچاس کے عشرے میں کوریا کی جنگ میں وہ آٹھویں فوج کے عملے میں خفیہ معلومات اکٹھی کرنے کی خدمات انجام دینے پر مامور رہا۔ ویت نام کی جنگ میں امریکی کاروائیوں میں جب ساٹھ کی دہائی میں برابر توسیع ہوتی گئی تو سٹیری نے وہاں ایک ایسی فوجی ٹیم کے رکن کی حیثیت میں کام کیا جومشینی اور بکتر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بند یونٹوں اوران کے استعمال کے بارے میں تجزیے کرنے کی اہم ذمہ داریاں پوری کر رہی تھی۔

بعدازاں1970ء میں کمبوڈیا میں امریکی مداخلت کے زمانے میں سٹیری نے ایک کرنل کی حیثیت میں معروف گیارہویں گھڑسوار رجمنٹ کی کمان کی ذمہ داریاں نبھائیں۔ وہیں منول کی فضائی سٹرپ کے نزدیک ایک مقابلے میں وہ شمالی ویت ناموں کے ایک دستی بم سے زخمی ہوا۔

ویت نام میں امریکہ کی ہزیمت بار روز میں جنگ سے واپس آنے والے فوجیوں کے بارے میں عام لوگوں کا استہزائیہ رویہ شدید غصے میں تقسیم شدہ ملک کے احساسات کا اظہار تھا اور جو اکثر فوجی حکام اور سپاہیوں کی شدید مایوسی کا سبب بنا۔فوجی قیادت ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے اور فوجیوں پر منشیات کے استعمال، کرپشن اور شہری آبادیوں پر مظالم ڈھانے وغیرہ کے الزامات عائد کئے جا رہے تھے۔قومی ہیروؤں کی شکل میں جنگ میں حصہ لینے والوں کو اب بچوں کے قاتال ٹھہرایا جا رہا تھا اور ایسے سوالات سننے میں آ رہے تھے کہ فنی طور پر دنیا کی انتہائی ترقی یافتہ اور وہ فوج جس نے شمالی ویت نام کے بہت سے معرکوں میں فتح بھی اصل کی۔آخر تیسری دنیا کی ایک اشترا کی قوم کے نیم ملبوس اور نیم مسلح فوجیوں سے ایسی ذلت آمیز شکست کی شکار کیسے اور کیوں کر ہوئی؟

جنگل کی چوٹ:

امریکی فوج کی تنظیم بھی جنرل موٹرز یا آئی بی ایم کی طرح دودسری لہر کے مروجہ خطوط پر ہوئی تھی۔ ان کارپوریشنوں کی طرح فوج کی بڑے پیانے پر ہونے والی کاروائیاں بھی ادھر سے ملنے والی ہدایات پر توجہ سے عمل کرنے تک محدود تھیں (ویت نام کی جنگ بھی خود وہائٹ ہاؤس کی زیرہدایت لڑی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات فضائی بمباری کیلئے اہداف کا تعین بھی صدر امریکہ خود کرتا تھا)۔فوج اپنی ہی نوکر شاہی کی سخت گرفت میں تھی۔ کچھ فوجی شعبوں میں باہمی اختلافات بھی واضح طور پر موجود تھے، تاہم اس فوج کی کارکردگی اس وقت قابل رشک تھی جب شمالی ویت نامیوں نے دوسری لہر کی مروجہ کاروائیوں کے مطابق بڑے پیانے پر حملے کئے، مگر یہ فوج چھوٹے پیانے پر ہونے والی گوریلا کاروائیوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کا......جو پہلی لہر کے زمانے کی جنگل کی لڑائیوں کی یادگار تھیں، مقابلہ کرنے میں بری طرح ناکام رہی۔

سٹیری جس کو ''ویت نام میں فوج کا قابل رحم تجربہ'' قرار دیتا ہے اس کا بہرحال ایک مثبت پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اس کی وجہ سے فوج کو اپنی کارکردگی کا جائزہ لینے، خودتنقیدی اور تجزیوں سے کام لینے کی جس شدت سے ضرورت محسوس ہوئی وہ بڑی بڑی کارپوریشنوں کی کارکردگی پر غور کرنے سے کہیں زیادہ گہری اور ایماندارانہ تھی۔ سٹیری کے قول کے مطابق ویت نام کی چوٹ ''ہر شخص کے ذہن پر اس بری طرح ثبت ہو چکی تھی کہ اس بارے میں کوئی بھی مختلف قسم کی تجویز سب کے لئے قابل قبول ہوتی۔''

یورپ میں اس وقت کے فوجی توزان پر غور کیا جاتا تو بحران زیادہ شدید صورت میں سامنے آ جاتا، کیونکہ جب امریکہ ویت نام کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا، سوویت یونین نے رواں دہائی اپنے ٹینکوں اور میزائلوں کو جدید شکل دینے کے کام میں صرف کی۔ اس کے ساتھ ہی اپنی نظریاتی سرگرمیوں کو فروغ دیا اور یورپ میں اپنی افرادی قوت کو تقویت بخشی۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ اگر امریکی افواج شمالی ویت نامیوں کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہی تھی تو اس کے پاس روس کی سرخ افواج کا مقابلہ کرنے کے مواقع کہاں تک تھے؟

بین الاقوامی زندگی پر ابھی سرد جنگ کا رنگ غالب تھا، جس وقت امریکہ کو اس ذلت آمیز شکست کا سامنا تھا۔ اس وقت تک سوویت یونین کا شیرازہ منتشر ہونے کے کوئی آثار سامنے نہیں آئے تھے۔ ماسکو میں برزنیف اور کمیونسٹ پارٹی اقتدار کے سنگھاسن پر براجمان تھے اور روسی افواج کی حیثیت وہی نظر آتی تھی جو کسی کھلے بندوں اچھلتے کودتے سات سو پاؤنڈ کے گوریلے کی ہو سکتی تھی۔

بوتل میں جن کو بند کرنا:

سوویت یونین اور مشرقی بلاک کی افواج کی تعداد چونکہ اتنی زیادہ تھی اور ان کے ٹینکوں کی تعداد کے مقابلے میں مغرب کے پاس ٹینک اتنے کم تھے، اس لئے نیٹو کے منصوبہ ساز یہ سوچنے میں حق بجانب تھے کہ مغربی یورپ پر سوویت یونین کے حملے کی صورت میں اپنی کم افواج اور اسلحہ کی کمی کی وجہ سے سوائے ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کے اس حملے کے مقابلے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی دوسری صورت موجود ہی نہیں ہے۔ چنانچہ نیٹو نے سوویت یونین کے ابتدائی حملے کے مقابلے کے لئے جرمنی کے تحفظ کا جو منظر نامہ تیار کر رکھا تھا، اس میں حملے کے تین سے دس روز کے اندر اندر ایٹمی ہتھیاروں سے کام لینے کا فیصلہ شامل تھا، مگر سوال یہ تھا کہ ایٹمی ہتھیار استعمال کئے گئے تو یہ ہتھیار خود مغربی رمنی کے، جس کا تحفظ نیٹو کی ذمہ داری تھی، غالب حصے کو بری طرح تباہ کر دیں گے۔اس کے علاوہ تھوڑے فاصلے تک مار کرنے والے خصوصی ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال میں اضافے کی ضرورت محسوس کرنے کے بعد ایٹمی جنگ کے عالمی صورت اختیار کرنے کے ہمہ وقت موجود خطرے نے اس زمانے میں پینٹا گون، برسلز میں واقع نیٹو ہیڈکوارٹر اور ماسکو میں بتیاں جلتی رکھنے کا عمل جاری رکھا (یعنی اس خطرے کے خلاف سبھی چوکس تھے)۔

یہی وہ مخمصہ تھا جس کا سامنا ڈون سٹیری کو1976ء میں تھا اسے اس زمانے میں اسے اسے جرمنی میں متعین، امریکہ کی پانچویں کور کی کمان کے لئے بھیجا گیا تھا۔ پورے یورپ میں یہی اہم ترین اور سب سے پہلے خطرے کی زد میں آنے والا علاقہ تصور کیا جاتا تھا۔ عام خیال تھا کہ جنگ شروع ہوئی تو شہر کاسل کے قریب واقع فلڈا گیپ ہی وہ مقام ہے جہاں روسی فوجیں سب سے پہلے حملہ کریں گی۔ ایٹمی جنگ شروع ہوئی تو اس کا مرکز بھی یہی جگہ ہو سکتی تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ سٹیری نے اچانک محسوس کیا کہ سوویت کے خوفناک حملے کی مدافعت میں وہی مذہب کا ''پوائنٹ مین'' ہوگا۔

سٹیری کی نظر میں بنیادی مسئلہ واضح تھا۔ بے قابو ایٹمی جن کو بوتل سے آزاد کرنے کا موقع کسی کو بھی نہیں دیا جانا چاہیئے۔ اس لئے لازم یہ تھا کہ سوویت یونین کی حد سے بڑھی ہوئی عددی برتری کے باوجود مغرب ایٹمی ہتھیار استعمال کئے بغیر اپنے تحفظ کا کوئی راستہ ڈھونڈے۔ جب وہ کمان سنبھالنے جرمنی پہنچا تو اس کے ذہن میں یہ یقین پختہ ہو چکا تھا کہ غیر ایٹمی ہتھیاروں سے فتح کا حصول ممکن ہے لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے روایتی نظریوں پر انحصار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

تل ابیب کا سفر:

سٹیری کو جس چیز نے اپنی اس رائے پر قائم رہنے کے لئے قائل کیا، وہ تین برس قبل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شروع ہونے والا ایک قلیل المدتی وحشیانہ تصادم تھا۔مغربی جرمنی کی سرحدوں سے مشرق کی طرف دو ہزار میل کے فاصلے پر اسرائیل اور شام کی سرحدی لکیر پر گولان ہائیٹس کے نام سے پہچانی جانے والی معروف خشک پہاڑیوں کے درمیان تاریخ میں ٹینکوں کی ایک عظیم جنگ لڑی گئی تھی۔ یہ اتنی اہم جنگ تھی کہ دنیا بھر میں ٹینکوں پر متعین افسر مدتوں اس کی تفصیل پر غور کرتے رہیں گے۔

یہ لڑائی 6 اکتوبر 1973ء کو یوم کپر کے موقعہ پر اس وقت شروع ہوئی جب شام اور مصر کی فوجوں نے اچانک اسرائیل پر حملہ کر دیا۔ اس سے پہلے 1967ء میں اسرائیلی چھ روزہ جنگ میں عربوں کو اس طرح سبق سکھا چکے تھے کہ انہوں نے عربوں کی پوری فضائی فوج کے طیاروں کو اڑنے سے پہلے زمین پر ہی تباہ کر دیا تھا، لیکن 1973ء تک عرب افواج پوری طرح سے تیار اور بہتر طور پر مسلح ہو چکی تھیں۔ وہ بہتر تربیت حاصل کر چکی تھیں لہٰذا حملہ آور پوری طرح پر اعتماد تھے کہ آخر اس دفعہ تو وہ اسرائیلیوں کو ناکوں چنے چبوانے کی پوزیشن میں ہیں اور کیوں نہ ہوں؟

عرب فوجوں نے شامی فوجوں کی رہنمائی میں شمال سے حملے کا آغاز کیا۔ حملہ آور فوج پانچ ڈویژنوں پر مشتمل تھی جس میں تقریباً 45000 فوجی شامل تھے۔ ان کی مدد کے لئے 1400 سے زائد ٹینک اور ایک ہزار چھوٹی توپیں معہ گولوں کے موجود تھیں اور یہ افواج بمعہ اس سازوسامان کے اسرائیل کی حدوں میں داخل ہو گئیں۔ ان کے جنگی سامان میں سوویت یونین کے بنے ہوئے جدید ساخت کے ٹی 62 قسم کے ٹینک بھی شامل تھے۔ فریقین کے درمیان اسلحہ اور نمایاں عددی امتیاز کے باوجود فتح شام کا نہیں اسرائیل کا مقدر بنی۔

ڈھائی ماہ بعد جنوری 1974ء میں سٹیری اور کچھ دوسرے افسروں کو اپنی تربیت گاہوں میں حاصل شدہ مراعات سے آگاہ کرنے کے لئے انگلستان کی طرف سے دورے کی دعوت ملی۔ سٹیری کی بیوی لیٹی بھی اس دورے میں ساتھ تھی۔ فالتو اوقات میں دونوں میاں بیوی انگلستان کے سیر سپاٹے سے محظوظ ہونے کے مواقع ملنے پر بہت خوش تھے کہ ایک روز سٹیری کے آرمی چیف آف سٹاف جنرل کریگٹن ابراز کا فون آیا۔ اس نے سٹیری سے کہا، کل صبح تمہارے گھر کے دروازے پر ایک افسر معہ ضروری کاغذات کے موجود ہوگا۔ اپنی بیوی کو گھر بھیجو اور خود ایک دوسرے آدمی کو ساتھ لے کر فوراً اسرائیل کے لئے روانہ ہو جاؤ۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اپنی زندگی کا زیادہ وقت ٹینکوں کی لڑائیوں کے بارے میں مطالعہ کرنے اور معلومات حاصل کرنے کے لئے وقف کرنے والے سٹیری نے اس وقت طے کیا کہ وہ اسرائیل جا کر یہ معلوم کرنے کی پوری کوشش کرے گا کہ گولان کی پہاڑیوں میں حقیقتاً کیا ہوا تھا۔

سٹیری نے جلدی اپنے آپ کو تباہ شدہ شامی ٹینکوں کے انباروں میں گھرا ہوا پایا جہاں جگہ جگہ جلے ہوئے ذاتی سامان کے ڈھیر تھے۔ اس نے گولان کے میدان جنگ کے ایک ایک انچ پر قدم جما کر آس پاس کا جائزہ لیا۔ اسرائیلی فوج کی کمان کرنے والے کلیدی کمانڈروں موشے، پی لیڈ۔ آ گڈو کہالانی، ہنسی پی لیڈ اور بٹالین کی سطح کے دوسرے افسروں سے بھی اس نے ملاقاتیں کیں اور اس طرح جنگ کی لمحہ لمحہ کی رپورٹیں حاصل کیں۔

قنیطرہ میں تعجب کا اظہار:

جنگ 6 اکتوبر کی سہ پہر کو ایک بج کر 58 منٹ پر شروع ہوئی۔ اس کے بعد آئندہ چوبیس گھنٹوں میں جنوبی سیکٹر میں موجود 188 ویں بریگیڈ کی تمام افرادی قوت جو 600 ٹینکوں کی مدد سے حملہ کرنے والے دو شامی ڈویژنوں کی زد میں تھی، کلیتاً ختم ہو چکی تھی، اس کے فوجی افسروں میں سے نوے فی صدی ہلاک یا زخمی ہو گئے تھے۔ آگے بڑھتی ہوئی شامی افواج دریائے اردن اور بحرِ گلیلی سے صرف دس منٹ کے فاصلے پر تھیں دفاع کرنے والوں کو بظاہر پوری طرح کچل دیا گیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ حملہ آور شامی فوجوں نے اسرائیل کے ڈویژنل ہیڈکوارٹر کو ملیا میٹ کر دیا ہے۔

اسی دوران گولان کی پہاڑیوں کے نصف شمالی حصے پر شامیوں نے ٹینکوں کی مدد سے اسرائیل کے ساتویں بریگیڈ پر جو سو ٹینکوں کی مدد سے مدافعت کر رہا تھا، حملہ کر دیا۔ وہاں ان کے درمیان چار روز تک گھمسان کا رن پڑا جس میں ساتویں بریگیڈ نے سینکڑوں شامی ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں مکمل طور پر تباہ کر دیں۔ خود اس کے سو ٹینکوں میں سے صرف سات محفوظ رہ سکے تھے۔ اسرائیلیوں کے پاس اس وقت گولہ بارود بھی نہ ہونے کے برابر تھا اور وہ پسپائی اختیار کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک انہیں تیرہ مزید ٹینکوں کی کمک مل گئی۔ یہ اس جنگ کے دوران تباہ ہو گئے تھے مگر فوری طور سے ان کی مرمت کر کے انہیں پھر میدان جنگ میں پہنچا دیا گیا تھا اور انہیں چلانے والے یا ان سے کام لینے والے بھی ایسے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زخمی فوجی تھے جنہوں نے ہسپتالوں سے اپنے تئیں زبردستی ڈسچارج کرا کے یا بھاگ کر میدان جنگ کا رخ کیا تھا۔ یوں ساتویں بریگیڈ نے اسرائیل کی تاریخ کی سب سے شاندار لڑائی میں اچانک شامی فوج پر جوابی حملہ کر دیا۔ اس موقعہ پر اسرائیلیوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے تھکے ہوئے اور کم ہمت شامیوں کو فوراً ہی پسپائی اختیار کرتے ہوئے دیکھا۔

شمالی سیکٹر میں ساتویں بریگیڈ کی بظاہر مایوس کن صورت حال میں اس دلیرانہ جدوجہد کی لمحہ لمحہ کی داستان، اوگ ڈور کی کتاب ''حوصلے کی بلندیاں'' میں تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ اوگ ڈور کہالانی ساتویں بریگیڈ کی ایک بٹالین کا کمانڈر تھا، اس کتاب کا دیباچہ ڈون سٹیری نے تحریر کیا ہے۔

لیکن اصلی اور کلیدی جنگ جنوبی سیکٹر میں لڑی گئی اور یہی وہ مقابلہ تھا جس نے ان نئے راستوں کی نشان دہی کی جو سٹیری نئے زمانے کی جنگوں میں اختیار کرنے کا داعی تھا۔

شمالی سیکٹر میں ساتویں بریگیڈ کی تباہ کن مداخلت کی وجہ سے اسرائیلی افواج کو اتنی مہلت ضرور مل گئی جس میں جنوبی سیکٹر تک کمک پہنچانے کا موقعہ مل گیا۔ جنوب مغرب سے ایک ڈویژن فوج جنوبی ڈین لیز کی کمان میں محاذ پر پہنچ گئی۔ دوسرا ڈویژن جنرل موشے ''مُستا'' پلیڈ کی کمان میں جنوب کے محاذ کی طرف اور جنرل ڈین لیز کی افواج کے متوازن دس میل کے فاصلے پر برابر آگے بڑھتا رہا۔ یہ دونوں ڈویژن جنہیں اسرائیلی طیاروں کی بھرپور امداد حاصل تھی ایک دوسرے کے نزدیک آتے گئے تا کہ قنیطرہ سے چند میل کے فاصلے پر شامی فوج کی جو بہت بڑی تعداد جمع ہے اسے محدود کیا جا سکے۔

سٹیری نے اس جنگ میں حصہ لینے والے سبھی کمانڈروں سے لڑائی کی معمولی سے معمولی ہر تفصیل کے متعلق سوالات پوچھے۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک وقت کمانڈروں کے درمیان اس بات پر زبردست اختلاف پیدا ہو گیا تھا کہ ''مُستا'' پلیڈ کی کمان میں جو کمک آ رہی ہے اسے کس طرح استعمال کیا جائے۔ عام خیال تھا کہ اس کو محاذ کے کمزور ترین مقامات کے استحکام اور دفاع کے لئے استعمال میں لانا چاہیے، مگر پلیڈ کو اس پر اعتراض تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے مزید ندامت اور بالآخر شکست کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ بالآخر پلیڈ نے ایک سابق چیف آف سٹاف جنرل چمبارلیو کے جو اس وقت وزیراعظم اسرائیل

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گولڈا میئر کا اہم ترین فوجی مشیر تھا، مشورے سے اپنی اس فوجی کمک کو حملے کے لئے استعمال کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ شکست کی عام فضا میں نہایت شاطرانہ طریقے سے حملے کے احکامات دے دیئے گئے اور کہا گیا کہ شام کی طاقت کے مضبوط مرکز کی بجائے حملہ ایسی جگہ پر اچانک کیا جائے جہاں کسی کو اس کی توقع نہ ہو۔

پلیڈ نے اگرچہ اس حملے میں اپنے بہت سے سپاہیوں کی قربانی دی، مگر شامی افواج کے بائیں بازو پر اس اچانک حملے نے شامیوں کو اس حد تک حیرت زدہ کر دیا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ ادھر سے لیز کی پیش قدمی نے شامی فوجی کو گھیرے میں لینے کا عمل تیز تر کر دیا۔ نتیجہ حیرت و استعجاب کی صورت ہی میں نہیں شامی فوج کا قلع قمع کرنے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ بھی ہوا کہ یوں عقب میں موجود بیشتر شامی فوجیوں کے لڑائی میں حصہ لینے کی نوبت ہی نہ آ سکی۔

''عرب اسرائیل جنگ'' نامی کتاب میں مصنف چیم ہرزوگ رقم طراز ہے: ''دس اکتوبر کو دوپہر تک یعنی 1400 شامی ٹینکوں کے ساتھ 1967ء کے خطِ متارکہ جنگ کے پار اسرائیل پر حملے کے کوئی چار روز بعد صورت یہ نظر آئی کہ اس لائن کے مغرب میں شام کا کوئی ایک بھی ایسا ٹینک باقی نہیں رہ گیا تھا جو لڑائی میں استعمال کئے جانے کے قابل ہو۔

اس کے کچھ ہی دیر بعد اسرائیلیوں نے جمع ہو کر شام کی سرحدوں کے اندر تک یلغار کر دی اور اس کے دارالحکومت دمشق کے آس پاس پہنچ گئے۔ مصنف ہرزگ کے بقول ان کے عقب میں شامی فوج کا غرور جل بجھ کر خاک ہوا پڑا تھا......سوویت یونین کی طرف سے کسی بھی غیر ملکی فوج کو ملنے والے جدید ترین اسلحے کے......گولان کی پہاڑیوں میں ہونے والی اس آزمائش میں ناقابل یقین رکاوٹوں کے باوجود کم تر اسلحے اور کم افرادی قوت والے ملک نے ٹینکوں کی لڑائی میں تاریخی کامیابی حاصل کرنے کا ریکارڈ قائم کر دیا تھا۔

اقوام متحدہ کے جنگ بندی کے احکامات کی تعمیل کے وقت تک شامی 1300 ٹینکوں کا (جن میں سے 867 پر اسرائیل نے قبضہ کر لیا تھا) نقصان برداشت کر چکے تھے۔ ساڑھے تین ہزار شامی اس جنگ میں لقمہ اجل بنے اور 370 اسرائیل کی قید میں تھے۔ اسرائیل کے سبھی ٹینک بھی حملوں کی زد میں آ کر بیکار ہوئے مگر ان میں سے بیشتر کو کم سے کم وقت میں مرمت کرنے کے بعد دوبارہ میدان جنگ میں لانے کے قابل بنا دیا گیا۔ اسرائیل کے مکمل

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طور پر تباہ ہونے والے ٹینکوں کی تعداد ایک سوتھی۔ اس کے 772 فوجی جنگ میں کام آئے، 65 شام کے قیدی بنے۔

اس واقعہ میں سٹیری کے لئے سب سے اہم جو سبق پوشیدہ تھا وہ یہ تھا کہ جنگ میں صرف پہل کرنے ہی سے نتائج کا حصول متعین نہیں ہوتا۔ اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ فریقین میں سے عددی طاقت کس کی زیادہ ہے اور کس کی کم۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ شام کے پاس فوجیں قطار اندر قطار موجود تھیں مگر فوجوں کی اس کثرت سے اسے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا۔

دوسرا واضح سبق یہ تھا کہ جو کوئی بھی اس کام کا آغاز کرتا ہے، ''خواہ وہ کثرت میں ہے یا قلت میں، حملہ کر رہا ہے یا دفاع! کامیابی اسی کے قدم چومتی ہے۔ اسرائیلیوں نے ثابت کر دیا کہ ایک چھوٹی فوج جو دفاع کے داؤ پیچ سے بخوبی آگاہ ہو، پہل کرنے کے قابل ہو سکتی ہے۔

یہ خیالات نئے ہرگز نہیں تھے لیکن اس وقت کے مروجہ رسمی نظریات سے لگا نہیں کھاتے تھی پرانا مفروضہ ...... جو جنگ کے کھیل اور اس کی تربیتی ضرورتوں میں مضبوطی سے گڑا ہوا تھا یہ تھا کہ اگر سوویت یونین نے کبھی جرمنی پر حملہ کیا تو نیٹو کی افواج کو پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ وقت حاصل کرنے کی کاروائیاں اس کے لئے ضروری ہوں گی۔ اس کے بعد ودہ حملہ کر کے روسی افواج کو پیچھے دھکیلنے کے قابل ہو سکیں گی لیکن اس کوشش میں ناکامی کی صورت میں انہیں ایٹمی ہتھیاروں سے کام لینا ہوگا۔

سٹیری کا کہنا تھا، یہ مفروضہ غلط ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ تاخیری حربوں سے کام لیتے ہوئے ہم دشمن کے میدان جنگ میں دور تک انتشار پھیلانے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ باقاعدگی سے آگے بڑھتی ہوئی اس کی فوج اور پیچھے آتی ہوئی صفوں کی صفوں کو روکنے پر توجہ دے سکتے ہیں۔ انہیں تباہ کرنا شاید ہمارے لئے ضروری نہیں ہوگا۔ ایسا کر سکیں تو مضائقہ نہیں.....مگر جو کام کرنا ہم پر لازم ہے وہ یہ ہے کہ ہم انہیں محاذ تک پہنچنے سے روکیں تا کہ وہ وہاں پہنچ کر دفاع کرنے والوں پر غالب نہ آ سکیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

متحرک دفاع:

سٹیری کی سوچ بڑی واضح تھی کہ اگر سوویت کے کثیر اسلحے اور نظریات سے مسلح شامیوں کی یلغار کو مقدار میں انتہائی کم اسرائیلی معمولی سا گھیرا ڈال کر آگے بڑھنے سے روک سکتے ہیں تو مشرقی یورپ ارو سوویت یونین کی ٹڈی دل کی طرح بڑھتی ہوئی افواج کو تعداد میں کم اتحادی فوجیں بھی یقیناً روک سکتی ہیں۔ بغیر ایٹمی ہتھیار استعمال کئے ہوئے۔ اس جنگ سے سیکھے جانے والے اسباق حقیقتاً دنیا کے ان دوسرے خطوں میں بھی دہرائے جا سکتے تھے جہاں مختلف ممالک محض کثرت کے پرانے اور فرسودہ طریقوں کے مطابق یہ سمجھ کر روایتی ہتھیاروں کے ڈھیر لگائے جا رہے تھے کہ کامیابی محض عددی قوت کے بل پر ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔

ویت نام کے تباہ کن تجربے کے بعد اس قسم کی تبدیلی کی ضرورت بری طرح محسوس کی جا رہی تھی۔ اس لئے امریکی فوج نے1973ء میں ''ٹراڈوک''......یعنی تربیت اور نظریے کی کمان کا ادارہ جنرل ولیم ای ڈی پوئی کی نگرانی میں قائم کر دیا۔ عوام کو اس کے متعلق کسی بھی قسم کی معلومات نہیں تھیں، مگر ٹراڈوک کو غیر کمیونسٹ دنیا میں تعلیمی نظام کی کارکردگی بڑھانے کا سب سے بڑا ادارہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ افسروں کے لئے یہ کئی یونیورسٹیوں کے برابر کام کر رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ عملاً سینکڑوں تربیتی مراکز بھی چلاتا ہے۔ یہ نظریہ سازی اور ٹیکنالوجی کی ایڈوانس تربیت پر خصوصی توجہ مرکوز کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ فوج میں جنگ کے تصور کے لئے نظری اساس بھی مہیا کرتا ہے۔ ٹرا ڈوک کے قیام کے سال دو سال بعد ہی مابعد جنگ کے ویت نام کی دانشورانہ خوشبو پھیلنا شروع ہوگئی۔

1976ء میں جب سٹیری جرمنی میں متعین تھا، ٹراڈوک نے متحرک دفاع کے نام سے ایک نیا فوجی نظریہ جاری کر دیا۔ جزوی طور پر یہ اسرائیلی تجربے اور سٹیری کے تحقیقاتی کام کی روشنی میں مرتب کیا گیا تھا۔ اس میں میدان جنگ کی ''گہرائی'' کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔ یعنی سوویت یونین کی حملہ آور افواج کی محض اگلی صف پر حملہ کرنے کی بجائے دور تک مار کرنے والے اعلیٰ فنی مہارت سے تیار کئے جانے والے ہتھیاروں کی مدد سے اس فوج کی دوسری اور عقبی صفوں کو بھی ساتھ ساتھ نشانہ بنانے کی اہمیت اجاگر کی گئی تھی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جہاں تک سٹیری کا تعلق ہے اس کے نزدیک یہ نظریہ صحیح سمت میں اٹھا ہوا قدم تھا لیکن مسئلہ صرف آگے بڑھتی ہوئی سرخ فوج کی دوسری صف ہی کا نہیں تھا، تیسری چوتھی صفوں اور اس کے بعد حملے میں مصروف قطار اندر قطار آگے بڑھتی ہوئی فوج کے بارے میں کیا اقدامات کئے جائیں؟ یہ سوچنا بھی لازم تھا، روس کی فوج تو شامی فوج سے تعداد میں کہیں زیادہ تھی۔ متحرک دفاع کا نظریہ اس حد تک یقیناً آگے نہیں بڑھا تھا جہاں حربی سائنس کے بارے میں ازسرنو ذکر کرنا ضروری ہو جائے۔

پینٹاگون کی سوچ میں تبدیلی لانا:

جنگ کے نئے تصور کے بارے میں زیادہ گہرائی تک اترنے کا خیال سٹیری پر غالب تھا کہ 1977ء میں خود اسے ترقی دے کر اور ''ٹراڈوک'' کا سربراہ بنا کر وہاں بھیج دیا گیا۔

سٹیری متحرک دفاع کے نظریے کے بارے میں اور جنرل ڈی ہرٹی جس کے خیالات سے وہ کلی طور پر متفق تھا، مثبت رائے کے اظہار میں ہمیشہ محتاط رہا لیکن اس وقت حملے اور دفاع کے سوال پر ان دونوں میں شدید اختلاف تھا۔ سٹیری کا کہنا تھا کہ جس چیز کی اس وقت ضرورت ہے وہ تدریجی تبدیلی ہرگز نہیں ہے بلکہ امریکی افواج کی کارکردگی اور نظریے میں اوپر سے نیچے تک بنیادی اور بھرپور تبدیلی کی ضرورت تھی۔

علاوہ ازیں اس وقت جب امریکی افواج میں یہ بحث زوروں سے جاری تھی، خود امریکی معاشرے کو جس سے فوج بھی بری طرح جڑی ہوئی تھی دوررس تبدیلیوں کا سامنا تھا اور فضا نئے خیالات اور امکانات سے پُر تھی۔

اس طرح جہاں امریکی معیشت کثرت پیداوار کے فرسودہ نظریے سے فیصلہ کن طور پر دور ہو کر تیسری لہر کے نظام کے تحت دولت آفرینی کے لئے محدود پیداوار کا نظریہ اپنانے کی طرف مائل تھی، امریکی افواج میں بھی ایسی ہی متوازی تبدیلیوں کے آثار نظر آنے لگے۔ بیرونی دنیا اگرچہ اس عمل سے بے خبر تھی تاہم تیسری لہر کے نظریے کے تحت کام کے آغاز کے سلسلے میں ابتدائی اقدامات اٹھانے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔

صورت حال کا ازسرنو جائزہ لینے کے نتیجے میں سٹیری کو دوسری لہر کے جنگی داؤ پیچ سے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

متعلق بہت سے مروجہ مفروضوں کو چیلنج کرنا پڑا۔ یوں وہ ایک انقلابی نظریہ کا روپ دھارنے پر مجبور ہوا اور اس کوشش میں اسے ایک ایسے عمل کو تیزی سے آگے بڑھانا پڑا جو ابھی پوری طرح واضح نہیں تھا اور جو روز نت نئے رخ اختیار کر رہا تھا۔

کسی رائج فوجی نظریے کو تبدیل کرنے کی کوشش جنگلی پودے سامنے پھینک کر ٹینک کو روکنے کے مترادف ہے۔ ہر جدید اور موثر نوکرشاہی کی طرح فوج بھی اختراعات کی عام طور سے مخالفت کرتی ہے۔ خاص طور پر اگر اس تبدیلی کی وجہ سے اس کے بعض یونٹوں کی اہمیت کم ہونے، نئے طریقے سیکھنے اور باہمی رقابتوں میں اضافے کا اندیشہ بھی ہو۔

کسی نئے نظریے کے تعارف کے لئے افواج اور سیاحت دونوں کی حمایت حاصل کرنا اور پھر اسے تربیت یافتہ فوجیوں کی مدد اور فنی مہارت سے عملاً نافذ کرانا معمولی کام نہیں ہے۔ کسی فرد واحد سے خواہ وہ جرنیل ہے یا نہیں ایسے بڑے کام کو پورا کرنے کی توقع رکھنا عبث ہے۔ اس کے لئے ایسی جنگ لڑنی پڑے گی جس میں گولیوں کی جگہ لفظ استعمال ہوں گے۔

اس مہم کا آغاز فوجی دانشوروں نے کیا۔ سٹیری نے مقالے لکھ کر اور انہیں فوجی مطبوعات میں شائع کرا کے اس میں تیزی پیدا کی۔ ریویو ار نے جواد بی تنقیدی مجلوں کا فوجی عکس تھا۔ اس مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس طویل، پیچیدہ اور دانشورانہ کاروائی میں متعدد تحریریں اور مقالے زیر بحث آتے رہے۔

اس پوری کوشش کی کلیدی اہمیت، کثرت پیداوار کے پرانے نظریے کا ازسرنو جائزہ لینے میں تھی مگر اس وہم یا خیالی خطرے کو چیلنج کرنے کا مطلب محض کسی نظریے کو چیلنج کرنا نہیں تھا بلکہ اس کی زد میں ملازمتیں، معاش، مروجہ داؤ پیچ، ٹیکنالوجی اور ان سب کی بنیاد پر قائم صنعتی رشتے وغیرہ سبھی کچھ آ جاتا تھا۔ اس سے فوج کے پورے ڈھانچے کا ازسرنو جائزہ لینے اور اسے متفقہ طور پر تبدیل کرنا بھی مقصود تھا یعنی اس کے حجم، طور طریقے اور اس میں موجود یونٹوں کی تعداد وغیرہ سبھی کچھ زیر بحث لایا جانا تھا اور یہ ساری کاروائی ایسے وقت میں کرنے کا مشورہ دیا جا رہا تھا جب کہ روایتی سویت نظریہ "طاقت کے غلبے اور زمینی جنگ" پر انحصار کی پالیسی کا مظہر تھا۔ کثرت پیداوار کے مروجہ اصولوں کے بارے میں شک و شبے کے اظہار کا مطلب موجود فوجی نظریات کا ابطال ہی نہیں تھا بلکہ یہ صنعتی معاشرے کی کثرت

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پیداوار کی روح سے بھی متصادم تھا۔

جنگ کے نئے طریقوں کے تصور کو قبول کرنے کے سلسلے میں پیش رفت کہیں 1970ء کی دہائی کے آخر اور 1980ء کے عشرے کے شروع کے برسوں میں واضح ہو کر سامنے آئی۔ سٹیری نے اس زمانے میں ڈٹ کر مطالعہ کیا اور یہ محض فوجی مقاصد تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کا دائرہ ان تمام سماجی اور اقتصادی قوتوں تک پھیلا ہوا تھا جو ہمیں جدیدیت سے آگے لے جا کر دوسری لہر کی بجائے تیسری لہر کی تہذیب کی جھلک دکھا رہی تھیں۔ مطالعے کے اسی دور میں ہماری کتاب ''تیسری لہر'' اس کی نظروں سے گزری جسے پڑھنے کے بعد اس نے اپنے سٹاف کے جرنیلوں کو بھی اس کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔ 1982ء میں اپنی پہلی ملاقات میں اس نے ہمیں بتایا تھا کہ فوج کے رویوں میں تبدیلی لانا آسان نہیں ہے اور بہرحال یہ ہے بھی دوسری لہر کے زمانے کا ایک ادارہ۔ اسے فیکٹری کہنا غلط نہ ہوگا۔ اس وقت عام خیال یہی تھا کہ ہمارے کارخانے ہتھیاروں کی پیداوار بڑھاتے، مزید اور پھر مزید بڑھاتے رہیں گے۔ فوج اپنی فیکٹریوں میں اپنی نفری کی تربیت کرتی رہے گی۔ پھر یہ لوگ اور ہتھیار یکجا ہو جائیں گے اور ہم جنگیں جیتتے رہیں گے۔ یہ ساری سوچ دوسری لہر کی سوچ ہے، اسے تیسری لہر کی دنیا کی سطح پر لانا ہی اصل کام ہے۔

اس مشن کو آگے بڑھانے کے لئے سٹیری کو اپنے افسران بالا کی حمایت درکار تھی۔ اسے اس وقت کے فوجی چیف آف سٹاف جنرل ایس سی میئر اور ٹراڈوک میں اس کے پیشرو بل ڈی ہوٹی اور کچھ دوسرے اعلیٰ فوجی حکام کی طرف سے اس حمایت کا یقین دلایا گیا۔ انہوں نے اس پر یہ بھی واضح کر دیا کہ اختلاف رائے کا مطلب غداری نہیں سمجھا جائے گا۔ یہ لوگ بھی ابھی تک ویت نام کی ہزیمت کو بھلا نہیں پائے تھے۔ اس لئے اس بارے میں وہ خود بھی کسی نئی سوچ کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔

سٹیری کو اپنے عملے میں بڑے نستعلیق قسم کے فوجی افسروں بلکہ دانشوروں کی خدمات کی ضرورت بھی تھی اور اس نے ایسے افسروں کو چن چُن کر فوٹ منرو ورجینیا میں ٹراڈوک کے ہیڈ کوارٹرز میں جمع کرنا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ جنرل ولیم آر گا رچرڈسن اور کرنیلوں کا ایک ٹولہ بھی دریافت کر لیا جس میں رچمونڈ ہنریک، پیاداس اور ایل ہولڈ شامل تھے جنہوں نے کنساس کے فورٹ لیون ورتھ کے مقام پر سٹیری کے لئے کام شروع کر دیا۔ یہ کام

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نظریوں میں تبدیلی سے اٹھنے والے مسائل کے حل اوران کے نفاذ کی راہ ہموار کرنے کے سلسلے میں تھا۔

سٹیری نے نظریے کو بہتر بنانے کی ذمہ داری بھی سنبھال لی جسے ماضی میں عام طور سے نظرانداز کیا جاتا رہا تھا۔ اس کے لئے اس نے ''ڈپٹی چیف آف سٹاف فار ڈاکٹرن'' کے نام سے ایک نیا عہدہ تشکیل دیا۔ ڈان موریلی ایک روز اس دفتر میں اچانک آ گیا تو ایک مختصر حکم نامے کے ذریعے بریگیڈیئر جنرل موریلی کو نظریاتی کام کے لئے قائم کئے جانے والے اس شعبے کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔

سٹیری، موریلی اور افسروں کے ایک مختصر گروپ نے جس میں جیز میری مین، جیک دوڈ مانسی، کارل وونوں کچھ غیرفوجیوں یعنی ڈاکٹر جو براڈوک نے (جس کی مشاورتی فرم براڈوک ، ڈن اورمیکڈرنلڈ یا بی ڈی ایم کے نام سے دفاعی مشاورت کا فریضہ انجام دے رہی تھی)۔ ٹراڈوک کے لئے تھنک ٹینک کی شکل میں کام کا آغاز کر دیا۔

سٹیری اور موریلی نے ہتھیاروں، تنظیم نو، اعدادوشمار، الیکٹرانک جنگ، ایٹمی ہتھیاروں کے نظریوں اور پوزیشنل جنگ کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے نظریات کی تبلیغ کرنے کے ساتھ ساتھ وسیع پیمانے پر سفر بھی جاری رکھے جن میں وہ امریکہ، جرمنی اور برطانیہ کے فوجی حاضرین کو جنگ کے بارے میں اپنے نظریات سے آگاہ کر کے ان ملاقاتوں کے نتیجے میں ہونے والی تنقید اور پوچھے جانے والے سوالوں سے اپنا ذہن صاف کرنے کا کام بھی لیتے۔

اس کے ساتھ ہی انہیں کچھ داخلی مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑا۔مثلاً فضائیہ کے پاس ٹراڈوک کا کوئی متبادل نہیں تھا۔ اس کے مقاصد کے لحاظ سے اس سے قریب ترین شے یعنی ''ٹیکنیکل ایئر کمانڈ'' کے نام کرنے والا ایک ادارہ تھا۔ یہ لانگلے ایئر فورس کے اڈے پر واقع تھا جو فورٹ منرو سے پندرہ منٹ سفر کے فاصلے پر تھا (ٹراڈوک کے وہاں قیام کی ایک یہ وجہ بھی تھی)۔

سٹیری کے ''گہری جنگ'' یا ''میدان کی توسیع'' کے فلسفے کا مطلب واضح تھا اور وہ یہ تھا کہ فوج آئندہ معرکہ آرائی کو محض محاذ تک محدود نہ رکھے بلکہ دشمن کی صفوں کے عقب تک پھیل جائے۔ عقب جہاں سامنے کی فوجوں کے پیچھے، آگے کی طرف بڑھتی ہوئی صفیں بھی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حرکت میں ہوتی ہیں۔ اس فلسفے کے مطابق انسانوں ، سازوسامان کی نقل و حرکت اور اطلاعات کی ترسیل میں رکاوٹ ڈالنالازم تھا کہ اس طرح عقبی صفیں آگے بڑھتی ہوئی حملہ آور فوجوں کی مدد کرنے کے قابل ہی نہیں رہتی تھیں۔

حریف کی نقل وحرکت کرنے کی اہلیت ، مواصلاتی رابطوں اور فضائی دفاع کے مراکز پر فضائیہ کے دور دور تک حملوں کو بھی اس سکیم میں ضروری قرار دیا گیا تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ جنگ میں فضائی اور زمینی افواج کے درمیان پورا پورا تال میل ہو مگر فضائیہ میں کچھ ایسے عنصر بھی موجود تھے جو اس نوع کی بحث وتمحیص کو شک وشبے کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کے نزدیک (اور کچھ فضائی افسروں کے نزدیک آج بھی) یہ عمل فوج کی طرف سے ان کے دائرہ اختیار میں دخل اندازی کے مترادف تھا اور یوں فوج اس کام میں الجھ رہی تھی جو روایتی طور پر فضائیہ کی ذمہ داری سمجھا جاتا تھا۔

یہ ''ٹیک'' کے کمانڈر بل کریچ کا کارنامہ تھا کہ اس نے فضائیہ کے افسران اعلیٰ کو باور کرایا کہ جنگ کے نئے طریقوں کے لئے نظریاتی بنیادیں مضبوط کرنے کا مطلب کسی کے اختیارات میں دخل دینا نہیں ہے۔ اس کے بعد جلدی فضائیہ کے افسروں کی ایک ٹیم نے ٹراڈوک کے ساتھ ، روزمرہ کی بنیاد ہر کام شروع کر دیا اور فضائی اور زمینی فوجی سرگرمیوں کے درمیان موزوں ربط وضبط کے راستے نکالنے کی کوششوں کا آغاز ہوگیا۔

سٹیری کو نظریاتی اساس کے استحکام کیلئے کام کرنے کے ساتھ ساتھ اس نئے نظام کے نفاذ کے بارے میں قسم قسم کے سوالات کا سامنا بھی کرنا پڑتا۔ مثلاً یہ کہ مستقبل میں کس قسم کے سپاہیوں اور افسروں کی ضرورت ہوگی اور انہیں کس نوع کی ٹیکنالوجی مہیا کرنا ہوگی؟ ٹراڈوک کے ذمے نئی قسم کی فوج کے لئے نظریہ سازی اور تربیت کا کام ہی نہیں تھا بلکہ یہ تعین کرنے کی ذمہ داری بھی تھی کہ مستقبل کی اس فوج کے لئے کس قسم کے ہتھیار اور فنی مہارت درکار ہوگی۔ یوں ٹراڈوک نے ایم ون ابرام ٹینک، اپاچی ہیلی کوپٹر، بریڈلے کی جنگی گاڑیوں اور پٹیر یارٹ میزائل کی تیاری میں بھی متعلقہ لوگوں کو مدد دی۔ یہ وہ ہتھیار تھے جو اس وقت تک سامنے نہیں آئے تھے۔ فضائی اڈوں کے جدید جے سٹارز قسم کے ریڈار کا جن کی بہت توصیف کی گئی تھی اور جس نے ڈیزرٹ سٹارم نامی خلیجی جنگ میں زمینی مراکز کو اہداف مقرر کرنے کے سلسلے میں نمایاں اطلاعات فراہم کی تھیں۔ جنم بھی 1978-79 میں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ٹراڈوک کی نگرانی ہی میں ہوا تھا۔ راکٹ لانچ کرنے کا کثیرالجہات سسٹم ایم آر ایل ایس اور اے ٹی اے سی ایم ایس کا میزائل سسٹم وغیرہ تمام ایسے ہتھیار تھے جو ٹراڈوک نے برسوں پہلے اس خیال سے تیار کر لئے تھے کہ اس کی نئی جنگی سوچ کے نفاذ کے لئے ان کی ضرورت پڑے گی۔ اس شدید سرگرمی کے نتیجے میں مستقبل کی ضرورتوں کی بنیاد پر تیار کئے جانے والے اس نظریے کے بارے میں پہلا رسمی بیان آخرکار 25 مارچ 1981ء کو جاری ہوا۔ یہ سبز رنگ کے کیموفلاج ٹائیٹل کور میں رکھا ہوا ایک چھوٹا سا پمفلٹ تھا۔ جس کا عنوان تھا ''زمینی فضائی جنگ اور کور 86 ''ٹراڈوک کا کتابچہ 5-525- یہ بالکل ابتدائی نوعیت کا مقالہ تھا جس سے موریلی (فضائی زمین جنگ کی اصطلاح بھی اسی کی وضع کردہ تھی) اپنی متعدد ملاقاتوں میں مدد لیتا رہا تھا۔ یہ تعارفی ملاقاتیں اب فوجی حلقوں سے باہر نکل کر کانگریس کے ارکان، وائٹ ہاؤس کے حکام، امریکی نائب صدر حتیٰ کہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، ہمارے جیسے غیر فوجی جوڑوں تک پھیل گئی تھیں۔

فضائی زمینی جنگ کا تصور اب کھل کر سامنے آ گیا تھا اور بیرونی تجزیہ نگاروں، حملہ آوروں اور تنقید کرنے والوں کی زد میں تھا اور یہ کام نہ صرف امریکی سیاست دان اور روایت پرست فوجی کر رہے تھے بلکہ یورپ میں نیٹو کے رکن ممالک کیطرف سے بھی جنہیں اس میں ایٹمی جنگ سے بچنے کے راستے نہیں بلکہ امریکہ کا جارحانہ رویہ دکھائی دے رہا تھا اس پر کڑی تنقید جاری تھی۔

یہ سٹیری موریلی نظریہ آخرکار 20 اگست 1982ء کو یعنی موریلی سے ہمارے پہلے رابطے کے کوئی چار ماہ بعد فوج کے فیلڈ مینوئل (ایف ایم) 5-100 (آپریشنز) میں شامل کر لیا گیا۔ موریلی کی خواہش کے مطابق مغربی یورپ میں مقیم نیٹو کی افواج کو بھی اس نظریے کی بنیاد پر تبدیلی کے عمل کو آگے بڑھانے یا متوازی طور پر اس کو قبول کرنے کا پابند بنا دیا گیا۔ اس میں فضائی اور زمینی قریبی رابطوں پر زور دیا گیا تھا۔ پہلی، دوسری اور اس کے بعد کی صفوں پر زور دار حملوں کی ہدایت کی گئی تھی تاکہ یہ عقبی دستے، محاذ پر لڑنے والے اگلے دستوں کی مدد کو نہ پہنچ سکیں۔ سب سے اہم بات اس میں یہ کہی گئی تھی کہ نئی ٹیکنالوجی کے ذریعے ان اہداف پر ضرب لگائی جائے جو اس سے قبل ایٹمی حملوں کے لئے مخصوص سمجھے جاتے تھے۔ ایسا کرنے سے اب ایٹمی محاذ آرائی کے امکانات کم ہو گئے تھے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گولان کی بلند پہاڑیوں سے سٹیری جو سبق سیکھ کر آیا تھا اس کی روشنی میں نئے مینوئل میں فوجی جوانوں اور افسروں پر زور دیا گیا تھا کہ وہ جنگ میں پہل کرنے کا موقعہ کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیں اور فن حرب کے نقطہ نظر سے چاہے وہ دفاعی پوزیشن ہی میں کیوں نہ ہوں، حکمت عملی کے طور پر حملہ کرنے سے ہرگز گریز نہ کریں۔ ایسی صورت میں جب کوئی طاقت ور حملہ آور اچانک ہلّہ بول دے، جیسا کہ شامیوں نے جنگ کی ابتدا میں کیا تھا، فوری جوابی حملہ سامنے کی صفوں کی بجائے دشمن کی افواج کے کمزور پہلوؤں پر کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ اس نظریے کی وضاحت میں شائع ہونے والے اس کتابچے کے آخر میں اس کام کے لئے اعلیٰ ترین انسانی صفات کے حامل افراد کی خدمت کے حصول پر زور دیا گیا تھا اور اس کو صرف لیڈرشپ ہی کے لئے نہیں بلکہ ایسی تربیت کے اہتمام کے لئے بھی لازمی بتایا گیا تھا جو ہر سپاہی کی صلاحیتوں میں اضافے کا باعث ہو سکتی ہو۔

ابتدائی طور پر سامنے آنے کے بعد فضا اور زمین کی جنگ کے نظریے کو مزید موثر اور بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی تبدیل کر دیا گیا۔ جہاں فضا اور زمین کی جنگ کا مقصد دشمن کی عقبی صفوں کا شیرازہ منتشر کرنا بتایا گیا تھا وہاں بعد کے متن میں جسے فضائی زمینی کاروائیوں کا نام دیا گیا تھا اس بات پر زور دیا گیا کہ دشمن کے عقبی دستوں کو آگے آنے سے روکنے کے لئے فوری کاروائی لازم ہے۔ فضائی اور زمینی کاروائیوں کے اس تصور پر 1987ء میں کام شروع ہوا اور صدام کے کویت پر حملے سے دنیا کو حیران کرنے کی کوشش کے ایک برس بعد اگست 1991ء میں اسے سرکاری دستاویز کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

اس میں طویل فاصلوں تک تیزی رفتاری سے طاقت آزمائی کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔ اس بات پر بھی اصرار کیا گیا تھا کہ فوج کے مختلف شعبے باہم مل کر کاروائیاں کریں اور یہ کہ اتحادی مشترکہ طور پر ان میں حصہ لیں۔ پہل کرنے کے بہتر امکانات اور فوجی سپاہیوں کی بہتر استعداد پر انحصار کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا تھا۔

تشویش کے مراکز کے سلسلے میں وقت کی اہمیت بتاتے ہوئے، مربوط اور بیک وقت حملہ کرنے پر بہت زور دیا گیا تھا کہ کاروائی مقررہ وقت میں پوری ہو سکے۔ کمانڈروں کو جنگ کے نمبر کو کنٹرول میں رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ آخر میں ''علم'' کی افادیت پر زور دیا گیا تھا اور کامیابی کے لئے خفیہ اطلاعات کی بھم رسانی اور مواصلات کے بہتر انتظامات کو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مرکزی حیثیت دی گئی تھی۔

دنیا کے نقشے پر ان دنوں تبدیلیاں اتنی تیزی سے دیکھنے میں آ رہی ہیں کہ نظریوں یا مروجہ موسموں میں جو ردوبدل پہلے چالیس پچاس برس کے وقفے کے بعد کیا جاتا تھا اب اس کی ضرورت سال دو سال ہی میں محسوس ہونے لگتی ہے۔

یوں 14 جون 1993ء کے فیلڈ مینوئل (ایف ایم) 5-100 میں نظر ثانی کے بعد مزید تبدیلی کی گئی۔ اس تازہ ترین صورت کی سمری میں کہا گیا تھا کہ ''نئے تجربوں کی روشنی میں فن حرب کے کچھ نئے طریقے ہم پر آشکار ہوئے ہیں۔ ان کا تعلق صنعتی عہد کی جنگوں کے طریقوں کے خاتمے اور انفرمیشن کے زمانے کی جنگ کے طور طریقوں کے آغاز سے ہے۔''

فوجی منشور کی یہ تازہ ترین تبدیل شدہ صورت سب سے زیادہ زور جنگ کی رنگا رنگی اور کثیر پہلو پر دیتی ہے۔ یعنی فوج میں ایسی صلاحیت کی ضرورت پر متوجہ کرتی ہے کہ وہ ایک قسم کی جنگ سے تیزی کے ساتھ دوسری نوعیت کے تصادم کی طرف قدم بڑھا سکے۔ نیز اس میں فوجوں کو صف بندی کے لئے یورپ کی جگہ پورے کرہ ارض کو سامنے رکھ کر اگلی صفوں کی نقل و حرکت کے پروگرام مرتب کئے گئے۔ یعنی ان فوجوں کی سرگرمیاں جو تصادم کے ممکنہ علاقوں میں متعین ہوں اور اس خیال کو پیش نظر رکھ کر منشور کو اپ ڈیٹ کیا گیا تھا کہ امریکہ میں مقیم افواج کو دنیا کے کسی بھی حصے میں تیزی کے ساتھ پہنچایا جا سکے۔ یہ انتظام سوویت یونین کے ساتھ ایک عالمی جنگ کے مفروضے کے پیش نظر کیا جا رہا تھا اور ناگہانی طور پر پیدا ہونے والی کسی بھی علاقائی صورت حال کی پیش بندی اس کا مقصد تھی۔ علاوہ ازیں یہ نیا اور ترمیم شدہ مینوئل جنگ کے علاوہ دیگر سرگرمیوں کا احاطہ بھی کر رہا تھا۔ ان میں متاثرہ علاقوں میں بحالی کا کام، شہری ہنگاموں، امن و امان کے قیام اور منشیات کی روک تھام کے مقاصد شامل تھے۔

تبدیل شدہ منشور میں پوری احتیاط کے ساتھ یہ بھی بیان کر دیا گیا تھا کہ امریکی افواج، امریکی عوام کے، جو فوری فتح کے خواہش منداور غیر ضروری اموات سے متنفر ہیں سامنے جواب دہ ہیں۔ کہا گیا تھا کہ شرائط پوری نہ ہونے کی صورت میں وہ اپنی حمایت واپس لینے کا حق رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ نظر ثانی شدہ مینوئل پر مغز اور بروقت ہے (ایک خیال انگیز تصنیف کے طور پر اس نے نیو یارک ٹائمز کے کتابی تبصروں کے شعبے کی توجہ اپنی طرف

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مبذول کرائی)۔ اس ترمیم شدہ مسودے میں فضائی ، زمینی جنگ کے بارے میں پہلی تحریر کے بعد ہونے والی بہت سی ڈرامائی تبدیلیوں کا عکس اسی مسودے میں نظر آتا ہے اور یوں یہ اس زمانے سے بہت آگے کی بات کرتا ہے۔ بہرحال ابتدائی تبدیلی کی طرح اس کے ڈی این اے کوسٹیری موریلی کے اس نظریے میں تلاش کرنا ابھی باقی ہے جس نے امریکی افواج کے تبدیلی کی تیسری لہر کی طرف سفر کی پہلی شعوری کوشش کی نشاندہی کی۔

اس کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے ہمیں آنے والی جنگ میں اس کے اثرات پر غور کرنا ہوگا......ایسی جنگ جس کا عکس ایک نئی قسم کی معیشت میں منعکس نظر آتا ہے اور یہ ہے دولت آفرینی کا تیسری لہر کا نیا نظام۔

ہم دولت کس طرح پیدا کرتے ہیں:

سوویت یونین کے گول مٹول مرد آہن خردشیف نے1956ء میں لاف زنی کرتے ہوئے اپنا یہ مشہور فقرہ اچھالا تھا کہ ''ہم تمہیں دفن کر کے رہیں گے۔'' اس کا مطلب اگرچہ یہ تھا کہ آنے والے ماہ و سال میں کمیونزم، اقتصادی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کو کھا جائے گا مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ خردشیف کی اس ڈینگ میں فوجی شکست دینے کی دھمکی بھی پوشیدہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس فقرے کی گونج دنیا کے کونے کونے میں سنی گئی۔

اس کے باوصف اس وقت بہت کم لوگوں کو اس بات کا اندازہ تھا کہ مغرب میں دولت آفرینی کے نظام میں نمودار ہونے والی انقلابی تبدیلیاں عالمی فوجی توازن اور خود جنگ کے مروجہ طریقوں کا نقشہ کس طرح بدلنے والی ہیں۔

جس حقیقت سے خردشیف (اور بیشتر امریکی) اس وقت لاعلم تھے وہ یہ تھی کہ 1956ء وہ پہلا سال تھا جس میں امریکہ کے فیکٹری مزدوروں کے مقابلے میں سفید پوشوں اور نوکر پیشہ لوگوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ یہ تبدیلی اس امر کی غماز تھی کہ دوسری لہر کی معیشت ختم ہونے کو ہے اور ایک نئی یعنی تیسری لہر کی اقتصادیات کی آمد آمد ہے۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ مستقبل پر نگاہ رکھنے والے کچھ بیدار مغز اقتصادی ماہروں نے امریکی معیشت میں علم پر مبنی معاشی پھیلاؤ کا جائزہ لینے اور اس کے دور رس اثرات کا تجزیہ کرنے کی ذمہ داری سنبھال لی۔ بہت پہلے1961ء میں آئی بی ایم نے اپنے مشیروں کو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سفید پوش کارکنوں اور خودکار مشینوں کی یلغار کی وجہ سے اس کے تنظیمی اثرات کے بارے میں رپورٹ تیار کرنے کی ہدایت کی تھی (اس رپورٹ میں بیان کردہ متعدد حقائق اب تک درست تسلیم کئے جا سکتے ہیں)۔ ماہر اقتصادیات فرٹز لیک لپ نے اس موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ امریکہ میں علم کی پیداوار اور تقسیم پیش کیا۔

1968ء میں اس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی نجی کارپوریشن ''ایٹ اینڈ ٹی'' نے بھی ایک مطالعاتی ٹیم کو مطلوبہ مقاصد کے از سرنو تعین کرنے کیلئے رپورٹ کی تیاری کی ذمہ داری تفویض کیجو امریکی حکومت کے اس کمپنی کو توڑنے کے حکم کے اجراء سے کوئی دس برس قبل 1972ء میں کمپنی یا انتظامیہ کو موصول ہوئی اور یہ اس وقت تک کے تمام مسلمہ اور مروجہ عقائد کے برعکس تھی، اس میں اس کمپنی کو اپنے ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں لانے اور اس کی ذمہ داریوں کو کئی حصوں میں بانٹنے کی سفارش کی گئی تھی۔

رپورٹ میں وہ طریقے بھی بیان کر دیئے گئے تھے جن پر عمل کر کے دوسری لہر کی کسی عظیم صنعتی نوع کی نوکرشاہی کو ایک تیز رفتار اور متحرک تنظیم کی شکل دی جا سکتی تھی، لیکن ''ایٹ اینڈ اٹ'' نے تین برس تک اس کو دبائے رکھا۔ اس کے بعد ہی اسے کمپنی کی انتظامیہ کے اعلیٰ حکام کے مطالعہ کے لئے سامنے لایا گیا۔ اس وقت تک امریکہ کی بڑی بڑی کمپنیوں کی اکثریت نے تعمیر نوع کے تدریجی طریقوں سے آگے بڑھ کر سوچنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی۔ یہ خیال کہ علم کی بنیاد پر ترتیب دی جانے والی معیشت میں ان کی بقا کا راز بنیادی چیر پھاڑ میں پوشیدہ ہے۔ اس وقت مبالغہ آمیز نظر آتا تھا۔ اس کے باوجود تیسری لہر نے جلد ہی اس تبدیلی کے لئے دنیا کی بڑی بڑی صنعتی کمپنیوں کو تیزی کے ساتھ تاریخ کا سب سے تکلیف دہ عمل اختیار کرنے پر مجبور دیا۔

اسی طرح اس ٹائم فریم میں جس میں سٹیری اور اس کے معاون، امریکہ کی فوجی سوچ کو بدلنے کی کوششوں کا آغاز کر رہے تھے۔ امریکہ کی بڑی بڑی صنعتی کمپنیوں میں سے بھی بہت سی اس وقت انہی خطوط پر عمل کرتے ہوئے معیشت کے میدان میں نئے طریقوں اور نئے تنظیمی ڈھانچوں کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔ منیجمنٹ کے نئے نظریوں کی تلاش میں جوش و خروش یقیناً دولت آفرینی کے نئے طریقوں کی دریافت کا مرہون منت تھا۔

اس وقت سے اب تک جنگی حکمت عملی میں جو تبدیلیاں آئی ہیں اور آنے والے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زمانے میں اس سے بھی زیادہ متوقع ڈرامائی تبدیلیوں کے ادراک کے لئے تیسری لہر کی نئی اقتصادیات کی دس بنیادی خصوصیات کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہوگی جو یہ ہیں:

1- پیداواری اجزاء:

ماضی کی دوسری لہر کی معیشت میں زمین، محنت، خام مال اور سرمایہ ہی بڑے پیداواری اجزا تھے جبکہ علم کو جس کا ذکر یہاں وسیع تر معنوں میں کیا جا رہا ہے، معلومات، تصورات، علامتوں، کلچر، نظریات اور اقدار کے ساتھ تیسری لہر کی معیشت میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ نظریہ جو ایک زمانے میں طعن وتشنیع کے نشتروں کی زد میں تھا، اب اسے ایک بدیہی حقیقت کے طور پر قبول کیا جا چکا ہے، مگر اس کے صحیح نتائج سے کلّی بے خبری اب بھی عام ہے۔

موزوں اعداد و شمار، معلومات یا علم کی مدد سے دولت آفرینی کے تمام دوسرے لوازمات میں معتدبہ کمی کی جا سکتی ہے۔ صحیح علم، محنت کی ضروریات اور سازوسامان کی طویل ضرورت میں کمی کی راہ ہموار کرسکتا ہے۔ توانائی اور خام مال کے استعمال کو کم کرنے کے ساتھ ساتھ وقت اور جگہ کا ضیاع روک سکتا ہے۔ حتیٰ کہ اس طرح پیداوار کے لئے درکار سرمایہ کی مقدار میں بھی کمی ہوسکتی ہے۔

کمپیوٹر کی مدد سے تیار کیا جانے والا کوئی بھی اوزار جو نہایت درستگی سے کام میں لایا جا رہا ہو، اس پرانی مشین کے مقابلے میں جس کی جگہ اس نے اب لی ہے، پیداواری عمل کے دوران کپڑے اور فولاد کے ضیاع میں یقیناً بہت کمی لا سکتا ہے۔ پریس کی خودکار مشینیں جن سے طباعت اور کتابوں کی جلدبندی کا کام لیا جا رہا ہے۔ صنعتی دور کے زمانے کی پرانی مشینوں کے مقابلے میں جو اب متروک ہو چکی ہیں، کم کاغذ استعمال کرتی ہیں۔ دفاتر کی عمارات میں درجہ حرارت کو کنٹرول کرنے کے نئے اور دانشمندانہ اقدامات سے توانائی کے استعمال میں بچت کے زبردست امکانات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ الیکٹرانک ڈیٹا سسٹم کی مدد سے مصنوعات تیار کرنے اور ان کے خریداروں سے براہ راست رابطہ ہونے سے کپسٹر چپ تک استعمال ہونے والی تمام چیزوں میں کمی ممکن ہوگئی ہے۔

صحیح طریقے سے کام میں لایا جانے والا علم یوں صنعتی پیداوار کے دوسرے لوازمات کا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

متبادل بن جاتا ہے، روایتی اقتصادی ماہرین اور اکاؤنٹنٹ صاحبان کو یہ نظریہ ہضم کرنے میں اب بھی مشکل پیش آ رہی ہے کیونکہ گنتی کے عمل سے چھٹکارا پانا آسان نہیں ہوتا۔ تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ علم ہی اب پیداوار کا سب سے متنوع اور اہم جزو ہے، چاہے اس کی پیائش ممکن ہو یا نہ ہو۔

تیسری لہر کی معیشت کو جو حقیقت انقلابی بناتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں پیداواری مقاصد کے لئے زمین، محنت، خام مال اور شاید سرمایہ بھی غیر متعلق اور غیر ضروری قرار پاتا ہے۔ مشتاقان علم کے لئے اس کے ذرائع لامحدود ہیں، ایک بلاسٹ فونڈری یا اسمبلی پلانٹ کے برعکس علم سے مہیا کردہ خام مال دو کمپنیاں بیک وقت استعمال کرسکتی ہیں۔

2- غیر محسوس اقدار:

جہاں دوسری لہر کی کسی بھی کمپنی کی قیمت کا اندازہ اس کے آثاثوں جیسے عمارات، مشینیں، سٹاک اور دوسرے ساز وسامان کی فہرست کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا ہے وہاں تیسری لہر کی کامیاب کمپنیوں کی قدر و قیمت معلوم کرنے کیلئے ان کے علم حاصل کرنے، اسے وسعت دینے، تقسیم کرنے اور اس سے درست طور پر کام لینے کی استعداد پر توجہ دی جاتی ہے۔

کمپاک یا کوڈک، ہٹاچی یا سیمنز کی صحیح قیمت کا اندازہ ان کے کارکنوں کے ذہن میں موجود خیالات ان کی دور بینی اور معلومات سے کیا جا سکتا ہے یا پھر ان کے ڈیٹا بنک اور پیٹنٹ مصنوعات کو ان کا اثاثہ قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے ٹرک، اسمبلی پلانٹ اور اس نوع کے دیگر اثاثوں کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی۔ خود سرمائے نے بھی اب غیر مرئی شکل اختیار کرلی ہے۔

3- کثرت پیداوار کے برعکس:

دوسری لہر کی معیشت کا خصوصی کردار بڑے پیانے کی پیداوار سے متعین ہوتا ہے، لیکن کمپنیاں جوں جوں علم پر مبنی بلکہ بیشتر اوقات روبوٹوں کی مدد سے مصنوعات کی تیاری کا لامتناہی اور سستا نظام وجود میں لائی جاتی ہیں۔ دوسری لہر کا نظام فرسودہ سے فرسودہ تر ہوتا نظر آتا ہے۔ اس کا انقلابی نتیجہ یہ سامنے آیا ہے کہ کثرت پیداوار کی جگہ اب محدود پیداوار

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے لے لی ہے۔

پیداوار کی اس نئی اور متنوع ٹیکنیک کے رائج ہونے سے صارفین کے لئے یوں آسانی پیدا ہوگئی ہے کہ اب ایک وال مارٹ سٹور مختلف قسم کی ایک لاکھ دس ہزار اشیاء بیک وقت خریدار کو پیش کرسکتا ہے۔ جو شکل، ماڈل، حجم اور رنگوں کے لحاظ سے الگ الگ ہوتی ہیں۔

لیکن وال مارٹ تو کثرت پیداوار کے دور کا تجارتی ادارہ ہے اور یہ مارکیٹ بجائے خود ٹوٹ پھوٹ کی شکار ہوکر مختلف پیمانوں میں تقسیم ہو رہی ہے۔اس لئے خریدار بھی ایسی مختلف اور بہتر معلومات کے طلب گار ہیں جو تجارت کے فروغ کے لئے چھوٹی منڈیوں کی نشاندہی کرسکیں۔ بالخصوص سٹور، بوتیک، سپر سٹور، ٹی وی کی مدد سے چلنے والے شاپنگ کے مراکز، کمپیوٹر کے ذریعے خریداری کے طریقے، ڈاک کے براہ راست رابطے اور ایسے ہی کئی دوسرے نظام جو مختلف النوع قسم کے ایسے نئے ذرائع سامنے لاتے ہیں جن کی مدد سے مصنوعات تیار کرنے والے اپنا مال گاہکوں تک روز بروز محدود ہوتی ہوئی منڈیوں کے ذریعے پہنچاسکیں۔

اس صورت حال میں اشتہار بازی کا ہدف روز بروز سکڑتی ہوئی مارکیٹوں کے کچھ حصوں پر ہی مرکوز رہتا ہے جن سے محدود اور متعینہ مقاصد کے ذریعے رسائی کے لئے کام میں لائے جانے والے میڈیا کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ناظرین کی وسیع تقسیم کے بحران کا اندازہ ایک زمانے کے عظیم الشان ٹی وی نیٹ ورکس اے بی سی، سی بی ایس اور این بی سی کی اس وقت کی حالت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جب ڈینوور کی مواصلاتی کارپوریشن یہ اعلان کرتی ہے کہ وہ فائیر آپٹک سسٹم کے تحت ناظرین کے لئے 500 چینل پر مشتمل نشریاتی رابطے کا اہتمام کر رہی ہے۔ ایسے سسٹم کا مطلب یہ ہوا کہ فروخت کنندگان اب اپنے خریداروں کے لئے اہداف مقرر کرتے وقت زیادہ دقت سے کام لے سکیں گے۔ پیداوار کی تقسیم اور مواصلات کے نظام میں کثرت پیداوار کے دور کے مقابلے میں بھی یہ تبدیلی معیشت میں ایک انقلاب کا ذریعہ بنتی ہے اور اسے یک رنگی اور یکسانیت سے اٹھا کر رنگا رنگ قسم کی معیشت کی شکل دے دیتی ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

4- کام:

نئے دور میں کام کی نوعیت بجائے خود بدل جاتی ہے۔دوسری لہر کے زمانے میں نیم تربیت یافتہ اور ایسی افرادی قوت پر انحصار کیا جاتا تھا جو زور بازو سے کام لیتی تھی اور جس کا متبادل آسانی سے میسر آجاتا تھا۔کثرت پیداوار کی فیکٹریوں کی طرح روٹین کے مطابق بار بار آزمائے ہوئے طریقوں سے ان کی تیاری کا کام لیا جاتا تھا۔اس کے مقابلے میں تیسری لہر کے زمانے میں محنت کشوں کو خصوصی تربیت کے ذریعے اور متبادل کی فراہمی کی گنجائش کے بغیر ہنرمندانہ تعلیم کے ذریعے تیار کیا جاتا ہے۔

جسمانی قوت بنیادی طور پر آسانی سے میسر آجاتی ہے۔ وہ یوں کہ ایک نیم تربیت یافتہ کارکن جب ایک جگہ سے کام چھوڑتا ہے یا نکالا جاتا ہے تو اس کی جگہ فوراً ہی دوسرا مزدور لگایا جاسکتا ہے۔اس میں خرچ بھی کچھ نہیں ہوتا۔اس کے برعکس تیسری لہر کی نشست کے لئے درکار اعلیٰ سطحی اور خصوصی طور پر تربیت یافتہ صحیح فرد کی صحیح کام کے لئے تلاش مشکل اور مہنگا سودا ہے۔

دفاعی سامان تیار کرنے والی کسی بڑی فرم سے نکالے جانے والے دربان کو اپنے ہی جیسے بہت سے بے روزگاروں کا مقابلہ تو درپیش ہوسکتا ہے لیکن کسی سکول یا انشورنس کمپنی کے دفتر میں ملازمت کے حصول میں کوئی امر مانع نہیں ہوسکتا۔اس کے مقابل میں برسوں خلائی سیارے تیار کرنے والا کوئی الیکٹرانک انجینئر کسی ایسی کمپنی کے لئے ہرگز کارآمد نہیں سمجھا جائے گا جو ماحولیاتی میدان میں فرائض انجام دے رہی ہے۔عورتوں کی مخصوص بیماریوں کا معالج دماغی سرجری کی جرات نہیں کرسکتا۔سپیشلائزیشن کے روز بروز بڑھتے ہوئے تقاضے اور ہنرمندی کے میدان میں تیزرفتار تبدیلیوں کی وجہ سے ایسے فرائض انجام دینے والوں کے درمیان ادلے بدلے کا عمل ناممکن ہوگیا ہے۔

جوں جوں معیشت ترقی کرتی ہے،''بالواسطہ محنت'' سے ''بلاواسطہ محنت'' کی طرف تبدیلی کے تناسب میں مزید تبدیلیوں کیے آثار سامنے آتے ہیں۔ روایتی اصطلاحات کی (جن کی اہمیت روز بروز کم ہو رہی ہے) رو سے فیکٹری میں کام کرنے والے بلاواسطہ یا پیداواری محنت کش وہ ہیں جو حقیقتاً پیداواری عمل کے ذمہ دار ہیں۔ پیداوار کی فالتو قدر بھی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انہی کی کوشوں کا نتیجہ ہوتی ہے جب کہ اس عمل میں شریک باقی سب لوگوں کو ''غیر پیداواری'' یا بالواسطہ طور پر شامل ہونے والے قرار دیا جاتا ہے۔

آج یہ فرق دھندلا پڑ چکا ہے اس لئے کہ سفید پوش' فنی ماہروں اور پیشہ ور کارکنوں کی تعداد کے مقابلے میں فیکٹری میں کام کرنے والے عام مزدوروں کا تناسب کم ہو چکا ہے۔ اب ''بالواسطہ'' پیداواری عمل سے بھی اگر زیادہ نہیں تو کم از کم اتنی ہی پیداواری قدر ضرور حاصل کی جاسکتی ہے جتنی کہ ''بلاواسطہ'' عمل سے حاصل ہوتی ہے۔

5-اختراع اور جدت:

یورپ اور جاپان کے دوسری جنگ عظیم کے اثرات سے سنبھلنے کے بعد امریکی تجارتی کمپنیوں کو زبردست مقابلے کا سامنا ہے۔ ایجادات و اختراعات کی مسلسل یلغار مقابلے کی مقتضی ہے۔ مصنوعات، ٹیکنالوجی، پراسسنگ، مارکیٹنگ اور سرمایہ کاری کے لئے نئے نئے خیالات اور نئے طریقوں کی ضرورت ہر وقت محسوس ہوتی ہے۔ زیادہ نہیں تو کم از کم ایک ہزار نئی مصنوعات ہر ماہ امریکہ کی سپر مارکیٹوں کی زینت بنتی ہیں۔ کمپیوٹر کے 486 ماڈل نے ابھی پوری طرح 386 ماڈل کی جگہ لی بھی نہیں ہوتی کہ مارکیٹ میں 586 ماڈل کی آمد آمد کا غلغلہ بلند ہوجاتا ہے۔ اس پس منظر میں سمجھدار کمپنیاں نئے خیالات سامنے لانے کے لئے اپنے کارکنوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں اور اس کے لئے اگر انہیں مروّجہ قاعدوں کو پامال کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو اس سے بھی گریز نہ کریں۔

6- حجم:

کام کے لئے مخصوص یونٹ تعداد میں کم ہورہے ہیں۔ پرانی اور فرسودہ معیشت کے اس کلاسیکی تصور کے برعکس جس کی رو سے ہزاروں محنت کش ایک ہی فیکٹری کے دروازوں کی طرف رواں دواں نظر آتے تھے، اب پیداواری سرگرمیوں کو مصنوعات کی تخصیص کے ساتھ چھوٹے پیمانے تک محدود کرنے کا رجحان عام ہے۔ جسمانی محنت سے کام کرنے والے ایک ہی قسم کے لاتعداد محنت کشوں کی جگہ اب چھوٹی چھوٹی اور مختلف النوع ٹیمیں تشکیل دی جانے لگی ہیں۔ پھیلا ہوا بزنس سکڑتا نظر آ رہا ہے جب کہ چھوٹے تجارتی ادارے وسعت پذیر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں۔ تین لاکھ ستر ہزار ملازموں والی کمپنی آئی بی ایم کو دنیا کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی کمپنیاں فنا کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس انجام سے بچنے کے لئے اس نے اپنے بہت سے ملازموں کو ملازمتوں سے نکالنے کے ساتھ ساتھ اپنے تیئں تیرہ، چھوٹے تجارتی یونٹوں میں تقسیم کر لیا ہے۔

تیسری لہر کے نظام میں بڑے حجم کی معیشتیں بیشتر اوقات پیچیدہ طرز عمل پر مبنی معیشتوں سے مار کھا جاتی ہیں۔ کوئی فرم جتنی بھی پیچیدہ ہوگی، اس امر کا امکان اتنا ہی بڑھ جائے گا کہ بائیں ہاتھ کو یہ اندازہ ہی نہ ہو کہ دایاں ہاتھ کیا کرنے والا ہے۔ شگافوں میں اشیاء گرتی ہی رہیں گی۔ مسائل ایسی شکل اختیار کرتے رہیں گے کہ کثرت پیداوار کے مبینہ فوائد کی ازخود نفی ہوتی رہے گی۔ یہ پرانا نظریہ یقیناً فرسودہ ہو چکا ہے کہ کوئی شئے جتنی بڑی ہوگی وہ بہتری کا اتنا ہی بڑا ذریعہ ہوگی۔

7- تنظیم:

تیز رفتار تبدیلیوں کا ساتھ دینے کی جدوجہد میں کمپنیاں اپنے دوسری لہر کے روایتی ڈھانچوں کو ختم کرنے کی دوڑ میں ایک دوسری سے بڑھ کر مصروف ہیں۔ صنعتی عہد کی کمپنیاں بالخصوص یکساں قسم کے تنظیمی ڈھانچے پر قائم ہیں یعنی اہرام مصر کی طرح بلند، پتھر کی طرح بھاری اور نوکر شاہی کی روایات کا نمونہ۔ آج کی منڈیاں، ٹیکنالوجی اور صارف کی ضروریات اتنی تیزی سے بدل رہی ہیں اور ان کمپنیوں پر ہر قسم کا دباؤ اس طرح ڈال رہی ہیں کہ نوکرشاہی کی یکسانیت دم توڑتی نظر آتی ہے۔ تنظیم کے ایک نئے اور مکمل نظام کی تلاش جاری ہے۔ مثال کے طور پر تنظیم نو کے لئے سرگوشی میں آج جس لفظ، ''ری انجینئرنگ'' کا ذکر کیا جاتا ہے اس کے مطابق کسی کمپنی کے ڈھانچے کو منڈی یا جداگانہ خصوصیات کی بجائے اس کے انداز اور عمل کی بنیاد پر بدلنا چاہیے۔

نسبتاً معیاری ڈھانچے نئے ڈھانچوں کا راستہ ہموار کرتے ہیں۔ ان کے لئے نئی تنظیمیں، وقتی منصوبہ سازٹیمیں، منافع کے مراکز کے ساتھ ساتھ متنوع قسم کے سٹریٹجک اتحاد، مشترکہ منصوبے اور ادغام کے مراحل سامنے آتے ہیں اور اکثر تو قومی سرحدوں سے باہر تک پھیل جاتے ہیں۔ چونکہ منڈیاں برابر تبدیل ہوتی رہتی ہیں اس لئے کسی ایک مقام پر جمے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہنے کی بات، لچک کا مظاہرہ کرنے اور ردوبدل کے لئے تیار رہنے کے مقابلہ میں بہت کم اہمیت رکھتی ہے۔

8- مستحکم تنظیم:

معیشت کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی، زیادہ منظم اور مستحکم انتظامیہ کی ضرورت کا احساس دلاتی ہے۔ اگرچہ یہ عمومی مثال نہیں ہے تاہم غور طلب ہے کہ خوراک کمپنی نیسکو کو لاکھوں قسم کی مختلف مصنوعات کے لئے روزانہ 500 آرڈر دینا پڑتے ہیں اور یہ سارا مال 49 کارخانوں اور تقسیم کے 13 مراکز سے اٹھانا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ گاہکوں سے ہونے والے تیس ہزار سودوں پر بھی کارروائی کرنی ہوتی ہے۔

ظاہر ہے ایسی پیچیدہ صورت حال سے عہدہ برا ہونے کے لئے نئی قسم کی لیڈرشپ اور انتہائی مستحکم نظام کی ضرورت پیش آتی ہے، اس نوع کی تنظیم کی حقیقی ضرورت کا احساس معلومات کے وسیع ذخیرے کا مرہون منت ہوتا ہے۔

9- انفراسٹرکچر:

ہر چیز کو اپنی جگہ پر قائم رکھنے، جملہ اجزاء اور پیداوار کی خبر رکھنے، مال کی ترسیل میں رابطہ پیدا کرنے، انجینئروں اور منڈیوں میں کام کرنے والوں کو ایک دوسرے کی سرگرمیوں سے باخبر رکھنے، آر اینڈ ڈی سے منسلک ماہروں کو مصنوعات تیار کرنے والوں کی ضروریات کی خبر دینے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آس پاس جو کچھ ہو رہا ہے، انتظامیہ کو اس کی واضح تصویر پیش کرنے کے لئے ایسے الیکٹرانک نیٹ ورکس پر اربوں ڈالر صرف کئے جا رہے ہیں۔ کمپیوٹر ایسے حقائق کی نشاندہی جو فیصلے کی بنیاد بنتے ہیں اور دوسری معلوماتی مہارت میں رابطے کا کام انجام دیتے ہیں۔

الیکٹرانک معلومات کا عظیم ڈھانچہ جس کی کارکردگی کا انحصار بیشتر اوقات خلائی معلوماتی جہازوں پر ہوتا ہے پوری کی پوری کمپنیوں کو یکجا کرنے میں راہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے اور اکثر انہیں کمپیوٹر اور مال مہیا کرنے والوں، نیز خریداری سے جوڑ بھی دیتا ہے- دوسرے نیٹ ورکس بھی آپس میں رابطہ رکھتے ہیں- جاپان نے اگلے 25 برس میں اور تیز رفتار نیٹ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ورکس وجود میں لانے کے لئے ڈھائی ارب ڈالر مخصوص کئے ہیں۔ امریکہ کے (سابق) نائب صدر الگور نے جب وہ سینیٹ کا ممبر بھی تھا ایک قانون بنانے میں پہل کی جس کی رو سے ''قومی تحقیقاتی اور تعلیمی نیٹ ورکس'' پر پانچ برس میں ایک ارب ڈالر کے اخراجات منظور کئے تھے اور اس کا مقصد یہ معلوم کرنا بتایا گیا تھا کہ سپر شاہراہوں پر دوڑنے والی کاروں پر کیا گزرتی ہے ایسے الیکٹرانک منصوبے تیسری لہر کی معیشت کے لئے درکار ضروری انفرانسٹرکچر مہیا کرتے ہیں۔

10- تیزی:

یہ تمام تبدیلیاں، عملی کام اور اس کی انجام دہی میں مزید تیزی پیدا کرتی ہیں۔ حجم کی معیشت کی جگہ رفتار کی معیشت آ جاتی ہے۔ مقابلہ اتنا شدید اور رفتار اتنی تیز ہے کہ ''وقت دولت ہے'' کا پرانا تصور اب یہ نئی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ ''وقت کا ہر لمحہ گزرے ہوئے لمحے سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔''

وقت ایک تغیر پذیر حقیقت ہے جس طرح کہ ''بالکل بروقت'' اور ''فیصلے کے عمل سے دوچار'' وغیرہ کی اصطلاحوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ، درجہ بدرجہ، قدم بقدم ''تعمیراتی علم'' کی جگہ اب ''یک وقتی تعمیراتی علم'' کی اصطلاح نے لے لی ہے۔ کمپنیاں ان دنوں مقابلے وقت کی مناسبت سے کرتی ہیں۔ اس ضمن میں سیریل لنچ کا ایک اعلیٰ عہدیدار ڈودین بیٹرسن وقت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے، ''دولت روشنی کی رفتار سے حرکت کرتی ہے۔ معلومات کے حصول کی رفتار اس سے بھی زیادہ ہونی چاہیئے۔'' یوں تیسری لہر کے کاروبار کی تیزی صحیح وقت کے نزدیک سے نزدیک تر پہنچ جاتی ہے۔

تیسری لہر کی معیشت کے متذکرہ اصولوں کو متعدد دوسرے اصولوں کے ساتھ پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دولت آفرینی اب عظیم تبدیلیوں کی مقتضی ہے۔ امریکہ، جاپان اور یورپ کے تیسری لہر کے نظام کو اختیار کرنے سے جو اگرچہ پوری طرح اختیار نہیں کیا جا سکا، یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں کرہ ارض پر کارخانوں کی قطاریں نمودار ہونے کے بعد کے وقت سے اب تک یہ ایک واحد نمایاں اور بڑی تبدیلی سامنے آئی ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ تاریخی تبدیلی جس نے سترہویں دہائی میں رفتار پکڑی تھی،1990ء کی دہائی تک خاصی ترقی کر چکی تھی۔ اس مدت میں خود جنگ آزمائی بھی گاڑی میں آگے پیچھے جتے ہوئے گھوڑوں کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ دوسری لہر کی معیشت کی طرح دوسری لہر کی جنگ بھی متروک ہوگئی ہے۔

تیسری لہر کی جنگ

1991ء میں مشرق وسطیٰ کے کھلے آسمانوں کی راتوں اور صحرا کی ریت کے درمیان ایسا کچھ ہوا، جو دنیا نے گزشتہ تین سو برس میں پہلی بار ہوتے دیکھا۔ یہاں جنگ کی ایسی شکل سامنے آئی جس میں دولت آفرینی کے نئے طریقوں کی جھلک نمایاں تھی۔ یہ حقیقت ایک دفعہ پھر ہمارے سامنے آئی کہ جس طریقے سے ہم دولت پیدا کرتے ہیں اور جس طرح ہم جنگ کرتے ہیں، ان دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔

دنیا کے ترقی یافتہ معاشروں کی معیشتیں، تکنیکی طور پر ناہمواری سے دوچار ہیں۔ وہ جزوی طور پر جہاں دوسری لہر کے زوال پذیر اصول کثرت پیداوار پر عمل پیرا ہیں، وہاں تیسری لہر کی ٹیکنالوجی اور خدمات سے بھی فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ اعلیٰ ترقی یافتہ قوموں حتیٰ کہ جاپان اور امریکہ میں سے بھی کسی نے تبدیلی کے اس عمل کو پوری طرح مکمل نہیں کیا اور یہ سب ابھی تک جسمانی محنت اور دماغی کام میں بٹی ہوئی ہیں۔1990-91ء میں خلیج کی جنگ جس طرح لڑی گئی، اس میں بھی دوہرے پن کا یہ اظہار نمایاں تھا۔

بہرحال یہ طے ہے کہ تاریخ آخرکار اخلاقیات، اقتصادیات اور سیاسی جغرافیائی نقطہ نظر ہی سے اس تصادم کی قدر و منزلت کا تعین کرے گی مگر حقیقت یہ ہے کہ جس طریقے سے یہ جنگ لڑی گئی اس سے اور اس کے دوررس اثرات سے دنیا بھر کے ملکوں اور افواج نے بہت کچھ سیکھا اور اب تک سیکھ رہے ہیں۔

جس چیز کو اب تک پوری طرح سمجھا نہیں جا رہا وہ یہ ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے عراق کے صدام حسین کے خلاف بیک وقت دو مختلف نوعیت کی جنگیں لڑیں۔ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ اس میں جنگ آزمائی کے دو مختلف یعنی دوسری لہر اور تیسری لہر کے طریقے اختیار کیے گئے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خلیج کا یہ خونریز تصادم 2اگست1990ء کو اس وقت شروع ہوا جب صدام حسین نے ہمسایہ ملک کویت پر حملہ کیا، نہ کہ عام خیال کے مطابق اس لڑائی کا آغاز 17 جنوری1991ء کو امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے عراق پر حملے سے ہوا۔

امریکہ اور عالمی ادارہ جس وقت صدام کے کویت پر حملے کے بعد جوابی کاروائی کے طریقوں پر بحث مباحثہ میں مصروف تھے، صدام حسین اتحادیوں کی جنگوں کی اس ماں کی دھجیاں اڑانے کی ڈینگیں مار رہا تھا۔ اس کے اس موضوع کو مغرب کے میڈیا پنڈتوں اور سیاستدانوں نے بھی گرہ سے باندھ لیا اور اتحادیوں کے بہت زیادہ جانی نقصانوں کی پیش گوئیاں کرنی شروع کر دیں۔ بعض ایسے اندازوں کے مطابق اتحادیوں کے تیس ہزار افراد کی ہلاکت متوقع تھی۔

ٹیکنالوجی کی دہشت:

جنگ کے کچھ مخالفوں نے اس کے ساتھ ہی مغربی میڈیا میں ایسی مہم کا آغاز بھی کر دیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ جنگ میں ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کے استعمال کے خلاف کمربستہ ہیں۔ عالمی پریس نے جلد ہی ٹیکنالوجی کی اس مبینہ دہشت گردی کے خلاف اٹھنے والی آوازوں میں اپنی آواز بھی شامل کر دی۔ مثلاً کہا گیا کہ امریکی ہیلی کوپٹر صحرائی طوفانوں میں زمین بوس ہوتے رہیں گے۔ سٹیلتھ قسم کے خصوصی بمبار طیارے ناکامی سے دوچار ہوں گے۔ رات میں دیکھنے کی صلاحیت دینے والے
چشمے کام نہیں آئیں گے۔ ''عراقی اسلحے کے ذخیر میں موجود روس کے مہیا کردہ'' ٹینکوں کے مقابلے میں ڈریگن اور ٹاڈ کے نام سے معروف ٹینک شکن ہتھیار بیکار ثابت ہوں گے۔ دی ایم۔ I ٹینک کام نہیں آئے گا اور بار بار خراب ہونے کی وجہ سے صحرا میں استعمال کے قابل ہی نہیں رہے گا۔ نیویارک ٹائمز نے تو یہ سوال بھی داغ دیا کہ'' کیا ہماری اعلیٰ ٹیکنالوجی سے تربیت یافتہ فوج محض ایک سراب ہے؟''

ایک بڑے فوجی کالم نویس نے تو یہ خیال سرے سے ہی مسترد کر دیا کہ جنگ آزمائی میں ٹیکنالوجی کے ذریعے دشواریوں پر قابو پانا ممکن ہے۔ اپنے قارئین کو اس نے اس حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی کہ یہ محض وہم ہے اور یہ کہ امریکی افرادی قوت پر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سازوسامان کی برتری کا نظریہ قبول کرکے غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

کیپٹیل ہل کے کچھ ''فوجی مصلحین'' نے ٹیپ کا مصرع اٹھاتے ہوئے ترقی یافتہ ہتھیاروں کی ضرورت ہی سے انکار کر دیا اور کہا کہ ان کے استعمال کا معاملہ اس قدر پیچیدہ ہے کہ اس پر انحصار کرنا درست نہ ہوگا۔ انہوں نے وہی خیال دہرایا جسے وہ برسوں سے بار بار پیش کرتے آ رہے تھے یعنی امریکہ کو لاتعداد سیدھے سادھے روایتی طیاروں، ٹینکوں اور میزائلوں کی ضرورت ہے۔ اس کے خیال میں ہتھیاروں کی کم تعداد سے خواہ وہ فنی لحاظ سے کتنے ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہوں، کام نہیں چلے گا۔

عام لوگ پروپیگنڈے کی اس یلغار کی وجہ سے اتحادیوں کے بہت زیادہ نقصانات کے خدشات میں مبتلا ہوگئے۔ صدام حسین کے پاس بہرحال سوویت عقائد اور روسی اسلحے سے لیس دس لاکھ فوج تیار کھڑی تھی۔ اتحادی فوجوں کے برعکس اسے جنگ کا تجربہ بھی تھا۔ یہ حال ہی میں آٹھ دس برس تک ایران سے متصادم رہی تھی۔ علاوہ ازیں اسے چھ ماہ کی مہلت خندقیں کھودنے، بنکر تعمیر کرنے اور مہلک بارودی سرنگیں بچھانے کے لئے مل چکی تھی۔ یہ پیش گوئی بھی کی جا رہی تھی کہ عراقی حملے کی صورت میں اپنے تیل کے کنوؤں کو آگ لگا کر شعلوں کی ایک ایسی لائن سامنے لے آئیں گے جس میں سے گزرنا ممکن ہی نہ ہوگا۔ عراق نے اپنے ہراول دستوں کے پیچھے فوجیوں کی صفوں کی صفیں لا کھڑی کی تھیں جن کے پاس فراواں اسلحہ موجود تھا۔ (جیسے گولان کی پہاڑیوں میں شامیوں نے اور مرکزی یورپ میں روسیوں نے یہ کام کیا تھا) کہا جا رہا تھا کہ ایسے حالات میں اگر اتحادیوں کی زمینی افواج نے حملہ کرنے کی جرات کی تو ان کی فوج کی مجموعی تعداد کا کم از کم دسواں حصہ اس حملے میں کام آ جائے گا۔

یہ اندازے بہرحال اس مفروضے کے مرہون منت تھے کہ خلیج کی جنگ صنعتی عہد کے ایک روایتی تصادم کا نمونہ ہوگی۔ اگرچہ زمینی فضائی جنگ کا بنیادی خیال (معہ بعد کی ترامیم کے) اس وقت تک دنیا بھر کے فوجی حلقوں تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔ صدام حسین اپنی فوجی مہارت کے تمام تر دعوؤں کے باوجود اس سے بالکل ہی ناواقف تھا۔ صدام حسین کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ جنگ آزمائی کا ایک بالکل ہی نیا طریقہ جنگ کی صورت

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شکل کو پوری طرح تبدیل کرنے والا ہے۔

دوہری جنگ:

جنگ کے آغاز ہی سے دو قسم کی فضائی کاروائیاں جاری تھیں۔ اگرچہ یہ دونوں ایک دوسری سے یوں جڑی ہوئی تھیں کہ انہیں علیحدہ علیحدہ دیکھنا ہی مشکل تھا۔ ان میں سے ایک میں تو وہی فرسودہ طور طریقے اختیار کئے گئے تھے جو دوسری لہر کے جدید عہد سے مخصوص تھے۔ ان میں تیس برس پرانے بمبار طیاروں کی مدد سے بنکروں میں بیٹھے ہوئے عراقیوں کو اندھا دھند گولہ باری کا نشانہ بنایا جاتا۔ پرانی جنگوں کی طرح ''سٹوپڈ'' بم اوپر سے گرائے جاتے جس سے دور دور تک تباہی پھیل جاتی۔ ہر طرف زخمیوں کی ہا ہا کار مچی ہوتی جس سے عراقی فوج کے محاذ پر برسر پیکار فوجی اور ان کے عقب میں متعین ری پبلیکن گارڈز کے دستے سب کے سب پست ہمتی کے شکار ہو جاتے تھے۔ اتحادی کمانڈر جنرل کوپ اس وقت بقول اس کے اخباری عملے کے ایک رکن کے ''میدان جنگ ترتیب دینے'' میں مصروف تھا جبکہ اتحادیوں کی پانچ لاکھ زمینی فوج، عراقیوں کے خلاف کاروائی کرنے کے لئے کیل کانٹے سے لیس کھڑی تھی۔

جنگ کے بعد پیرس میں اس کتاب کے مصنفین کی بات چیت ریٹائرڈ جنرل چیری گیلئس سے ہوئی۔ وہ پہلے فرانسیسی فضائیہ اور بعد میں نیٹو کے کمانڈر کے نائب کے طور پر خدمات انجام دے چکے تھے جہاں ان کی ذمہ داری سٹریٹجک معاملات پر غور وفکر کرنے کی تھی۔ گیلوئس نے جنگ کے فوراً ہی بعد عراق کا دورہ کیا تھا......'' میں نے اپنی چار پہیوں والی جیپ میں کوئی ''دو ہزار پانچ سو کلومیٹر کا سفر کیا'' اس نے ہمیں بتایا اور دیکھا کہ دیہات میں ہر چیز تباہ ہو چکی تھی۔ میں نے1968ء کے تیار شدہ بموں کے ٹکڑے جو ویت نام کی جنگ کے زمانے کی یادگار تھے، ادھر ادھر بکھرے ہوئے دیکھے۔ یہ اس نوع کی بمباری کی نشاندہی کر رہے تھے جس قسم کی بمباری میں نصف صدی قبل دوسری جنگ عظیم کے دوران میں خود حصہ لے چکا تھا......''

جنگ آزمائی کا یہ انتہائی مہلک طریقہ فریقین اچھی طرح سمجھتے تھے۔ یہ صنعتی عہد کا مذبح تھا۔ اس میں کتنے عراقی اور شہری کام آئے اس کا ہمیں کبھی پتہ نہیں چلے گا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیکن اس کیساتھ ساتھ پہلے ہی دن سے ایک مختلف قسم کی جنگ بھی جاری تھی۔
اس کے شروع ہوتے ہی ٹوما ہاک میزائلوں اور لیزر کے ذریعے کنٹرول شدہ بموں کی کارکردگی کے ٹیلی ویژن پر مظاہروں نے دنیا کو حیرت زدہ کر دیا یہ بم اور میزائل بغداد میں اپنے اہداف کو تلاش کر کے جس حیرت انگیز ہمت اور درستگی سے ان پر حملہ آور ہوتے وہ دیکھنے کی چیز تھی۔ عراقی فضائیہ کا ہیڈکوارٹر وہ عمارت جس میں عراقی خفیہ سروس کے دفاتر تھے۔ وزارت داخلہ کی عمارت (جہاں صدام کی پولیس کا ہیڈکوارٹر تھا)۔ کانگرس کی وہ عمارت جو بعث پارٹی کا ہیڈ آفس تھی یہ سبھی کچھ ان حملوں کی زد میں تھا۔

شہر بغداد کے مرکزی اور اہم ترین حصوں میں اہداف کو نشانہ بنانے کے لئے صرف نائب ہاکسیلتھ فائٹر بمباروں ہی سے جنہیں ایف117۔ اے ایس کے نام سے بھی جانا جاتا ہے کام لیا جاتا تھا۔ اس لئے کہ یہ صلاحیت صرف انہی طیاروں میں تھی کہ یہ انتہائی خطرناک علاقوں میں پہنچ کر گائیڈڈ بموں سے پوری صحت کے ساتھ تباہی پھیلا سکتے تھے۔ ان کی زیادہ توجہ فضائی دفاع کے بظاہر بہت محفوظ مراکز فوجی کمان اور کنٹرول میں فوج کو مدد پہنچانے والے اداروں پر مرکوز رہتی۔ ان طیاروں کیطرف سے عملاً حملہ آور ہونے کا تناسب مجموعی فضائی حملوں میں صرف دو فیصد تھا لیکن اہم اہداف کو نشانہ بنانے میں ان کی کامیابی کا تناسب 40 فیصد رہا اور تباہی اور بربادی کی تمام پیش گوئیوں کے باوجود یہ جہاز حملوں کے بعد خیریت سے واپس بھی آتے رہے۔ اس تصادم کی باقی مدت کے دوران میں ٹیلی ویژن جنگ آزمائی کے اس نئے طریقے کو زوردار طریقے سے ناظرین کے سامنے پیش کرتا رہا کہ میزائل کسی طرح مقررہ عمارتوں میں پہلے سے ہدف شدہ کھڑکیوں کے ذریعے بنکروں کے اندر جا کر عراقی ٹینکوں اور فوجیوں کو نشانہ بناتے تھے۔ یہ پوری جنگ ٹی وی کے پردے پر اور جنگ میں عملاً مصروف پائلٹوں اور سپاہیوں کے الیکٹرانک مانیٹرز پر صاف اور واضح شکل میں دکھائی جاتی رہی۔

نتیجتاً جنگ کا ایک نیا تصور سامنے آیا جو بظاہر خونریزی سے مبرا نظر آتا تھا۔ ٹی وی کی یہ کوریج ویت نام جنگ کی کوریج سے جس میں کٹے ہوئے اعضاء، کچلی ہوئی کھوپڑیاں اور بموں سے جھلسے ہوئے بچے امریکی گھروں کی چاردیواری کے اندر تک پہنچ جاتے تھے، بالکل مختلف تھی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عراق میں ایک جنگ دوسری لہر کے ہتھیاروں سے لڑی گئی جس کا مقصد وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانا تھا۔ ٹی وی اور ریڈیو پر اس جنگ کی معمولی سی جھلک دیکھنے میں آئی۔ دوسری جنگ تیسری لہر کے ہتھیاروں کے بل پر لڑی گئی جس کا مقصد درستگی، محدود تباہی اور کم سے کم نقصان کی حد قائم رکھنا تھا۔ یہ دنیا کو برابر دکھائی جاتی رہی۔

ہم نے یہ بھی دیکھا کہ امریکہ نے تیسری لہر کی اس جنگ میں جو کلیدی ہتھیار استعمال کئے ان میں سے بیشتر ایسے تھے جو سٹیری کے قائم کردہ ادارے ٹراڈوک کی ایک دہائی قبل کی سفارشات کے مطابق تیار کئے گئے تھے حالانکہ وہ خود خلیج کی جنگ شروع ہونے سے کافی عرصہ قبل ریٹائر ہوکر گھر جا چکا تھا اور موریلی کو اس دنیا سے کوچ کئے ہوئی ایک دہائی سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا' مگر جس طرح یہ ہتھیار استعمال ہوئے وہ بھی انہی لوگوں کے بیان کردہ طریقوں کے عین مطابق تھا۔

مثال کے طور پر تصادم کے آغاز کے ساتھ ہی ان اصحاب کی ''جنگ کی گہرائی''، ''ممانعت''، معلومات کی اہمیت اور خفیہ اطلاعات کے ہتھیاروں سے کام لینے کی سوچ تمام کاروائیوں میں کارفرما نظر آ رہی تھی۔

معدوم ہوتا ہوا محاذ:

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں فرانس کی سرزمین پر کھدی ہوئی خندقوں میں لاکھوں سپاہی آمنے سامنے ہوتے۔ یہ خندقیں جو کیچڑ، چوہوں، بدبو دار کوڑے اور سڑے ہوئے گوشت سے پر ہوتیں۔ ملک کے طول و عرض میں میلوں تک الجھی ہوئی آہنی خاردار تاروں کے عقب میں پھیلی ہوئی ہوتیں۔ یہاں مہینوں تک پوری کی پوری فوج محض رینگنے پر اکتفا کرتی۔ خوف کی وجہ سے سر سطح زمین سے اوپر اٹھانے کی نوبت ہی نہ آتی۔ حملے کا حکم دیا جاتا تو فوجی اوپر اٹھ کر آگے بڑھتے اور توپ خانے اور چھوٹے ہتھیاروں کی گولہ باری کی زد میں آ جاتے مگر جنگ کے دوران زیادہ وقت تک وہ بیٹھے رہتے۔ غیر متحرک اور بے عمل اور زیادہ تر بیماری اور بیزاری کا شکار رہتے۔

کسی کے ذہن میں یہ سوال نہ اٹھتا تھا کہ محاذ کہاں پر ہے؟ تقریباً اسی برس بعد صحرائی بینکروں میں بجھی ہوئی عراقی فوج کو اسی صورت حال کا سامنا تھا۔ سوائے اس کے کہ اب

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

محاذ وہاں نہیں تھا جہاں بڑی اور اہم لڑائی جاری تھی۔ جنگ کے زمینی فضائی نظریے میں بیان کردہ ہدایت کے عین مطابق، اتحادی فوجیں فاصلے، بلندی اور وقت کی حدوں پر ہر رخ سے دور دور تک گہرائی میں جا کر مار کر رہی تھیں۔ محاذ اب عقب میں تھا اور اطراف میں تھا۔ اوپر فضا میں تھا۔ حملوں کی منصوبہ بندی بارہ، چوبیس یا بہتر گھنٹے پہلے کر لی جاتی۔ وقت پر نقل وحرکت کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ۔

زمینی اور فضائی حملوں کو دور دور تک اس لئے وسعت دی گئی کہ اس سے دشمن کی عقب سے آگے بڑھتی ہوئی افواج کا راستہ روکا جا سکے۔ یہ بالکل وہی طریق کار تھا جو اتحادیوں نے سوویت روس کے جرمنی پر حملے کی صورت میں اختیار کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

تقریباً دس برس قبل پینٹا گون کے قریب واقع کرسٹل ہوٹل کے ایک کمرے میں مور یلی نے ہمارے لئے تیسری لہر کی جنگ کا جو ادھورا نقشہ کھینچا تھا اب وہ محض خیالی نظریہ ہی نہیں رہا تھا۔ خلیج کی جنگ کی تصویریں جب دنیا بھر کے ٹیلی ویژنوں پر نمودار ہوئیں تو ہم دم بخود بیٹھے وہ سب کچھ دیکھتے رہے جو مور یلی اور بعد میں سٹیری نے 1980ء کے عشرے میں ہم پر منکشف کیا تھا۔ 1990ء کی دہائی میں وہ سب کچھ ایک زندہ حقیقت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

دشمن کی کمان کی سہولتیں تباہ کردو، اس کے مواصلاتی رابطے منقطع کر کے اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تک آنے جانے والی اطلاعات کا راستہ روکو۔ پہل کرنے کی کوشش کرو، دور تک مار کرو، دشمن کی پچھلی صفوں کو، جنگی کاروائیوں میں حصہ لینے کے قابل ہی نہ رہنے دو، فضائی، زمینی اور بحری کاروائیوں کو مربوط بناؤ، مشترکہ حملوں میں رابطہ پورا رکھو، دشمن کے مضبوط مراکز پر سامنے سے حملہ کرنے سے گریز کرو، سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ جاننے کی کوشش کرو کہ دشمن کیا کر رہا ہے اور اس کو یہ معلوم کرنے سے روکو کہ تم کیا کر رہے ہو۔ یہ سب باتیں زمینی فضائی جنگ کے نظریے اور اس میں کی جانے والی بعد کی ترامیم کے عین مطابق نظر آتی ہیں۔

بہرحال خلیج کی جنگ کئی لحاظ سے زمینی فضائی جنگ کی متعینہ حدود سے آگے نکل گئی۔ فضائیہ نے اس میں اپنے روایتی امدادی کردار کی بجائے مرکزی کردار ادا کیا اور یہ تبدیلی اتنی ڈرامائی تھی کہ فضائی فوجی قوت کی اہمیت کے بارے میں بالآخر اس کے ابتدائی دعوے داروں جیسے اٹلی کے جیولوڈوہٹ (1930-1869)، امریکہ کے بلی مچل (1936-1879) اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

برطانیہ کے ہیوٹرنیچر(1956-1873) کے وعدوں کی پوری پوری تصدیق ہوگئی۔

بہرحال عراق وہ پہلا ملک تھا، جس پر فضائی زمینی جنگ کے نظریے کو پہلی بار عملی طور پر نافذ کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اتحادی کمانڈر جنرل شاوز کوپ کو زمینی فضائی جنگ کی اصطلاح پسند نہیں تھی، اس کی وجہ بھی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ موصوف خاصے خود پسند واقع ہوئے تھے مگر یہ ماننے سے ان کا کیا نقصان ہوتا ہے کہ سٹیری اور موریلی پردے کے پیچھے بیٹھے ہوئے وہ موسیقار تھے جنھوں نے ایک دہائی قبل فوجی اتحاد کی کامیابی کی دھن مرتب کی تھی۔

عالمی سطح پر فوجی نظریات میں تبدیلیوں کا عمل جاری ہے، لیکن اگر ہم غور سے سنیں تو الفاظ خواہ چینی، اطالوی، فرانسیسی یا روسی زبان ہی کے کیوں نہ ہو، ان کا مرکزی نکتہ زمینی فضائی جنگ یا اس کے تحت ہونے والی کاروائیوں کے کے خطرے تک محدود ہوگا۔

موریلی سے جب ہماری پہلی بار ملاقات ہوئی، وہ اس وقت تک یہ سمجھ چکا تھا کہ معیشت اور معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کا عمل فوج میں بھی جاری وساری ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں، علم کو اقتصادی قدر کی پیداوار میں کلیدی حیثیت حاصل ہوچکی ہے۔ موریلی اور سٹیری نے جو کچھ کیا یہ تھا کہ انہوں نے جنگ آزمائی کے لئے یعنی علم ہی کو خاموشی کے ساتھ مرکزی حیثیت دینے کا ڈول ڈال دیا۔ یوں ہمارے سامنے یہ بات آئی اور خلیج کی جنگ میں ہم نے دیکھا کہ تیسری لہر کی جنگ آزمائی میں بھی ترقی یافتہ معیشت کے بہت سے نکات شامل ہوگئے ہیں۔

جب ہم نئی جنگی صورت اور نئی معیشت کا موازنہ کرتے ہیں تو ہمیں ان دونوں میں حیرت انگیز مماثلت نظر آتی ہے۔

تباہی کے اجزاء:

جس طرح پیداواری معاملات میں خام مال یا محنت کی اہمیت سے انکاری ہونا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں ہے، بالکل اسی طرح تباہی کے عمل کے لئے سازوسامان کی ضرورت کو نظرانداز کرنا بھی احمقانہ طرزعمل ہوگا۔

کسی دور میں بھی جنگ میں علم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا گیا۔

لیکن بہرحال اب ایک ایسا انقلاب برپا ہو رہا ہے جس نے علم کو مختلف قسم کے قالب

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں ڈھال کر فوجی قوت کا سرچشمہ قرار دے دیا ہے۔ پیداوار اور تباہی کے لئے علم نے اب دیگر اجزاء کی فراہمی کی ضرورت کم کر دی ہے۔

ایلن ڈی کیمپز لکھتا ہے، ''خلیج کی جنگ ایسی لڑائی تھی جہاں کمپیوٹر میں موجود ایک آؤنس سِلّی کون (چپ جو کمپیوٹر کی تیاری میں بنیادی جزو کا کام دیتا ہے) ایک ٹن یورینیم سے زیادہ اثر آفرین ثابت ہوسکتا تھا۔ کیمپن کو یہ معلوم ہونا ہی چاہیے تھا۔ اس لئے کہ وہ فضائیہ کا ریٹائرڈ کرنل ہے اور امریکہ کے محکمہ دفاع میں کمانڈ اور کنٹرول پالیسی کا ڈائریکٹر رہ چکا ہے۔ اب وہ افواج کی مواصلاتی اور الیکٹرانک ایسوسی ایشن میں خدمات انجام دے رہا ہے۔ وہ ''فرسٹ انفرمیشن آف وار'' نامی کتاب کا مصنف/ایڈیٹر بھی ہے۔ یہ کتاب خلیج کی جنگ کے متعلق فنی تحریروں کا ایک قابل قدر مجموعہ ہے اور نیچے دیئے ہوئے بہت سے اعداد و شمار اسی سے حاصل کئے گئے ہیں۔

اس میں وہ کہتا ہے، ''ہتھیاروں اور جنگی داؤ پیچ کے مقابلے میں علم کہیں زیادہ اہمیت اختیار کر چکا ہے اور اس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ کمان اور کنٹرول کے ذرائع کو تباہ کر کے دشمن کو گھٹنوں کے بل جھکنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔''

جنگ آزمائی میں علم کے جزو کی بڑھتی ہوئی اہمیت کا ایک اشارہ کمپیوٹرائزیشن کے عمل میں نظر آتا ہے۔ کمپین کے بیان کے مطابق ''جنگ آزمائی کا ہر پہلو اب خودکار ہے جس میں معلومات کے بڑے بڑے ذخیروں کو جمع کرنے اور مختلف شکلوں میں ان کی ترسیل کی اہلیت پیدا کرنے کا کام بہت ہے۔'' اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ڈیزرٹ سٹارم نامی جنگ کے خاتمے کے جنگی علاقے میں ایسے تین ہزار کمپیوٹر موجود تھے جن کا امریکہ کے کمپیوٹروں سے رابطہ تھا۔

ٹی وی سکرین پر پبلک نے طیارے، بندوقیں اور ٹینک تو دیکھے مگر نظر نہ آنے اور محسوس نہ کئے جانے والی معلومات کے اس بہاؤ کو وہ نہ دیکھ سکے جس کی اب نہایت معمولی جنگی کارروائیوں کے دوران میں بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کمپین متوجہ کرتا ہے۔ ''اب مقامی سطح کی بیشتر کارروائیاں ہوائی اڈوں پر خود طریقوں سے انجام پاتی ہیں۔ سامان کی فراہمی اور دیکھ بھال کی ذمہ داریاں بھی کمپیوٹروں کی مدد سے روٹین کے طور پر پوری کر دی جاتی ہیں۔''

فوجی معلومات کا ماہر میجر ٹی بے گبسن لکھتا ہے، ''کمان کی اعلیٰ سطح پر دشمن کی فوجوں کی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نقل و حرکت اور طاقت کا اندازہ اور تجزیہ کمپیوٹروں کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ ہر جنگ کے اس کھیل میں طریق کار کے تعین کے لئے خصوصی خفیہ رپورٹروں، نقل و حرکت کے پیمانوں اور ذاتی اطلاعات کی بنیادوں پر کاروائی کے لئے بھی کمپیوٹروں کی فراہم کردہ تفصیلات پر ہی انحصار کیا جاتا ہے۔

جنگ کے دوران خلیج کے آسمانوں پر اطلاعات کی فراہمی کے دو انتہائی طاقتور ہتھیار محو پرواز رہے۔ یہ تھے آرائس اور جے سٹارڈ، بوئینگ 707 قسم کے طیارے بھی کمپیوٹروں، مواصلاتی آلوں، ریڈار اور دیگر سازوسامان سے لدے پھدے تیار رہتے تھے۔ اواکس (فضائی وارننگ اور کنٹرول سسٹم) طیارے آسمانوں کی پہنائیوں میں 360 ڈگری پر ہر سمت میں دشمن کے طیاروں میزائلوں کا سراغ لگانے اور ان سے مقابلہ کرنے کے لئے فضائی اور زمینی عملہ کو معلومات مہیا کرنے کے لئے ہر سمت چھان پھٹک میں مصروف رہتے۔ زمین پر اس کا متبادل جے سٹارڈ (مشترکہ نگرانی اور ہدف ڈھونڈنے والا ریڈار سسٹم) تھا۔ یہ زمینی کاروائیوں کی نگرانی اور چھان پھٹک کی ذمہ داریاں پوری کرتا تھا۔ زمین پر دشمن کی عقبی افواج کو ڈھونڈنے، منتشر کرنے اور تباہ کرنے کے مقاصد کے حصول ہی کے لئے یہ جہاز ڈیزائن اور تیار کیا گیا تھا اور یہ وہی مقصد تھا جس کا خواب سٹیری نے دیکھا تھا۔

امریکی فضائیہ کے میجر جنرل ٹامس ایس سدام نے اپنی نیلی ٹوپی ہلاتے ہوئے ٹراڈوک کے اس کردار کا ذکر کرتے ہوئے جو اس ادارے نے جے سٹارڈ اور دوسرے سازوسامان کی جو خلیج کی جنگ میں استعمال ہوا کہا تھا، ''جے سٹارز طیارے زمینی کمانڈروں کو دشمن کی نقل و حرکت کی ہو بہو وہی تصویر مکمل طور پر پیش کرتے ہیں جس طرح وہ 155 میل کے فاصلے پر وقوع پذیر ہو رہی ہوتی ہیں اور یہ کام وہ ہر قسم کے موسمی حالات میں انجام دیتے ہیں۔''

اس جنگ میں دو جے سٹارز طیاروں نے 49 پروازوں میں حصہ لیا۔ ان میں انہوں نے ایک ہزار اہداف کی نشان دہی کی جن میں حرکت کرتے ہوئے بکتر بند گاڑیوں کے دستے، ٹینک، ٹرک، مسلح فوجیوں کو ڈھونے والی گاڑیاں اور توپ خانوں کا سامان شامل تھا۔ انہی دو طیاروں نے 750 جنگی جہازوں کو کنٹرول بھی کیا۔ سوالم نے بتایا کہ ''جے سٹارز کی ہدایت پر حملہ کرنے والے طیاروں کو پہلی کوشش ہی میں ان کے فراہم کردہ اہداف ڈھونڈنے میں کامیابی کا تناسب 90 فیصدی رہا۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اتحادی فوجیں جس وقت معلومات حاصل کرنے ان کا تجزیہ کرنے اور ان معلومات کو متعلقہ حلقوں تک پہنچانے کے کام میں مصروف ہوتیں تو اس کے ساتھ ہی وہ دشمن کی اپنی حاصل کردہ معلومات اور اس کی مواصلاتی اہلیت کو تباہ کرنے کا عمل بھی جاری رکھتیں۔ پینٹاگون کی طرف سے خلیج کی جنگ کی کارکردگی کی جو پہلی رپورٹ امریکی کانگریس کو بھیجی گئی تھی اور جسے کاڈر پورٹ کے نام سے یاد کیا جاتا اہے وہ اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ امریکی فوج نے ابتدائی حملوں میں مائیکرو ٹاورز، ٹیلیفون ایکسچینج، سوئچ رومز، فائیبر آپٹک کی گرہوں اور مواصلاتی تاروں کے مراکز پلوں کو نشانہ بنایا تھا۔اس کا نتیجہ یا تو ان کی خاموشی کی صورت میں ظاہر ہوا یا پھر اس کی وجہ سے عراقی اپنا ایسے طور طریقے اختیار کرنے پر مجبور ہوئے جن کے نتیجے میں قیمتی خفیہ معلومات کا حصول ممکن ہوا اور ان کی مدد سے صدام حسین کی فوجی اور سیاسی کمان کے مراکز کو بھی براہ راست نشانہ بنایا جاتا رہا، اس کا مقصد عراقی لیڈرشپ کو تباہ یا الگ تھلگ کرنے کے علاوہ میدان جنگ میں مصروف کار اس کے فوجیوں سے اسے علیحدہ کرنا تھا۔

دوسرے لفظوں میں عراقی فوج کے ذہن اور اعصابی نظام کو مفلوج کرنا اتحادیوں کا اصل کام تھا۔ جنگ کے دوران اگر کسی وقت سرجری کی ضرورت محسوس کی گئی تو اس کا تعلق بھی دماغی چیر پھاڑ سے تھا۔

جیسے جیسے یہ معاملہ لوگوں کی سمجھ میں آتا جاتا ہے، دنیا کے ہر حصے میں اسی حقیقت کو تسلیم کرنے کا احساس بھی فزوں تر ہوجاتا ہے کہ امریکہ، جاپان اور یورپ میں مروج دماغی صلاحیتوں کے بل پر وجود میں آنے والی معیشت، دماغی قوتوں کی بنیاد پر تیار کی جانے والی فوج کی ضرورت اجاگر کر رہی ہے۔ اب تو جیسا کہ جلد ہی ہم دیکھیں گے، کم ترقی یافتہ معیشتوں والے ممالک بھی علم کی بنیاد پر تیار ہونے والی فوج کی ضرورت پوری کرنے کے لئے بھاگ دوڑ میں بری طرح مصروف ہیں۔

اس نئی سوچ کی اصل روح کا اظہار شاید مراکش کی ایک سماجی کارکن، عورتوں کے حقوق کی نمایاں علمبردار اور جغرافیائی لحاظ سے امریکہ مخالف فاطمہ مرنیسی کے ان الفاظ میں سامنے آتا ہے کہ ''مغرب کی برتری اس کے فوجی ساز وسامان کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ اس کے فوجی اڈے لیبارٹریوں کی شکل اختیار کرچکے ہیں اور اس

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی فوجیں ان کے دماغ اور انجینئر تحقیقاتی مواد کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔''

ہوسکتا ہے آئندہ ایسا وقت بھی آ جائے کہ فوجی لوگ بندوق کی جگہ زیادہ تر کمپیوٹر اٹھائے پھرتے نظر آئیں۔ اس سمت میں امریکہ کے لئے محکمہ دفاع 1993ء میں حقیقتاً پیش رفت کا آغاز کر دیا گیا تھا جب اس نے تین لاکھ کمپیوٹروں کی خریداری کا ٹھیکہ دیا تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ تباہی پھیلانے کا بنیادی ذریعہ بھی اب علم میں ہے، بالکل ایسے ہی جیسے کہ یہ پیداوار کا بنیادی ذریعہ ہے۔

2- غیر مرئی اقدار:

سٹیری اور موریلی کے اس دعوے کو اگر درست تسلیم کر لیا جائے کہ جنگ میں کامیابی کے لئے پہل کرنے، خفیہ معلومات کے صحیح حصول اور مواصلات کے بہتر نظام اور کام کی لگن کے جذبے سے سرشار بہتر طور پر تربیت یافتہ سپاہیوں کی اہمیت، محض عددی برتری کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے تو پھر فوجی توازن کے تعین کے لئے دوسری لہر کے جرنیلوں میں مقبول نظریے یعنی گنتی میں آسان اجزا پر انحصار کی بجائے غیر مرئی اور شمار میں نہ آنے کے قابل اجزاء پر زیادہ انحصار کرنا پڑے گا۔

تجارت میں جس طرح حساب فہمی کے فرسودہ طریقے رائج ہیں، اسی طرح فوجی لٹریچر بھی پیچیدہ اور ایسے مقداری فارمولوں سے بھرا پڑا ہے جو فوجوں کا تقابل، ان کی تعداد اور ان کے پاس موجود ہتھیاروں کی تعداد سے کرتے ہیں۔ سٹریٹیجک سٹڈیز کے بین الاقوامی ادارے کا شمار، فوجی اعداد وشمار کی فراہمی کے سلسلے میں دنیا کے ممتاز اور مستند ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے فوجی منصوبہ ساز اور میڈیا سے منسلک لوگ اس کے سالانہ شمارے فوجی توازن کا بڑے غور سے مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ اس قسم کے اعداد وشمار سے لدا ہوتا ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک کی افواج میں سے کس کے پاس کتنے افراد، ٹینک، ہیلی کاپٹر، گاڑیاں، طیارے، راکٹ یا سب میرین موجود ہیں۔ خود ہم نے اعداد وشمار کیلئے زیادہ تر اسی ادارے کی فراہم کردہ اطلاعات پر تکیہ کیا ہے لیکن یہ بھی اس میدان میں بڑھتی ہوئی غیر محسوس اقدار کی نہایت معمولی سی نشان دہی کر سکا ہے۔ ہوسکتا ہے، مستقبل میں یہ ادارہ بھی یہ بتانے کے قابل ہو سکے کہ ہر فوج کے پاس کتنے کمپیوٹروں اور مواصلاتی ساز وسامان کی کتنی قوت موجود

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔

''قدر'' کے تعین کی جنگ اور تجارت دونوں میں جن طریقوں سے پیمائش کی جاتی ہے، وہ نئے حقیقتوں سے کہیں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

3- کثرت پیداوار کے برعکس:

1982ء میں جب ہم موریلی سے پہلی بار ملے تھے تو اس نے یہ بات نوٹ کر رکھی تھی کہ اپنی کتاب ''نئی لہر'' میں ہم نے ''ڈی ماسیفکیشن'' یا کثرت پیداوار کے نظریے کے برعکس ایک نیا تصور پیش کیا تھا۔

''لیکن'' اس نے کہا، ''اس میں آپ لوگ ایک بنیادی نکتہ فراموش کر گئے اور وہ یہ کہ معیشت اور معاشرے میں جب بڑے پیمانے کی جانے والی پیداوار کا طریقہ رڈ ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فوج میں بھی اب ایسی ہی صورت حال سامنے آنے والی ہے......''

اس ملاقات میں موریلی نے ایک ناقابل فراموش فقرہ بھی کہا اور وہ یہ کہ ''ہم حرکت میں ہیں اور پیداوار اور تباہی کے امکانات محدود کرنے کی منزل کی طرف گامزن ہیں، کثرت پیداوار کے نظریے کے برعکس نظریے کے ساتھ ساتھ تباہی و بربادی کو محدود رکھنے کا عمل بھی متوازی سطح پر جاری رہے گا......''

ملبوسات کی صنعت میں محدود پیداوار کا مطلب اگر کمپیوٹر کی مدد سے لیزر کنٹرول کے ذریعے انفرادی لباس کی کٹنگ کا کام لینا ہے تو میدان جنگ میں یہ لیزر کو انفرادی ہدف کی نشاندہی کے لئے کام میں لانے کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

دواسازی کی صنعت اگر کوئی ایسا مواد تیار کرتی ہے جو بیماری کی نشان دہی کر سکتا ہو تو اسے کسی ایسے مقام سے جسم کے اندر داخل کر کے بیماری کے مادے کو تباہ کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے جہاں سے اس کا دخول ممکن ہو۔ بالکل اسی طرح دفاعی صنعت ایسا کروز میزائل تیار کرتی ہے جو ایک عراقی بنکر کو ڈھونڈنے اور شناخت کرنے کے بعد اس کے دروازے کے راستے اندر داخل ہو کر اسے تباہ کر سکتا ہے۔ معیشت کے شعبے میں سمارٹ اوزاروں کی موجودگی کا مطلب یہ ہے کہ جنگ کے لئے اس کے تیار کردہ ہتھیار بھی سمارٹ ہوں گے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بعض اوقات ترقی یافتہ ٹیکنالوجی پر قائم شہری معیشتوں کو ناکامی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ میدان جنگ میں ترقی یافتہ ہتھیار بھی اسی طرح بعض اوقات فیل ہو جاتے ہیں۔ اس میں متنازعہ مگر نہایت زبردست پیٹریاٹ میزائل بھی شامل ہے، حتیٰ کہ خلیج کی جنگ کے دوران اور اس کے بعد1993ء میں صدر کلنٹن نے جب عراق کے جاسوسی کے ہیڈکوارٹر پر حملے کا حکم دیا تو ''ٹوماہاکی'' کے بارے میں پتہ چلا کہ اس کی تیاری میں کچھ نقائص رہ گئے ہیں جس کی وجہ سے اس پر کلی طور سے انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ ہتھیار بنانے والے عام طور سے اپنے بنائے ہوئے مال کی کارکردگی کے ذکر میں مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ بہرحال تبدیلی کی سمت تو واضح اور غیر متنازعہ ہے، مگر مقاصد بہتر سے بہتر طریقوں کے ساتھ صحت اور درستگی اور قوت انتخاب کا حصول ہے۔

مائیکرو الیکٹرانک بنیاد پر ترتیب دی جانے والی معیشت کی طرح اسی بنیاد پر تیار کئے جانے والے سمارٹ ہتھیاروں کے ذریعے آواز، حدت، ریڈار سے خارج ہونے والے مادوں اور دوسرے تمام برقی سگنلوں سے حاصل ہونے والے حقائق کو طاقت ور اور تجزیے کی صلاحیت سے مالامال سوفٹ ویئر کے ذریعے اب خصوصی ہدف کی نشاندہی اور تباہی ممکن ہوگئی ہے۔

یہ جاننے کے لئے کہ متذکرہ نئی صلاحیتیں، کس قدر حیرت انگیز ہیں، ماضی پر مختصر نظر ڈالنا سودمند ہوگا۔ مثال کے طور پر1881ء میں برطانوی فوج نے سکندریہ کے قریب ایک مصری قلعے پر تین ہزار گولے برسائے ، ان میں سے صرف دس صحیح ہدف پر گرے۔

حالیہ زمانے یعنی ویت نام کی جنگ کے دوران میں امریکی پائلٹوں نے تھانہ ہوآ ، پل کو تباہ کرنے کی کوشش میں500 ناکام فضائی حملے کئے جن میں دس بمبار طیاروں کی تباہی بھی ہوئی۔ بعد میں 4عدد ایف چار طیاروں نے جو''سمارٹ'' ہتھیاروں کی تیاری کے ابتدائی زمانے کے تیارشدہ کچھ بموں سے لیس تھے، ایک ہی حملے میں اس پل کا کام تمام کر دیا۔

ویت نام کی جنگ میں کسی امریکی ایم60 ٹینک کا حملہ اس کو رو کے، اس کے لئے ''کور'' حاصل کئے بغیر اور ہدف پر شست باندھے بغیر فائر نہیں کھول سکتا تھا۔ ٹینکوں کی لڑائی پر والف پیلین کے بیان کے مطابق اس زمانے میں رات کے وقت دو ہزار گز کے فاصلے پر واقع کسی ہدف کو نشانہ بنانے کے امکانات قریب قریب معدوم تھے لیکن اج ایم۔ ٹینک

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عملہ کے بغیر نشانے پر گولے پھینک سکتا ہے۔ رات کو دیکھنے کی صلاحیت پیدا کرنے والے لیزروں اور کمپیوٹروں کے ذریعے مدت، ہوا اور دوسری رکاوٹیں خودکار طریقوں سے دور ہوجاتی ہیں اور یہ امر یقینی ہوجاتا ہے کہ رکاوٹوں کے باوجود 10 میں سے 9 اہداف پر نشانہ صحیح لگے گا۔

ایک عدد ایف 117 بمبار طیارے سے ایک فضائی حملے میں ایک بم گرانے سے آج وہی مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں جن کے حصول کے لئے دوسری جنگ عظیم کے دوران بی 17 بمباروں کو ساڑھے چار ہزار فضائی حملوں میں 9 ہزار بم گرانے پڑتے تھے یا ویت نام کی جنگ کے زمانے میں 95 فضائی حملوں میں 190 بموں کو گرانے کی ضرورت ہوتی تھی۔

رینڈ کارپوریشن میں صحت اور درستگی سے کام لینے والے ہتھیاروں کے ماہر جیمز ایف ڈگ بائی کا بیان ہے، ''یہ سب کچھ کیسے ممکن ہوا؟ یہ یوں ممکن ہوا کہ اب جو ہتھیار تیار کئے جا رہے ہیں ان کی بنیاد ان کی آتش زنی کی قوت کی بجائے صحیح ضرورت اور صحیح معلومات پر ہوتی ہے۔ اس طرح ٹنوں بارود میدان جنگ میں پہنچانے کی مشقت سے بھی نجات مل جاتی ہے۔'' یہ الفاظ ان تاجروں کی صداؤں میں گھل مل جاتے ہیں جو خام مال کی بچت کے لئے کمپیوٹروں سے مدد لیتے ہیں اور پیداوار کا حجم کم کر کے ساز و سامان کی فہرستوں اور باربرداری کے اخراجات میں کمی کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جہاں تک ہم دیکھ سکتے ہیں، وسیع پیمانے پر تباہی کا سلسلہ فی الحال جاری رہے گا۔ ہتھیاروں کے غلط استعمال اور اس ضمن میں مہلک غلطیوں کا احتمال بھی اس وقت تک باقی رہے گا جب تک جنگوں کے امکانات باقی رہتے ہیں لیکن کثرت پیداوار کے زمانے کے مقابلے میں محدود پیداوار کے دور میں جنگ کے میدان میں تباہی اور نقصان کی شدت میں کمی کے آثار بڑھتے ہوئے ضرور نظر آئیں گے، بالکل اسی طرح قومی معیشت میں بھی اس قسم کی صورت حال ابھرتی ہوئی دکھائی دے گی۔

4- کام:

اب تک یہ بات عام طور سے طے شدہ سمجھی جاتی ہے کہ نئی سمارٹ معیشت کے لئے سمارٹ کارکن لازمی ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں۔ جسمانی قوت پر انحصار جیسے جیسے کم ہوتا جاتا ہے،

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کثیر تعداد میں کام کرنے والے غیر تربیت یافتہ کارکنوں کی جگہ کم تعداد میں مگر اعلیٰ تربیت یافتہ ہنرمندوں اور سمارٹ مشینوں کو پیداواری میدان میں لایا جا رہا ہے۔

فوج میں بھی متوازی سطح پر یہی طریق کار اختیار کیا جا رہا ہے۔ وہاں سمارٹ ہتھیار سمارٹ سپاہیوں کی خدمات کے طلب گار ہوتے ہیں۔ کم تعلیم یافتہ فوجی پہلی لہر کے زمانے کی یادگار دست بدست لڑائی میں تو ضرور حصہ لے سکتے ہیں لیکن تیسری لہر کے زمانے کی افواج میں یہ سپاہی محض بوجھ بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہی معاملہ معیشت کا ہے، تیسری لہر کے دور کی صنعت کے لئے جاہل اور بے خبر کارکن بوجھ ہی بن سکتے ہیں۔

یہ خیال کہ خلیج کی جنگ میں جو بلاشبہ ٹیکنالوجی کے بل پر لڑی گئی، انسانی پہلو کو بالکل نظرانداز کیا گیا، محض مفروضہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اتحادیوں نے خلیج میں جو افواج بھیجی تھیں ان کا شمار بہترین تعلیم یافتہ، فوجیوں اور فنی ماہروں پر مشتمل فوجوں میں کیا جا سکتا ہے جن کے مقابلے کی افواج آج تک کسی میدان جنگ میں اتاری ہی نہیں گئیں۔ ان میں سے بیشتر کی تربیت، سٹیری کے قائم کردہ ادارے، ٹراڈوک میں کی گئی زمینی فضائی جنگ کے نظریے کی بنیاد پر اس نئی قسم کی جنگ کی تیاری میں امریکی افواج نے کم از کم دس برس صرف کئے تھے۔

ترقی یافتہ افواج کی صفوں میں بھی البتہ ابھی تک اخلاقی کمزوریاں موجود ہیں، جیسا کہ امریکی بحریہ کے بدنام ٹیلی ہک کنونشن میں عورتوں سے بدسلوکی کے واقعات یا فوجی صفوں میں ہم جنس پرستی کے قصے ابھی تک سامنے آ رہے ہیں لیکن جنگ کی بدلتی ہوئی نوعیت نے پرانی قسم کی فوجی مشینری اور اندھی قوت کے مقابلے میں بلاشبہ تعلیم کی اہمیت اور مہارت کے حصول پر کہیں زیادہ توجہ دینے کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

نئی فوج کو یقیناً ایسے سپاہیوں کی ضرورت ہے جو اپنا دماغ استعمال کر سکیں۔ عام لوگوں اور تہذیبوں کے درمیان موجود امتیاز کی پاسداری کر سکیں، ابہام برداشت کر سکیں، پہل کر سکیں، سوال پوچھ سکیں، حتیٰ کہ اپنے اعلیٰ حکام سے باز پرس کرنے سے بھی گریز نہ کریں۔ سٹیون ڈی سٹارک ''لاس اینجلس ٹائمز'' میں لکھتا ہے، ساٹھ کے عشرے کے ذمرے ''اتھارٹی سے سوال پوچھو'' نے غیر متوقع مقامات تک جڑیں پکڑ لی ہیں۔ وہ امریکی فوج کے بدلے ہوئے کردار کی وضاحت کر رہا تھا۔ سوال پوچھنے کی روایت شاید آج بھی بہت سے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صنعتی اور تجارتی اداروں کے مقابلے میں امریکی فوج میں کہیں زیادہ موجود ہے۔

یہ بات بھی یقینی ہے کہ ان دنوں اعلیٰ تعلیم کا رجحان امریکی تجارت کی اعلیٰ ترین سطح کے مقابلے میں امریکی افواج میں کہیں زیادہ ہے۔ تخلیقی لیڈرشپ کے مرکز واقع نارتھ کیرو لائنا کے ایک حالیہ سروے کے مطابق جہاں امریکہ کے اعلیٰ ترین منیجمنٹ سے متعلق افراد میں سے صرف 19 فیصدی کے پاس پوسٹ گریجویشن کی ڈگریاں ہیں وہاں 88 فیصدی بریگیڈیئر جنرل اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔

پائلٹوں میں بھی تربیت کی سطح ابتدائی زمانے کے مقابلے میں اب کہیں زیادہ بلند ہے، دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں نوجوان پائلٹوں کو کاک پٹ میں چند گھنٹے گزارنے کے بعد ہی جنگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔ آج ایف 15 طیارے کے ایک پائلٹ کی تربیت پر لاکھوں ڈالر خرچ کیئے جا رہے ہیں اور اس تیاری کے لئے دن اور مہینے نہیں برسوں درکار ہوتے ہیں۔

امریکی فضائیہ کے ایک افسر کے الفاظ میں ''ہتھیار محض اس حد تک سمارٹ ہوتے ہیں جس حد تک کہ ان کو استعمال میں لانے والے'' پائلٹ فی زمانہ کاک پٹ میں فرائض انجام دینے والا واحد فرد نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک وسیع، پیچیدہ، باہمی طور پر متاثر کرنے والے سسٹم کا حصہ ہوتا ہے جسے اواکس طیاروں کے ریڈار آپریٹروں کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے جو اسے دشمن کے پہنچنے کی فوری اطلاع دیتے ہیں اور اس کام میں انہیں الیکٹرانک ذرائع سے جنگ آزمائی، اس کی مخالفانہ کاروائیوں اور خفیہ اطلاعات کے اداروں کی مدد بھی حاصل ہوتی ہے۔ ڈیٹا جمع کرنے اور اس کا تجزیہ کرنے والے اور مواصلات کے رابطے قائم کرنے والے بھی اس کام میں ان کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ کاک پٹ میں بیٹھے ہوئے پائلٹ کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ اس وسیع مواد کی چھان پھٹک کر کے یہ اندازہ قائم کرے کہ لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی اس صورت حال میں وہ اپنے تئیں کہاں فٹ کرے۔

فضائیہ کے دو کرنیلوں، روسا نے بیلی اور ٹامس کیرنی کا کہنا ہے کہ ''ٹیکنالوجی کی حد حاصل کرنے کے معاملے میں کامیابی کی بنیاد رکھنے والا اور فیصلہ کن عنصر اس کا انسانی پہلو ہی ہے اور اور یہ بات ڈیزرٹ سٹارم کی جنگ میں اے آئی ایم۔7 لڑاکا طیاروں کے پائلٹوں کی، میزائل استعمال کرنے کی صلاحیتوں سے واضح ہو کر سامنے آئی ہے۔ ویت نام

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی جنگ کے مقابلے میں اس دفعہ اس میں پانچ گنا زیادہ بہتری نظر آئی جو ظاہر ہے کہ بہتر تربیت کا براہ راست نتیجہ تھی جسے خصوصی تربیت ''ریڈفلیگ'' اور ٹاپ گن (مشق) کا نام دیا گیا تھا۔ اسی طرح کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے استعمال کو بہتر بنانے اور صحیح کام کے لئے صحیح آدمی کے انتخاب نے اصلاح احوال کی صورت پیدا کر دی تھی۔

فوج کی نچلی سطح کی کارکردگی کو تعلیمی سطح کی بلندی نے بھی بہتر کیا۔ خلیج کی جنگ میں رضا کارانہ طور پر حصہ لینے والے فوجیوں میں سے 98 فیصدی سے زیادہ گریجویٹ تھے۔ فوجی تاریخ میں یہ تعلیم یافتہ افراد کے تناسب کی سب سے زیادہ شرح ہے، ان میں کچھ ایسے بھی تھے جن کی تعلیمی قابلیت اس سطح سے بھی بلند تھی۔ ویت نام کی جنگ میں جبری بھرتی کے ذریعے لائے جانے والے فوجیوں اور خلیج کی جنگ میں رضا کارانہ طور پر شامل ہونے والوں کے درمیان فرق ہمارے لئے اس وقت علامت کی شکل اختیار کر گیا۔ جب ہم نے ٹیلی ویژن کے ایک رپورٹر کو ٹینک کے سامنے کھڑے ایک افریقی امریکن سارجنٹ کے منہ کے آگے مائیکروفون لہراتے ہوئے دیکھا، رپورٹر نے پوچھا، ''معلوم ہوتا ہے زمینی جنگ شروع ہونے والی ہے، کیا تم خوف زدہ ہو؟''

سارجنٹ نے اس پر نظر ڈالی اور بڑے نپے تلے انداز میں جواب دیا، ''خوف زدہ؟ ہرگز نہیں! البتہ کچھ خدشات ضرور لاحق ہیں......''

یہ محتاط رویہ اور الفاظ کا یہ انتخاب، فوجیوں کی زمینی سطح اور معیار کی پوری طرح عکاسی کرتا ہے۔ غیر ملکی تعلقات کی کونسل میں بحریہ کے فیلو کرنل ڈبلیوسی گریگ سن آج کے لڑاکا سپاہی کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے، ''وہ محض بارود ڈھونے والا خچر نہیں ہے نہ ہی وہ گولیوں سے پُر پیٹی بردار مشقتی ہے۔ وہ جنگ کے جسمانی اور مشینی داؤ پیچ سبھی کو خوب سمجھتا ہے۔ اس میں ہیلی کوپٹر اور نصب شدہ پروں والے جہازوں سے کام لینے کی استعداد موجود ہے اس لئے کہ اکثر اوقات اسے کنٹرولنگ ایجنٹ کے فرائض انجام دینا پڑتے ہیں۔ طیاروں کا رخ متعین کرنے کی ہدایت دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ طیارہ شکن توپوں کے بارے میں بھی علم رکھتا ہے۔ وہ جیومٹری اور فن جہاز رانی کی باریکیوں سے بھی واقف ہے۔ یہی نہیں وہ مارٹر توپوں، بکتر بند گاڑیوں، بارودی سرنگیں بجھانے اور انہیں بیکار بنانے سے متعلق مواد، داؤ پیچ، عمارتیں منہدم کرنے، کمپیوٹروں کو بروئے کار لانے، لیزر سے کام لینے،

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تنصیبات ، سٹلائٹ کے ذریعے مواصلاتی نظام کی باریکیوں اور سپلائی اور نقل و حرکت کے تقاضوں سے بھی آشنا ہوتا ہے۔ تیسری لہر کی لڑائی محض لبلبی دبا کر ٹھاہ کرنے سے کہیں زیادہ ذمہ داریاں نبھانے کی مقتضی ہے۔

عام قوت کار اور جنگی قوت کار، گاڑی کے آگے پیچھے جتے ہوئے گھوڑوں کی طرح ہے، تیسری لہر کی جنگ کے لئے بے مغز فوجی ایسے ہی ہیں جیسے تیسری لہر کی حیثیت کے لئے غیر ہنرمند مزدور جو یقیناً خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ جیسے ہی معیشت ترقی کرتی ہے، ''براہ راست محنت سے'' ''بالواسطہ محنت'' کی طرف تبدیلی کا عمل شروع ہوجاتا ہے، فوج میں بھی یہی کچھ ہوتا نظر آتا ہے۔

فوجی اصطلاحیں تھوڑی مختلف ہوتی ہیں، سپاہی لوگ بالواسطہ اور بلاواسطہ کی اصطلاحیں استعمال نہیں کرتے بلکہ دانت اور دم کی بات کرتے ہیں اور تیسری لہر کی دم اب اتنی لمبی ہو چکی ہے کہ اس سے قبل کبھی نہیں تھی۔

جنرل پیری گیلوئس کا کہنا ہے، ''امریکہ نے خلیج کی جنگ میں 5لاکھ فوجی بھیجے، دو تین لاکھ فوجی امدادی نقل وحرکت ، مقاصد کے لئے متعین تھے مگر حقیقت میں جنگ دو ہزار فوجیوں سے جیت لی گئی۔ دم کا تناسب بہت زیادہ ہو چکا ہے۔'' اس میں کمپیوٹر پروگرام، مرد ،عورتیں اور ان میں سے کچھ پیچھے امریکہ میں اپنے گھروں میں بیٹھے اس عمل میں حصہ لینے والے معروف افراد بھی شامل تھے۔

5- اختراعات:

خلیج کی جنگ کی دوسری اہم خصوصیت، فوجیوں اور شہریوں سبھی کی طرف سے پہل کرنے کی کاروائی کا معیار تھی۔ کرنل ایلن کمپسن کے بیان کے مطابق 24 فروری1991 کو سعودی سرحد پار نے کے لئے تیار کھڑے امریکی فوجیوں کو کمپیوٹر کی رہنمائی میں جو معلومات مہیا تھیں، چھ ماہ قبل جب عراق نے کویت پر حملہ کیا تھا ان کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے کمپسن بتاتا ہے، ''یہ چند جدت پسندوں کی اختراع تھی جنہوں نے موقعہ کی نزاکت بھانپتے ہوئے قواعد میں ردوبدل کر کے، نوکرشاہی کو مات دیتے ہوئے اور ہتھیاروں اور سافٹ ویئر کی مدد لیتے ہوئے بروقت کاروائی کے ذریعے فوری نتائج حاصل

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کر لئے تھے۔''

اور پھر یہ معلوم ہونے کے بعد کہ کمپیوٹروں اور مواصلاتی ساز وسامان کے پہنچنے میں ابھی بہت وقت ہے اس وقت تک موجود تمام پیچیدہ نظاموں کو فنی ماہروں کی مدد سے نیٹ ورک کے ذریعے موقعہ پر یکجا کرنے اور غیر روایتی فوجی اور شہری معلومات کی مدد سے مطلوبہ مقاصد حاصل کر لئے گئے۔

اس نوع کی متعدد داستانوں کی بازگشت خلیج کے علاقے میں سنائی دیتی رہی۔ فوجیوں کے ازخود فیصلے کرنے کے عمل کو سراہا بھی گیا حالانکہ یہ بات فوجی روایات کے بالکل برعکس ہے۔ فوج سے باہر مقابلے میں معروف صنعتی اور تجارتی کمپنیوں میں بھی کچھ اس قسم کی صورت حال دیکھنے میں آ رہی تھی۔

6- حجم:

حجم بھی متوازی طور پر تبدیل ہو رہا ہے۔ متعدد ملکوں کے (گو سب کے نہیں) فوجی بجٹ میں کٹوتی کی وجہ سے کمانڈروں کو فوج کی نفری کم کرنے کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ کچھ دوسرے دباؤ بھی اس سمت کی طرف جانے کا اشارہ دے رہے ہیں۔ فوجی امور کی سوچ سے بہرہ ور لوگوں پر یہ منکشف ہو رہا ہے کہ چھوٹے یونٹ (جیسے معیشت کے میدان ہیں، نحیف اور لاغر کمپنیاں'' جو باہمی مقابلے میں مصروف ہیں) سرمائے کا بہتر بدل پیش کر سکتے ہیں۔

رجحان اب ایسے ہتھیاروں کی تیاری کی طرف ہے جن کی آتش باری کی قوت زیادہ ہو مگر جنہیں استعمال کرنے کیلئے کم سے کم افرادی قوت سے کام چل سکتا ہو، امریکی بحریہ کے ایڈمرل پال ملر کی جو اطلانتک کمان کے کمانڈر ان چیف ہیں رہنمائی میں فوجوں کی تعداد میں کمی اور لچک دار طریقے سے صف بندی کے تجربات جاری ہیں۔

کچھ عرصہ قبل تک دس ہزار سے اٹھارہ ہزار تک جوانوں پر مشتمل ڈویژن کو اب چھوٹے سے چھوٹا لڑاکا یونٹ تصور کیا جاتا تھا جسے ایک مقررہ مدت کیلئے اپنے طور پر محاذ آرائی کی پوزیشن کے قابل سمجھا جاتا تھا۔ امریکی روایات کے مطابق اس کی تشکیل اس طرح کی جاتی کہ اس میں تین سے چار بریگیڈ ہوتے جن میں سے ہر ایک میں دو سے پانچ تک بٹالین

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بمعہ متعدد امدادی عناصر اور ہیڈکوارٹر کے عملے کے شامل ہوتیں۔ مگر اب ایسا وقت آ رہا ہے جب تیسری لہر کے زمانے کا چار سے پانچ ہزار فوجیوں پر مشتمل ایک بریگیڈ وہ سب کچھ کرنے کے قابل ہوگا جس پر عمل کرنے کے لئے ماضی میں پورے ڈویژن کی خدمات درکار ہوتی تھیں۔ اب بہت چھوٹے لیکن موزوں طور پر مسلح زمینی یونٹ بریگیڈ کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل ہو جائیں گے۔

شہری معیشت میں بھی اسی طرح گنتی کے چند لوگ بہتر ٹیکنالوجی کی مدد سے ماضی کی اندھی قوت کے زمانے میں کام کرنے والے بہت زیادہ لوگوں کے مقابلے میں کہیں بہتر نتائج حاصل کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے۔

7- تنظیم:

فوجی حکومت کے اداروں کے تنظیمی ڈھانچوں میں بھی تجارتی دنیا میں جاری تبدیلیوں کے متوازی تبدیلی کا یہ عمل برابر جاری ہے۔ امریکی فضائیہ کے سیکرٹری ڈونا لڈرائس نے فضائیہ کی تنظیم نو کا اعلان کرتے ہوئے یہ وضاحت کی کہ اب ایٹمی ہتھیاروں پر انحصار کم کر کے ایسے لچک دار رویے اپنانے پر توجہ دی جا رہی ہے جو مقامی کمانڈروں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری کے مواقع فراہم کرے گا۔ ''فضائی اڈے کے کمانڈر کو اپنے دائرہ کار میں سبھی اختیارات حاصل ہوں گے۔ حتیٰ کہ بمبار طیاروں، موسمی پیش گوئیاں کرنے والوں اور ریڈار جام کرنے والے طیاروں پر بھی اس کی حکمرانی ہوگی۔'' تیسری لہر کے زمانے کی تجارت کی طرح فوج میں اوپر سے نیچے تک کے سخت کنٹرول سے نجات حاصل کر رہی ہے۔

فضائیہ کا ایک سابق جرنیل پیری سمتھ جو طویل منصوبہ بندی کا انچارج تھا۔ سی این این کے ناظرین میں اس وقت زبردست مقبولیت حاصل کر گیا جب خلیج کی جنگ کے دوران اس نے اپنے مخصوص انداز سے کمنٹری نشر کرنا شروع کی۔ ایک نشریے میں اس نے بتایا، ''اب جبکہ پینٹاگون کو کمانڈ، کنٹرول اور مواصلات کی ایسی بے پایاں سہولتیں حاصل ہیں جن کی مدد سے اسے دنیا کے کونے کونے میں متعین ہماری افواج سے فوری رابطہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہے...... اکثر لوگ یہ سوچ رہے تھے کہ ان حالات میں آئندہ تمام جنگوں کا کنٹرول براہ راست پینٹاگون کے پاس ہوگا۔ تاہم خلیج کی جنگ میں جو کچھ ہوا، اس کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بالکل برعکس تھا۔''

فیلڈ کمانڈروں کو خودمختاری دے دی گئی تھی، مرکزی ہیڈکوارٹر ان کی مدد ضرور کرتا تھا مگر ان پر حکم نہیں چلاتا تھا۔

یہ اس کے بالکل برعکس تھا جس صورت حال میں امریکہ نے ویت نام کی جنگ لڑی تھی۔ یہ سوویت کے طریق کار سے بھی مختلف تھا جس میں نئے سی تھری 1- سسٹم کے ذریعے اوپر سے نیچے تک کی اتھارٹی کو مضبوط بنا کر عقب سے اگلی کمان کا نام دیا جاتا تھا۔

اختیارات نچلی سطح پر منتقل کرنے کا یہ عمل صدام حسین کی فوج میں رائج طریقوں کی بھی ضد تھا۔ صدام کی فوج کے کمانڈر اوپر سے منظوری کے بغیر کوئی فیصلہ کرنے کے مجاز ہی نہیں تھے۔ تیسری لہر کے زمانے کی فوج اور معیشت دونوں ہی فیصلے لینے کا اختیار تیزی کے ساتھ ممکنہ حد تک نچلی سطح پر منتقل کیا جا رہا ہے۔

8- مستحکم نظام:

فوجی نظام کی روز بروز بڑھتی ہوئی پیچیدگی کی وجہ سے ''رابطے'' کی اصطلاح نے اتنی اہمیت اختیار کر لی ہے جتنی اس سے قبل کبھی نہیں کی تھی۔

فضائیہ کے ''منیجروں'' کو (انہیں اس نام سے پکارا جاتا تھا) خلیج کی جنگ میں غیرمتصادم آسمانوں کا اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ انہیں اس امر کو یقینی بنانا ہوتا تھا کہ اتحادیوں کے جہاز ایک دوسرے کے راستے میں حائل نہ ہوں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے روزمرہ کے فرائض کے طور پر روزانہ ہزاروں فضائی حملوں کے راستوں کی تعین کا کام بھی انہیں کے ذمے تھا۔ کمپسن کے بیان کیمطابق ''ان پروازوں کو نہایت تیزی رفتاری کے ساتھ ایندھن حاصل کرنے کے 122 مختلف راستوں 660 محدود آپریشن کے علاقوں میزائلوں کے استعمال کیلئے مخصوص 312 فضائی شاہراہوں، ضرب لگانے والے 78 مخصوص گوشوں، لڑائی کیلئے پٹرول کرنے والے 92 پوائنٹس اور تربیت کے لئے مخصوص 36 علاقوں میں سے جو 93600 میل تک پھیلے ہوئے تھے، گزرنا پڑتا تھا۔'' اس پر طرہ یہ کہ ان ساری سرگرمیوں کے درمیان مکمل رابطے کا اہتما بھی لازم تھا اور 6 آزاد اقوام کی شہری ہوابازی کے راستے تبدیل کرتے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہنے کی ذمہ داری بھی انہی کی تھی۔

جنگ میں نقل و حرکت کا مسئلہ خاصا پریشان کن ہوتا اہے۔حتی کہ جنگ کے خاتمے پر فوجوں کی واپسی کا کام بہت بھاری ذمہ داری کی حیثیت رکھتا ہے۔خلیج کی جنگ کے خاتمے کے بعد جنرل ولیم جی پیگونس کے کندھوں پر پانچ لاکھ فوجیوں کو واپس امریکہ بھجوانے کا کام تھا ور اس کام میں دس ہزار ٹرکوں، جیپوں اور دوسری گاڑیوں کو دھو دھلا کر دس ہزار ٹینکوں، توپ خانے کے سامان اور1900 ہیلی کاپٹروں کی ٹرانسپورٹ کے فرائض بھی شامل تھے۔ اس سامان پر مشتمل چالیس ہزار سے زائد کنٹینرز میدان جنگ سے بھر کر واپس روانہ کئے گئے۔

حال ہی میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ بڑی بڑی ٹرانسپورٹ کمپنیاں کمپیوٹروں اور فائی سیاروں کی مدد سے نقل و حرکت کی ضرورت کے پیش نظر پیکیج تیار کرنے کے قابل ہوسکی ہیں۔ ہیگونس جو اتفاقیہ نہیں عملاً بزنس ایڈمنسٹریشن کی دو ڈگریاں لے چکا ہے کہتا ہے کہ ”یہ جدید دور کی پہلی جنگ ہے جس میں ہر پیچ کس اور ہر میخ تک کا حساب رکھا گیا ہے۔“

فوج کے لئے یہ سب کچھ جو ممکن ہوا ہے تو یہ محض کمپیوٹروں، اعداد و شمار کے مراکز اور سیٹلائٹ کی وجہ ہی سے ممکن نہیں ہوا بلکہ یہ معجزہ ان سب کے کام کو مربوط کرنے کی وجہ سے رونما ہوا ہے۔

9- انفراسٹرکچر:

تیسری لہر کے زمانے کی تجارت کی طرح اس زمانے کی فوج کو بھی ایک وسیع اور شاخ در شاخ پھیلے ہوئے الیکٹرانک انفراسٹرکچر کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر اس میں استحکام پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔خلیج کی جنگ کے بارے میں بجا طور سے کہا گیا تھا کہ ”مواصلات کی مدد سے فوج کو متحرک کرنے کا فوجی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا۔“

خطے کی کم سے کم استعداد سے شروع کر کے ایک دوسرے سے مربوط نیٹ ورکس کا ایک پیچیدہ سیٹ پوری تیز رفتاری سے تعمیر کیا گیا۔مترے کارپوریشن کے لیری کے ویٹر کے بیان کے مطابق یہ نیٹ ورکس، مواصلات کے لئے، سیٹلائیٹ کے ذریعے 118 متحرک زمینی سٹیشنوں پر انحصار کرتے تھے جن کی مدد پر 12 فضائی سیارے کمربستہ رہتے جو 81 بٹنوں کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ذریعے 329 آوازوں اور پیغام رسانی کے 30 سرکٹوں کو کنٹرول کرتے تھے۔اعداد وشمار مہیا کرنے والے مختلف امریکی مراکز اور نیٹ ورکس کے رابطے بڑے پیچیدہ طریقوں سے میدان جنگ کے ساتھ قائم کرائے گئے تھے جن کے ذریعے روزانہ سات لاکھ ٹیلی فون کالیں اور ایک لاکھ باون ہزار پیغامات کی ترسیل ممکن ہوئی۔تمیں ہزار ریڈیائی نشری رابطوں سے بھی کام لیا گیا۔صرف فضائی جنگ میں 3 کروڑ ٹیلی فون کالوں کی مدد لی گئی۔

اس ''اعصابی نظام'' کے اہتمام کے بغیر اجتماعی کوششوں میں با قاعدہ رابطہ ہرگز ممکن نہ ہوتا اور ایسی صورت میں اتحادیوں کی صفوں میں اتلاف جان بھی کہیں زیادہ ہوتا۔

10- تیز رفتاری:

صدام حسین کے مغربی دفاعی مورچوں کے گرد جنرل شواز کوپ کے کلاسیکی محاصرے کی اہمیت سے انکارنہیں کیا جا سکتا۔ ویسے عراقی منصوبوں کو یوں لپیٹ میں لینے کی پیش گوئی ہر وہ شخص کر سکتا تھا جو نقشے پر نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس کرتا، اگر چہ اس بارے میں صدام کو دھوکہ دینے کی کوششیں بھی ہوئیں اور اسے یہ باور کرا دیا گیا کہ اب سامنے سے حملہ ضروری ہو گیا ہے۔

مگر اس کاروائی میں جو چیز غیر کلاسیکی تھی اور جس نے عراقی کمانڈروں کو حیرت زدہ کر دیا تھا وہ اس کی تیز رفتاری تھی جس کی مدد سے اس معرکے کو انجام تک پہنچایا گیا۔ بظاہر عراقیوں میں سے کسی کو بھی گمان تک نہیں تھا کہ اتحادیوں کی زمینی فوجیں اتنی تاریخی تیز رفتاری سے ان تک پہنچ سکتی ہیں۔ جنگ کی شدت میں یہ تیز رفتاری (اقتصادی سرگرمیوں کی شدت میں اضافے کی طرح) کمپیوٹروں ، جدید مواصلاتی نظام اور فضائی سیاروں کی خدمات حاصل ہونے کی وجہ سے ہو سکی۔

تیسری لہر کے زمانے کی جنگ کے دوران میں غیر معمولی تیز رفتاری کے آثار متعدد دوسرے شعبوں میں بھی دیکھنے میں آئے (مثلاً نقل وحرکت اور مواصلاتی سہولتوں کے تعمیراتی کام میں)۔ اس کے ساتھ ساتھ لڑائی کے بعد بعض امور پر اعتراض اور تنقید بھی سامنے آئی۔ مثلاً یہ کہ جنگ کے دوران خفیہ معلومات کی جہاں اور جب ضرورت ہوتی تھی وہاں تک انہیں پہنچانے کی رفتار سست رہی۔ ایلن کمپسن کا کہنا ہے کہ ''ڈیزرٹ شیلڈ'' کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آغاز ہی میں کویت اور عراق کی صورت حال کے متعلق خفیہ اطلاعات اور اپ ٹوڈیٹ رپورٹوں کی مانگ اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس نے امریکی خفیہ ادارے کی استعداد ہی کو شک وشبے میں ڈال دیا تھا۔"

خلائی سیاروں اور دوسرے ذرائع سے معلومات تو برابر حاصل ہو رہی تھیں مگر ان کے تجزیے کا عمل سست اور ان کو آگے بڑھانے کا مواصلاتی نظام ناکافی تھا۔ عراق کی زمینی افواج کی پوزیشن اور قلعہ بندیوں کی تصاویر تو حاصل ہو رہی تھیں، مگر جن یونٹوں کو ان کی ضرورت تھی وہاں تک یہ بارہ چودہ روز بعد پہنچتی تھیں۔ حالت یہ تھی کہ خفیہ فوجی ذرائع اور تجزیے کے خطرناک مرکز سے حاصل ہونے والی معلومات مختلف کورکمانڈروں اور ڈویژنوں کو دستی ذرائع سے پہنچائی جاتیں یا پھر ہیلی کوپٹر، ٹرک حتیٰ کہ یہ معلومات میدان جنگ تک پہنچانے کے لئے پیدل پیغام رسانوں کی خدمات حاصل کی جاتیں اور یہ یونٹ جن تک رسائی کا مسئلہ تھا، مشرقی امریکہ کے برابر علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔

فضائی مہم کے آغاز کے ساتھ ہی تاخیر کے اوقات میں کمی ہونے لگی۔ اب اس میں تیرہ گھنٹے لگتے۔ صورت حال یوں بہتر ضرور ہوئی مگر رفتار اب بھی کم تھی۔ لڑائی جب شروع ہوئی تو خفیہ معلومات حاصل کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے والے متعدد سسٹم ابھی ترقی کے راستے کے ابتدائی مدارج پر ہی گامزن ہوئے تھے اور کچھ تو ایسے بھی تھے جنہیں جب شرق اوسط بھیجا گیا تو ان کا ڈھانچہ ابھی ابتدائی شکل میں تھا۔

لیکن لڑائی میں محض رفتار ہی اصل مسئلہ نہیں ہوتی بلکہ اصل مسئلہ دشمن کی حرکت کے مقابلے میں اپنی کاروائیوں کی رفتار کا تناسب ہوتا ہے اور اس معاملے میں فاتح فوج کی برتری میں کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہیے۔

ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ اگر امریکی افواج اتنی برق رفتاری سے میدان جنگ میں نہ پہنچ پاتیں تو خفیہ معلومات کی ترسیل میں سست رفتاری کا اس قدر شدید احساس ہی نہ ہوتا۔)

ان کوتاہیوں کے باوجود تجارتی مجلّے "فوربس" نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "امریکہ نے فوجی لحاظ سے فتح حاصل کر لی ہے بالکل اسی طرح جاپانی ہمارے خلاف اعلیٰ ٹیکنالوجی کی مدد سے تجارتی اور صنعتی جنگ میں کامیابی حاصل کر رہے ہیں۔ اس کام میں وہ ایک تیز رفتار چکر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور مقابلے کے داؤ پیچ میں تیز رفتاری کے ذریعے آگے بڑھ رہے ہیں۔

تجارت اور فوج بہرحال یقیناً دو مختلف چیزیں ہیں، مگر جس طریقے سے ہم دولت پیدا کر رہے ہیں بلاشبہ جنگ میں بھی وہی طریقے روبہ عمل لاتے ہیں۔

خلیج کی جنگ میں دو فوجی یعنی دوسری اور تیسری لہر کے زمانے کی فوجوں کے طریقے اختیار کئے گئے۔ عراقی افواج خاص طور سے جب ان کے ریڈار اور نگرانی کا نظام بڑی حد تک بیکار ہوگیا، ایک روایتی فوجی مشین کی طرح تھی اور مشینیں دوسری لہر کے عہد کی اندھی طاقت کا نمونہ ہوتی ہیں......طاقتور مگر کند ذہن۔

اس کے مقابلے میں اتحادی فوج مشین نہیں تھی بلکہ ایک خودکار سسٹم کے تحت کام کرنے والا ادارہ جو مواصلاتی ذرائع اور موقعہ کے مطابق اپنی شکل ڈھالنے کی صلاحیت سے معمور تھا۔ جزوی طور پر ہی سہی مگر یہ تیسری لہر کے زمانے کا ایک ''سوچتا ہوا نظام'' تھا۔

جس وقت اس اصول کو پوری طرح سمجھ لیا گیا، کیا اس وقت فوجی تشدد کا مستقبل ہم پر آشکار ہوگا اور یوں جنگ کے تدارک کے تقاضے جن کی مستقبل کو ضرورت ہوگی سامنے آئیں گے؟

جنگی اقسام کا تصادم

ماضی اور مستقبل کے حوالے سے جو کچھ ہم اب تک دیکھ چکے ہیں، آیئے! اب اس پر غور کرنے کی کوشش کریں۔

یہ خیال کہ ہر تہذیب جنگ آزمائی کے اپنے طور طریقے سامنے لاتی ہے، نیا نہیں ہے۔ پروشیا کے فوجی نظریہ ساز کلازوٹز نے خود اس حقیقت کا انکشاف کیا تھا کہ ''ہر زمانہ اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق جنگ کی خصوصی شکل اختیار کر لیتا ہے......لہٰذا ہر دور کا نظریہ جنگ اپنا ہوگا۔'' معمولی جزئیات کی تفصیل میں جانے کی بجائے کلازوٹز اپنی بات آگے بڑھاتا ہے کہ جو لوگ جنگ کی ضروریات کا ادراک کرنا چاہیے ہیں، انہیں ہر خصوصی دور کے تقاضوں کے مطابق اس کے بنیادی عناصر پر گہری نظر ڈالنی چاہیے۔''

لیکن جس وقت کلازوٹز نے یہ خیال پیش کیا، یعنی صنعتی عہد کے نسبتاً ابتدائی دور میں اس وقت تک جیسا کہ ہم جانتے ہیں، تہذیب کی دو اشکال ہی سامنے تھیں جبکہ ہمیں اچھی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طرح سے علم ہے کہ آج دنیا، طاقت کے دو سطحی سسٹم کی بجائے سہ سطحی سسٹم کی طرف بڑھ رہی ہے جس کے مطابق زرعی معیشتیں انتہائی نچلی سطح پر صنعتی معیشت درمیان میں اور علم کی بنیاد پر تشکیل دی جانے والی تیسری لہر کی معیشت کم از کم وقتی طور پر سب سے اوپر اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیو آسا عالمی معیشت ابھی کچھ اور وقت تک اسی سسٹم کے قبضہ قدرت میں رہے گی۔

اس کا بظاہر نظر آنے والا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ مستقبل میں ہونے والی جنگوں میں بھی انقلابی تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں گی۔ فوجی لحاظ سے یہ امر مسلمہ ہے کہ ہر جنگ دوسری سے مختلف ہوتی ہے لیکن یہ سمجھنے والے بہت کم لوگ موجود ہیں جو یہ اندازہ کرسکیں کہ آنے والے کل کی جنگیں کتنی مختلف ہوں گی اور یہ کہ بڑھتا ہوا تفاوت، قیام امن کی آئندہ کوششوں کے راستے میں کتنی پیچیدگیاں پیدا کرنے کا سبب ہوسکتا ہے۔

جنگ کی مختلف اقسام کے ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کے بارے میں جونہی ہم غور وفکر سے کام لینا شروع کریں گے، تاریخ اور مستقبل کی جنگوں کا تجزیہ کرنے کا ایک مفید اور نیا اوزار ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔

بھالے، مشین گنوں کے مقابلے میں:

کچھ لڑائیوں میں فریقین ایک ہی طریقے سے لڑائی لڑتے ہیں اور دونوں طرف کے لوگ یکساں قسم کے طریقوں پر انحصار کرتے ہیں۔ زرعی دور کی دو یا اس سے زیادہ بادشاہتوں کے درمیان جنگ کی مثالیں قدیم چین یا ازمنہ وسطیٰ کے یورپ کی تاریخ میں ڈھونڈی جا سکتی ہیں۔1870ء میں جرمنی اور فرانس کے درمیان جو جنگ ہوئی اسے دوسری مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت یہ دونوں ملک صنعتی عہد کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے اور کم وبیش ترقی کی یکساں سطح پر تھے۔

ایک اور قسم کی لڑائیوں میں جنگی اقسام ڈرامائی طور پر مختلف ہوتی ہیں، جیسے مثال کے طور پر انیسویں صدی کی نوآبادیاتی لڑائیاں، یورپی اقوام نے ہندوستان اور افریقہ کے زرعی اور قبائلی معاشروں کے خلاف صنعتی عہد سے مخصوص جنگیں مسلط کیں۔ یورپی افواج نے نپولین کے زمانے ہی سے صنعتی عہد کے تقاضوں کے مطابق اپنی شکل بدلنا شروع کر دی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھی۔1800ء تک پہنچتے پہنچتے ان میں مشین گنوں کے استعمال کی استعداد پیدا ہو چکی تھی (اگرچہ یہ استعمال صرف سفید فام اقوام تک محدود تھا)۔ بہرحال یہ نوآبادیاتی فاتحین محض مشین گنوں کے بل پر کامیاب نہیں ہوئے تھے بلکہ اسکی اصل وجہ یہ تھی کہ زراعت سے صنعت کی طرف رواں دواں معاشرے ان کی پشت پر تھے اور ان کی دوسری لہر کے دور کی فوجیں طویل فاصلوں تک تیزی کے ساتھ پیغام رسانی کی سہولتوں سے بہرہ ور تھیں۔فوجی بہتر طور سے تربیت یافتہ تھے، زیادہ طریقوں سے منظم تھے اور اس طرح متعدد دوسرے شعبوں میں بھی انہیں حریفوں پر برتری حاصل تھی۔موت کے ان میدانوں میں وہ دوسری لہر کی جنگ کا پورا سازوسامان لے آئے تھے۔

ایشیا میں کوریا کے قوم پرستوں نے1919ء میں جاپان کی نوآبادیاتی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔1920ء کی رقم کردہ اپنی یادداشتوں میں کم ال سنگ جو بعد میں شمالی کوریا کا ڈکٹیٹر بنا، حیرت کے عالم میں رقم طراز ہے کہ ''سوال یہ تھا کہ کیا ہم ایک سامراجی ملک کو جو ٹینک، توپیں، جنگی جہاز اور اسمبل لائن کے ذریعے دوسرے جدید ہتھیار اور ساز و سامان استعمال کرسکتا ہے، واقعی شکست دے سکتے ہیں؟''

ایسے مقابلوں کے حریف مختلف ملکوں اور کلچر ہی کی نمائندگی نہیں کرتے تھے بلکہ وہ مختلف تہذیبوں اور دولت آفرینی کے مختلف ذرائع پر عمل پیرا ہونے والوں کے نمائندہ بھی تھے۔ ان میں سے ایک ہل کے ذریعے دولت پیدا کرتا تھا تو دوسرا اسمبلی لائن کا ذریعہ برتتا تھا۔ان حریفوں کی فوجوں میں بھی تہذیبوں کا یہ تصادم منعکس تھا۔

ایک اور زیادہ پیچیدہ قسم کی جنگ وہ ہوتی تھی جس میں جنگ کی واحد قسم دوہری قسم کی جنگ کے ساتھ معرکہ آرائی میں مصروف ہوتی۔ یہ وہ قسم ہے جو ہم خلیج کی جنگ میں دیکھ چکے ہیں،مگر یہ پہلا موقعہ نہیں ہے کہ کسی فوج نے بیک وقت جنگ کی دو اقسام سے کام لیا ہو۔

جنگجو بانکے اور سپاہی:

1868ء کے انقلاب کے بعد جاپان نے جب صنعتی عہد کی طرف بڑھنے کے عمل کا آغاز کیا، اس وقت تک یورپی قومیں ایشیا کے بہت بڑے علاقے پر پہلے ہی قبضہ کر چکی تھیں۔ جاپان کے جدیدیوں نے اس عہد کے ساتھ کہ وہ جاپان کو یورپی اقوام کا اگلا شکار نہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بننے دیں گے۔ نہ صرف اپنے ملک کی معیشت بلکہ فوج کو بھی جدید خطوط پر استوار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد 1877ء میں سٹسما بغاوت سامنے آ گئی جس میں شمشیر بکف بانکے جنگجوؤں کا شاہی فوجوں سے آخری معرکہ دیکھنے میں آیا۔ ''سولجرز آف سن'' کے مصنفین میریئن اور سوسی ہیریز کے بیان کے مطابق ''اس جنگ میں، بانکے جنگجوؤں کے درمیان انفرادی طور پر دست بدست لڑائی کے مناظر آخری بار دیکھنے کو ملے۔'' مگر اسی لڑائی میں صنعتی دور کی جنگ کی ابتدائی صورت بھی منظر عام پر آ گئی۔

شاہی افواج میں اگرچہ پہلی لہر کے زمانے کے کچھ بانکے جنگجو بھی شامل تھے، مگر زیادہ تر یہ دوسری لہر کے جبری طور پر بھرتی کئے جانے والے سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ توڑے دار بندوقتیں، مارٹر اور رائفلیں ان کا اثاثہ تھیں۔ اس طرح یہاں بھی خلیج کی جنگ کی طرح ایک فریق کا یک سطحی قسم کی جنگ پر انحصار تھا جبکہ دوسرا دوہری قسم کی جنگ میں مشغول تھا۔

ایک اور قسم کی لڑائیوں میں بشمول پہلی جنگ عظیم کے، ایسے عظیم اتحاد بھی سامنے آتے رہے جن میں ایک فریق یا دونوں فریقوں کے ساتھ ایسے ساجھی دار بھی شامل تھے جن کا تعلق پہلی یا دوسری لہر کے زمانے سے الگ الگ ہے۔

بہرحال اس قسم کی تقسیم کے نتیجے میں لڑائی کے دوران داؤ پیچ، طاقت کے استعمال، ٹیکنالوجی اور بعض دوسرے عناصر کے درمیان زبردست قسم کا تنوع دیکھنے میں آتا ہے لیکن یہ ساری رنگا رنگی جنگ کی ایک یا دوسری قسم کا حصہ ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔

یہ بات ہم پہلے ہی سے جانتے ہیں کہ جنگ کی نئی قسم کے میدان میں آتے ہی پرانے طریقے غائب نہیں ہو جاتے۔ جیسا کہ دوسری لہر کے کثرت پیداوار کے زمانے میں مروج طریقے، تیسری لہر کے محدود پیداوار کی قسم کے طریقے سامنے آنے کے بعد اب بھی موجود ہیں۔ آج بھی دنیا میں کم سے کم ایسے بیس ملک موجود ہیں جن کی عملداری میں دوسری لہر کے زمانے کی بڑی اہم علاقائی افواج موجود ہیں۔ ان میں سے چند ایک تو ایسی ضرور ہوں گی جو آئندہ تصادم کے موقعہ پر اپنے پیدل دستوں کو فنا کے گھاٹ اتارنے کے لئے میدان جنگ میں بھیجنے کی غلطی کر سکتی ہیں۔ خندقیں اور بنکرز، فوجوں کی یلغار، سامنے سے حملہ کرنے کی روایت......دوسری لہر کے زمانے کے یہ سارے طور طریقے اور ہتھیار بلاشبہ اس وقت

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تک کام میں لائے جاتے رہیں گے جب تک فنی لحاظ سے کمتر درجے ،صحت اور درستگی سے عاری گھٹیا قسم کے ہتھیاروں اور سمارٹ ٹینکوں کی جگہ ''سٹوپڈ'' قسم کے ٹینک غریب اور ناراض ملکوں کے اسلحہ کے ذخیروں کا حصہ ہیں۔

صورت حال کو مزید بگاڑتے ہوئے پہلی اور دوسری لہر کے زمانے سے متعلق بعض ممالک اب تیسری لہر کے دور کے ہتھیار یعنی فضائی دفاعی سسٹم سے لے کر دور مار میزائل تک کے حصول کے لئے کوشاں ہیں۔

کرہ ارض کے مختلف حصوں پر چونکہ کسی بھی سال مختلف حجم کی کم سے کم تیس لڑائیاں جاری رہتی ہیں۔ اس لئے آنے والے عشروں میں ان میں اضافے کی توقع بھی کی جا سکتی ہے اور یہ پچاس سے سو تک تصادم کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ختم ہوں گے تو ان کی جگہ نئے جھگڑے اٹھتے رہیں گے۔ ہمارے لئے اب یہ ضروری ہوگیا ہے کہ امن قائم رکھنے اور خونریزی کے واقعات روکنے کے لئے ہم اجتماعی ذمہ داریاں پوری کریں۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جوں جوں لڑائیوں کی اقسام بڑھتی رہیں گی یہ کام پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا جائے گا۔

غریب اور کمتر درجے کی ٹیکنالوجی والی دنیا میں چھوٹے پیمانے پر خانہ جنگیوں، متشددانہ وارداتوں، منشیات کی تجارت، ماحولیاتی جھگڑوں اور اسی نوع کے جرائم کی وارداتوں کا سلسلہ جاری رہے گا لیکن چھوٹی بالخصوص پہلی لہر کی عالمی طاقت سسٹم کے دائرے میں لڑی جانے والی جنگیں ہی جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں ایسی نہیں ہیں جن سے ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت ہے۔ البتہ مثال کے طور پر روس کی مزید ٹوٹ پھوٹ کی صورت میں کم ترقی یافتہ خطوں یا دوسری لہر کے لسانی گروپوں کے درمیان میں ایسے تصادمات کی لپیٹ میں آنے کا خدشہ ضرور موجود ہے جن میں کثیر تعداد میں فوجیں، ٹینک، حتیٰ کہ ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کی نوبت آ سکتی ہے۔

اعلیٰ ٹیکنالوجی سے وابستہ اقوام جو زمینی قوت کے بل پر معیشت کو ترقی دینے کے راستے پر گامزن ہیں یا تو متذکرہ قسم کے تصادمات کی نذر ہوسکتی ہیں یا پھر اپنی داخلی اور سیاسی سرگرمیوں کے نتیجے میں جنگ میں گھر سکتی ہیں۔ ان کی سرحدوں سے باہر ہونے والے لسانی یا مذہبی تشدد کی لہریں ان کی سرحدوں کے اندر داخل ہوکر جنگ کی آگ بھڑکا سکتی ہیں۔ حتیٰ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ فنی لحاظ سے ترقی یافتہ تیسری لہر کے زمانے سے تعلق رکھنے والی قوموں کے درمیان میں جنگ کے امکان کونظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ فضا، تجارتی جنگ کے منظرنامے سے معمور ہے، جسے غلط طریقوں سے سلجھانے کی کوشش کی گئی تو یہ دو بڑی تجارتی اقوام کے درمیان حقیقی لڑائی کا روپ بھی دھار سکتی ہے۔

مختصر یہ کہ اس ددور میں جنگ کی کم از کم ایک درجن اقسام کا وجود ممکن ہے جن میں بے انتہا تنوع موجود ہوسکتا ہے اور یہ ایسے مقابلوں پر منتج ہوسکتی ہیں جن میں حریف یا دو اتحادی ہی آمنے سامنے ہوں گے۔

جنگ کی روز بروز بڑھتی ہوئی یہ رنگا رنگی کسی بھی ملک کے لئے اپنے ہمسائے دوست یا حریف ملک ی فوجی قوت کا اندازہ لگانے کے کام کوسخت مشکل بنا دے گی۔ جنگی منصوبہ ساز اور جنگ روکنے کی کوشش کرنے والے سبھی لوگ یکساں طور پر پیچیدگی اور غیر حقیقی صورت حال سے دوچار ہوجائیں گے۔

حد سے بڑھے ہوئے اس تنوع کی وجہ سے اتحادی قسم کی جنگ آزمائی میں رکاوٹ پڑ سکتی ہے (اور اس طرح اتحادوں پر مبنی تدارک جنگ کی کوششوں میں بھی رخنہ پڑ سکتا ہے)۔

اس کے مقابلے میں جب ہم ایسی قوموں کے درمیان موجود عظیم اتحادوں کے بارے میں سوچتے ہیں جن کی معاشی اور فوجی ترقی کی سطحیں مختلف ہیں تو ان کی درجہ بندی اور رنگا رنگی میں موجود فرق آسمان تک پہنچتا نظر آتا ہے، بالکل یہی معاملہ اتحادیوں میں محنت کی تقسیم کا بھی ہے۔

یہ رنگا رنگی اب اتنی اونچی سطح پر پہنچ گئی ہے کہ کوئی بھی قوم اب ایسی فوج تیار کرنے کے قابل نہیں رہی ہے جو اپنے طور پر جنگ کے لئے ہمہ وقت تیار ہو۔ امریکہ بھی ہر نوع کی جنگ شروع کرنے اور اس کے اخراجات برداشت کرنے کو ناممکن قرار دیتا ہے۔ خلیج کی جنگ کے تجربے کی بنیاد پر واشنگٹن کا کہنا ہے کہ مستقبل میں جہاں بھی ممکن ہوا، بحران کے موقعہ پر ایسے اتحاد کی تشکیل کو ترجیح دی جائے گی جس پر اتحادی خصوصی فوجی دستے اور ٹیکنالوجی مہیا کرنے میں اپنا حصہ ڈالے گا اور ان چیزوں کی جہاں جہاں ضرورت ہوئی وہاں انہیں مہیا کرنے کا پابند ہوگا (یہ طریق کار بالکل وہی ہے جس پر بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''سٹریٹجک اتحاد'' یا کنسورشیم'' بنا کر مقابلے کا اہتمام کرتی ہیں)۔ عالمی قوت کے دوسری سطح سے تیسری سطح کے سسٹم تک کے سفر میں اور فوجی طریق کار میں نہایت متنوع تبدیلیوں کے بعد دنیا بھر کی افواج اب اپنے بنیادی نظریات پر ازسرنو غور کرنے کیلئے مجبور ہوگئی ہیں۔ اسی طرح ہم فوجی دانشوروں کی سوچ کے ایک سلگتے ہوئے دور میں داخل ہو رہے ہیں، جس طرح تیسری لہر کی تہذیب نے ایسی پختہ شکل اختیار نہیں کی۔ اسی طرح تیسری لہر کی جنگی شکل بھی پختگی تک نہیں پہنچی، فضائی زمینی جنگ تو محض نقطہ آغاز تھی۔

اب تک ہم نے جو کچھ دیکھا ہے وہ حقیقتاً نامکمل ہے۔ جنرل سٹیری اور موریلی نے جس کام کا آغاز کیا تھا اور جس میں بعد میں ترامیم ہوتی رہیں اور جسے عراق کے میدان جنگ میں ٹسٹ کیا گیا یعنی تیسری لہر کی جنگی قسم کو اب انقلابی طور پر وسعت دینے اور بہتر بنانے کا وقت آ گیا ہے۔اس تصور کو فوجی اخراجات میں بڑے پیمانے پر ہونے والی کٹوتی سے بھی تقویت ملے گی کیونکہ اب فوجیں کم سرمائے سے زیادہ بڑے مقاصد حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ اس سارے عمل کی کنجی جنگ کی مختلف اقسام اور ان کے باہمی تعلق کے تعین میں ہے۔

جاری تبدیلیوں کا جو عمل ہمارے سامنے ہے اس پر ایک نظر ڈالنے سے اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ساتھ جنگ اور تدارک جنگ کی ایک حیرت انگیز تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ جب تک سپاہیوں، سفارت کاروں اور اسلحے کے کنٹرول کی بات چیت کرنے والوں اور قیام امن کے لیے مصروف کار سیاست کاروں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس سے آگے کیا ہے۔ اس وقت تک ہم اپنے آپ کو جنگ میں یا اسے روکنے کی کوششوں میں مصروف پائیں گے......لیکن یہ جنگیں ماضی کی ہوں گی، آنے والے کل کی نہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تیسرا حصہ

تلاش

چھوٹی چھوٹی لڑائیاں:

اب تک ہم نے جو کچھ بھی دیکھا ہے، اسے محض تمہید سمجھنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگ اور تدارک جنگ، ہر قسم کی کوششوں کی کایا پلٹ کے لئے امن قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے والوں کو عجیب وغریب نئے نئے سوالات کے ساتھ زیادہ طاقت ور تبدیلیوں کا سامنا ہے جن میں سے بعض تو حیرت کی حدوں کو چھو رہی ہیں۔

دنیا کو ''چھوٹی چھوٹی لامتناہی لڑائیوں'' سے ......جن میں سے کوئی دو بھی ایک دوسری سے مطابقت نہیں رکھتیں، نپٹنا ہے؟ فضائے بسیط پر کس کی حکمرانی ہوگی؟ کیا ہم ایسی خونیں جنگوں کو روک سکتے ہیں یا ان کا دائرہ محدود کر سکتے ہیں جو ایسے میدانوں میں لڑی جا رہی ہیں جو ''اصل حقیقتوں'' سے بھرے پڑے ہیں......یعنی خفیہ اطلاعات اور خودکار ہتھیاروں سے، ایسے ہتھیار جن کو ایک دفعہ پروگرام کا پابند کر دیا جائے تو وہ خود فیصلہ اور اس پر عمل کریں گے کہ انہیں کب اور کس کے خلاف حملہ کرنا ہے؟ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر لڑی جانے والی جنگوں کے لئے خصوصی طور سے تیار کئے جانے والے ان ہتھیاروں پر دنیا کو پابندی لگانی چاہیے یا انہیں چوم چاٹ کر قبول کرنے کی ضرورت ہے!

جنگ کی کوئی نئی قسم بھی ایک نظریاتی مشورے سے خواہ یہ کتنا ہی جامع کیوں نہ ہو، ترتیب نہیں پاتی، نہ ہی یہ کسی ایک جنگ سے بعد کے حالات کے تجزیے کے نتیجے میں وجود میں آتی ہے۔ چونکہ جنگ کی نئی قسم کا عکس دولت آفرینی کے نئے ذرائع کی دریافت بلکہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حقیقتاً ایک پوری نئی تہذیب کے وجود میں آنے کے عمل سے جڑا ہوا ہوتا ہے، اس لئے جنگ کی یہ نئی قسم بھی اس تہذیب کے سامنے آنے اور ترقی کر کے دنیا کو بدلنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ابھرتی ہے۔ آج جیسے جیسے تیسری لہر کی جنگی اقسام گہرائی اور وسعت اختیار کرتی جا رہی ہیں، اس جنگ کی بڑھتی ہوئی رفتار کا ہمارا احساس بھی بڑھتا جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں، تیسری لہر کے زمانے کی معیشت منڈیوں کو چھوٹے اور مختلف اقسام کے یونٹوں میں تبدیل کر کے پرانے صنعتی نظام کو چیلنج کر رہی ہے اور کھڑکیوں اور طاقوں پر مشتمل منڈیاں ابھر رہی ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے اس نوع کی چھوٹی چھوٹی مصنوعات بھی چلی آ رہی ہیں۔ سرمایہ کاری کا حجم بھی کم ہے اور سٹاک مارکیٹ کے کھلاڑیوں کا سائز بھی چھوٹا ہو گیا ہے۔ اسی طرح ایڈورڈ ٹائزنگ کے شعبے میں بھی کیبل ٹی وی کی طرح محدود پیمانے پر کام ہو رہا ہے۔

ترقی یافتہ معیشتوں کی محدود پیداوار کی یہ مشق سپر طاقتوں کے درمیان جنگ کے جناتی خطرے کو بھی اس طرح متوازی سطح پر محدود کر کے لاتعداد چھوٹے چھوٹے خطرات کے امکانات بڑھا دیتی ہے۔

وائٹ ہاؤس کا سابق سائنسی مشیر جی اے کے ورتھ اس صورت حال کو ایک دوسرے طریقے سے پیش کرتا ہے۔ کمپیوٹر کے ایک مرکزی ڈھانچے کی بجائے اس کی تقسیم شدہ ذمہ داریوں سے جس طرح پیداوار کا عمل چھوٹے چھوٹے یونٹوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اس طرح بنی نوع انسان کو درپیش جنگ کے خطرات کی فضا بھی کئی چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک نام نہاد ''شیطانی مملکت'' کی بجائے دنیا کو اب منقسم خطرات کا سامنا ہے۔ یوں جنگ آزمائی کی کوششوں میں بھی ٹیکنالوجی اور معیشی ڈھانچے کی تبدیلیوں کا عکس نظر آتا ہے۔

حیرت زدگی:

اوپر عالم بالا میں جہاں عمرانیات کے عالم بھی کہیں وفات کے بعد چلے جاتے ہیں گئی قانوموسکا نام کا ایک اطالوی نہایت جنون کے عالم میں خندہ زن نظر آتا ہے۔

وہ اپنے آپ سے پوچھ رہا ہے کہ بظاہر اتنے سمجھدار لوگ جن میں سیاستدان، صحافی،

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خارجہ امور کی ماہر اور ہر نوع کے پنڈت شامل ہیں، سرد جنگ کے خاتمے کے بعد دنیا میں جگہ جگہ پھوٹ پڑنے والی تشدد کی وارداتوں پر صدمے سے نڈھال ہو کر حیرت کا اظہار کیوں کر رہے ہیں؟

''جب بڑے پیمانے کی کوئی جنگ ختم ہو جاتی ہے۔'' موسکا نے اپنی کتاب ''حکمران طبقہ'' میں1939ء میں لکھا تھا ''تو پھر یہ خاندانوں میں چھوٹے چھوٹے جھگڑوں اور مختلف طبقوں اور دیہاتوں اور قصبوں کے درمیان لڑائیوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔'' موسکا کا یہ دعویٰ بے بنیاد نہیں تھا، جنگ جو ختم ہوئی ہے وہ گرم جنگ کی بجائے سرد ہی سہی مگر تھی تو جنگ ہی۔

آج ہم علیحدگی کی جنگوں ، لسانی اور مذہبی متشددانہ کاروائیوں، بغاوتوں، سرحدی جھگڑوں، شہری ابھار کی تحریکوں اور دہشت پسندوں کے حملوں کو حیرت زدگی سے دیکھ رہے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ سب کچھ افلاس زدہ جنگوں کے نتیجے میں نقل مکانی کرنے والے دنیا کے مہاجروں اور لاتعداد منشیات فروشوں کے علاقوں میں ہو رہا ہے اور قومی سرحدوں کی حد بندیاں توڑ کر ہو رہا ہے۔ ان میں سے بہت سے چھوٹے چھوٹے اختلافات، تار سے بندھی ہوئی عالمی معیشت پر ثانوی اثرات کی صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں جو آس پاس کے علاقوں تک محدود نہیں ہوتے بلکہ دور دراز کے ملک بھی ان کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ یوں ان بہت سی چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کا منظرنامہ فوجوں کے منصوبہ سازوں کو نئے سرے سے ''سپیشل آپریشنز'' کا اہتمام کرنے یا ''خصوصی فوجی دستوں'' کے قیام کی طرف متوجہ کرتا ہے یعنی آنے والے کل کے لئے چھوٹے جنگجوؤں کی تیاری کا کام شروع ہو جاتا ہے۔

آج کی افواج میں خصوصی توجہ یا سپیشل آپریشنز یونٹس کی موجودگی فوج کے کسی بھی دوسرے شعبے کے مقابلے میں پہلی لہر کے زمانے کی جنگ سے زیادہ قریب ہے۔

سپیشل یونٹس کے فوجیوں کی تربیت میں جسمانی طاقت، مختلف یونٹوں کی باہمی پیوستگی، ہر یونٹ کے ارکان کے درمیان شدید قسم کی جذباتی وابستگی پیدا کرنے اور دست بدست لڑائی میں انتہائی مہارت حاصل کرنے پر زور دیا جاتا ہے، جس قسم کی لڑائیوں میں یہی یونٹ حصہ لیتے ہیں ان کا دارومدار زیادہ تر بظاہر نظر نہ آنے والی خصوصیات پر ہوتا ہے یعنی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خفیہ معلومات، مقصدیت، اعتماد، جذباتی وابستگی، اثر آفرینی، اخلاقیات اور آگے بڑھنے کی شخصی اور انفرادی صلاحیتیں وغیرہ۔

مختصر یہ کہ خصوصی افواج کا جو زیادہ تر رضا کاروں پر مشتمل ہوتی ہیں، شمار فوج کے نہایت نستعلیق قسم کے یونٹوں میں ہوتا ہے اور ایک افسر کی وضاحت کے مطابق ان کا کام ''ایسے دائروں میں کاروائیاں کرنے تک محدود ہوتا ہے جن کا شمار مخالفوں، دفاع کے خواہش مندوں، دور افتادہ علاقوں یا تہذیبی لحاظ سے حساس علاقوں میں کیا جاتا ہے۔'' ''سپیشل آپریشنز'' کی اصطلاح مختلف قسم کے فرائض اور ذمہ داریوں کا احاطہ کرتی ہے جن میں آفت زدہ علاقوں کے دیہاتوں میں خوردنی اشیا پہنچانے، دوست ملکوں کی افواج کو بغاوتوں کا مقابلہ کرنے کی تربیت دینے کے فرائض بھی شامل ہوتے ہیں۔ سپیشل آپریشنز سے متعلق فوجی دستے خفیہ معلومات کے حصول کے لئے گاہے بگاہے چھاپے مارنے، توڑ پھوڑ کی وارداتوں کا مقابلہ کرنے یرغمالیوں کو رہا کرانے اور دشمنوں کو قتل کرنے کے مقاصد کے لئے بھی کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ انہیں دہشت گردوں اور منشیات فروشوں کے خلاف بھی استعمال میں لایا جا سکتا ہے اور نفسیاتی جنگ نیز فائر بندی کی نگرانی کے فرائض بھی سونپے جا سکتے ہیں۔

کمانڈو حملوں کے لئے انہیں بٹالینوں کیشکل میں بھی روانہ کیا جا سکتا ہے اور مٹھی بھر افراد پر مشتمل یونٹوں کی صورت میں بھی۔ ان یونٹوں کے ریکروٹوں کی تربیت بہت لمبی ہوتی ہے، ایسے فوجی یونٹوں کے ایک فوجی افسر کا بیان اگرچہ کچھ مبالغے کا پہلو لئے ہوئے ہوتا ہے مگر وہ کہتا ہے، ''صحیح معنوں میں آپریشنل صلاحیتیں حاصل کرنے کے لئے دس برس کی مدت درکار ہوتی ہے۔ ایسا آدمی اٹھارہ برس سے اٹھائیس برس کی عمر تک تربیتی کورس میں گزارتا ہے۔ ایسی ایک چھوٹی سی ٹیم کے ہر سپاہی سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ نوع بنوع قسم کی صلاحیتوں سے مالا مال ہوگا بشمول ایک سے زیادہ زبانیں جاننے اور بولنے کی مہارت کے ان سپاہیوں کو ہر قسم کی تربیت میں سے گزرنا پڑتا ہے، غیر ملکی ہتھیاروں کے استعمال سے لے کر ثقافتی پیچیدگیوں کو محسوس کرنے کی استعداد کے حصول کے لئے ان کو تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

مئی جون 1991ء کے انفنٹری میگزین میں ایسے ریکروٹوں کی ضرورت کے بارے میں ایک اعلان چھپا تھا جن کو انفرادی طور پر یا ٹیموں کی شکل میں دنیا بھر میں روٹین کے مطابق

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فرائض انجام دینا تھے۔

جاننے والوں کو فوراً پتہ چل گیا کہ یہ اصل میں ڈیلٹا فورس...... امریکی افواج کی پہلی سپیشل فوج، آپریشنل ڈیٹیچمنٹ کا اشتہار تھا۔ یہ خصوصی فوج یرغمالوں کی رہائی کے لئے تشکیل دی جا رہی تھی، لیکن امریکی افواج کی خصوصی کمان میں شامل فوجی یونٹوں میں سے ڈیلٹا فورس ہی وہ واحد یونٹ ہے جس سے عام طور پر لوگ بخوبی آگاہ ہیں ورنہ امریکی بحریہ اور فضائیہ کی بھی اپنی اپنی سپیشل آپریشنز فورس موجود ہے۔

17 جنوری 1991ء کو بغداد پر ایف 117 کے پہلے حملے سے بھی قبل امریکی فضائیہ کے خصوصی آپریشن ونگ سے پیولوقسم کے تین ہیلی کاپٹروں نے فوج کے 9 ہیلی کاپٹروں کے حملے کی رہنمائی کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ یہ حملہ عراقی سرحد کے ساتھ ساتھ واقع ایک پٹی پر کیا گیا۔ صحرا کی ارضی سطح سے تیس فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے انہوں نے ابتدائی وارننگ دینے والے دو ریڈار تباہ کر دیئے اور یوں عراقیوں کو اندھا کرنے کے بعد پیچھے آنے والے سینکڑوں بمبار طیاروں کو حملے کا محفوظ راستہ مہیا کر دیا۔ یہ ڈیزرٹ سٹارم کے ابتدائی دنوں کی بات ہے، دوسرے آپریشنل وقفوں نے عراقیوں کے قبضے میں واقع تیل کے ساحلی پلیٹ فارموں پر قبضہ کر لیا۔ پھر انہوں نے دشمن کی فوجوں کے عقبی علاقوں پر جاسوس پروازوں کے ذریعے معلومات مہیا کیں۔ گم شدہ اور صحرا میں لیٹے ہوئے فوجیوں کو بچانے کے ساتھ انہوں نے متعدد قسم کی دوسری ذمہ داریاں بھی سنبھالیں۔

بہرحال 1992ء تک امریکن آپریشن کمان کے فضائی، بحری اور زمینی یونٹوں میں بیالیس ہزار سپاہی اور ریزرو فوجی موجود تھے جو 21 ملکوں میں بشمول کویت، پانامہ، جرمنی اور جاپان کے جزیزہ اوکی ناوا میں تعینات تھے۔ قدرتی طور پر دنیا کی متعدد دوسری افواج میں بھی ایسے ہی خصوصی دستے شامل تھے۔ سابق سوویت یونین کے ان خصوصی دستوں کو دوسری جنگ عظیم میں نازیوں کے ہمدردوں کے خلاف کاروائیوں کی تربیت دی جاتی تھی۔ سرد جنگ کے زمانے میں ان سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ مغرب کے ایٹمی اور کیمیائی ہتھیاروں کو ضائع کرنے کا فریضہ انجام دیں گے اور بوقت ضرورت منتخب اتحادی رہنماؤں کی زندگی کا چراغ گل کرنے کا کام بھی کریں گے۔ پھر برطانیہ کی خصوصی فضائی سروس یا ایس اے ایس اور فرانس کے فرسٹ اور سیکنڈ پیراشوٹ بریگیڈوں اور اس کی تیرہویں ڈریگن پیراشوٹ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رجمنٹ وغیرہ سبھی کا شمار سپیشل آپریشنز کے دستوں میں ہوتا ہے۔ صرف 1978 اور 1991ء کے درمیانی عرصے میں فرانس نے سترہ ایسی فوجی مہمات بیرون ملک روانہ کیں جو زیادہ تر اس قسم کے فوجی دستوں پر مشتمل تھیں۔

چھوٹی سی چھوٹی اقوام بھی اس قسم کے چھوٹے جنگجوؤں پر مشتمل فوجی دستے قائم کرنے کی کوشش ضرور کرتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض اوقات ان کو نام کچھ اور دیا جاتا ہے، پولیس کا نام اختیار کرنے کے علاوہ کبھی کبھی فوجی سپاہیوں کے مقابلے میں ان کو مختلف شکل دے دی جاتی ہے۔ مثلاً ڈنمارک کے پاس اس کی جیگر کور ہے۔ بلجئم نے پیرا کمانڈو بنا رکھی ہے اور تائیوان اسے ایمنی نائیس کا نام دیتا ہے۔

ان فوجی دستوں کو اصولاً کسی بھی نوع کی لڑائی میں جھونکا جا سکتا ہے اور نیوکلائی محاذ آرائی سے لے کر قبائلی سرحدی تنازعوں کے حل تک کے لئے ان کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں، مگر ان کے خصوصی فرائض عام طور سے ایسے مقابلوں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں جنہیں فوج کی زبان میں ''کم شدت کے تصادم'' یا ایل آئی سی کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح بھی محدود جنگ کی ایسی مخاصمتوں کا احاطہ کرتی ہے جو روایتی قسم کی عام لڑائیوں سے کم تر درجے کی ہوتی ہیں۔

کم شدت کے تصادمات:

قومی دفاعی کونسل فاؤنڈیشن کا سربراہ 46 سالہ اینڈی میسنگ خصوصی فوجی دستوں کا سابقہ میجر ہے جو خاکی نیکر اور کھلے گلے کی قمیص پہنے ہوئے واشنگٹن شہر سے باہر واقع اپنے پرشور دفتر میں بیٹھ کر خدمات انجام دیتا ہے۔ اس نے کم شدت کے تصادمات کا خصوصی مطالعہ کیا ہے۔ ویت نام اور انگولا سے کشمیر تک اور فلپائن سے السلویڈور تک، اس نے دنیا بھر میں چھوٹے تصادمات والے تقریباً سبھی علاقوں کا دورہ کیا ہے، اس کا کہنا ہے کہ ان میں سے کم از کم پانچ میں وہ خود کمر کمر تک دھنسا رہا ہے۔

شوخ اور چنچل میجر میسنگ، کم شدت کے تصادمات کی مستقل وکالت کرنے والا دنیا کا غالباً واحد فرد ہے جس نے اخبارات میں اس بارے میں بے شمار مضامین لکھے۔ کانگرس کے ارکان کو ضروری معلومات بہم پہنچائیں اور ہر اس آدمی کو جو اس کی بات سننے کے لئے تیار نظر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آئے، لیکچر دینے اور اس کی سمع خراشی کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار نظر آتا ہے۔

اس کا پیغام خاصا تعجب خیز ہے جو قوم پرستی، عوام کی حاکمیت، فوج کی سخت گیری کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق کی پاسداری اور کم شدت کے مقابلوں کی زد میں آ کر غریبی اور دوسری مشکلات میں گھرے ہوئے لوگوں کے مسائل ختم کرنے کی اپیلوں کا ملغوبہ ہے، جس میں وہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی اصلاحات پر یکساں توجہ دیئے بغیر ایسی کم شدت کی لڑائیاں شروع کرنے کے سلسلے میں نظریاتی مباحث کو غیر ضروری اور بے نتیجہ قرار دیتا ہے۔

میسنگ کو وہ دنیا اپنے سامنے دکھائی دے رہی ہے جس میں بہت سی ظالم اور غیر مستحکم حکومتیں کیمیائی اور بائیو لاجیکل ہتھیاروں سے مسلح ہوں گی۔ ان کو ان ہتھیاروں سے محروم کرنے کے لئے سرجری کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہوگی۔ اس کے خیال میں منشیات کے خلاف جنگ کو بھی وسعت دینا پڑے گی، مگر باہمی تصادم، توانائی، بیماری، ماحولیاتی آلودگی اور آبادی میں اضافے کی وجہ سے بھی رونما ہوتے رہیں گے......منشیات کے کاروبار میں ملوث سترہ ملکوں کا دورہ میں خود کر چکا ہوں۔'' میسنگ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے زور دیتا ہے۔'' پیرو منشیات کا مسکن ہے۔ لاؤس کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے لیکن آپ لوگ افریقہ میں زمباوے یا موزمبیق جیسے ملکوں میں ایڈز کی بیماری کی وجہ سے وجود میں آنے والی جنگیں دیکھنے کے لئے بھی تیار رہیں۔

صومالیہ اور زائرے جیسے حالات جہاں حکومتیں کلیتًا ناکام ہو چکی ہیں اور جہاں انتشار کا دور دورہ ہے، دوسرے مقامات پر بھی رونما ہو سکتے ہیں۔ ایسے حالات میں دوسرے ملک اپنے تحفظ کے نام پر منشیات کے کاروبار کو تحفظ دینے کیلئے مہاجروں کی کثیر تعداد کو اپنی سرحدوں سے دور رکھنے یا اپنی سرحدوں کو نسلی تشدد کے واقعات سے بچانے کے نام پر دخل اندازی کر سکتے ہیں۔

دوسری لہر کے زمانے کی وسیع پیمانے پر لڑی جانے والی بڑی جنگوں کی بجائے یہ دنیا اب تیسری لہر کی محدود لڑائیوں کے لئے آرڈر پر وجود میں لائی گئی ہے۔ جیسے جیسے ان چھوٹے جنگجوؤں کی تعداد بڑھے گی، نئے فوجی نظریے جو ان کے وزن میں اضافہ کریں گے، وجود میں آتے رہیں گے۔ اس کے ساتھ ہی نئی ٹیکنالوجی کی ضروریات بھی واضح ہوتی جائیں گی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ریمبو جیسی فلمیں جن میں دماغ سے زیادہ جسمانی قوتوں کو نمایاں کیا جاتا تھا، پہلے ہی فرسودہ ہو چکی ہیں۔ مستقبل کے محدود پیمانے پر لڑنے والے جنگجو معلومات پر مبنی جنگ آزمائی کا حصہ ہوں گے جس میں تیسری لہر کے زمانے کی اب سامنے نظر آنے والی ٹیکنالوجی کا سہارا لیا جائے گا۔

خلیج کی جنگ کے بارے میں پینٹا گون کی حتمی رپورٹ کے مطابق ابتدائی وارنگ کے نظام پر مشتمل صدام حسین کے ریڈاروں پر ہیلی کاپٹروں کے کامیاب حملوں کی وجہ ہی سے اس تصادم میں ابتدائی کامیابی ممکن ہو سکی تھی۔ اور ''یہ حملے بہتر ٹیکنالوجی رات کے وقت کم روشنی میں دکھائی دینے کی قوت بڑھانے والے آلات کی موجودگی، صحت وصفائی سے اہداف کو جہازرانی کے ذریعے نشانہ بنانے کی استعداد جو فضا میں موجود عالمی پوزیشننگ سسٹم (جی پی ایس) کی رہنمائی کی وجہ سے حاصل ہوئی اور فضائی سیاروں اور اعلیٰ درجے کے تربیت یافتہ عملے کی وجہ ہی سے یہ کامیاب ثابت ہوئے تھے۔

لیکن اس قسم کی پیش رفت سے اعلیٰ درجے کی اس ٹیکنالوجی کی مار اور اثر آفرینی کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے جو پہلے سے ہی خصوصی فوجی دستوں کی دسترس میں ہے۔ اینڈی میسنگ کہتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں چھاتہ برداروں کو محض زمین پر اترنے میں ننانوے فیصد تک جانی نقصان کا خطرہ درپیش ہوتا تھا۔ ان کا ساز وسامان خاصے وسیع علاقے میں بکھر جاتا تھا اور سپاہیوں کو اکثر اوقات ایک دوسرے تک پہنچنے کے لئے آپس میں الجھنا پڑتا تھا۔

1979ء میں جب ایرانی انقلابیوں نے تہران میں امریکیوں کو یرغمال بنایا تو امریکہ نے ان کو رہا کرانے کا ایک پروگرام ترتیب دیا۔ پیراشوٹ کے ذریعے چھاتہ برداروں کے ایک گروہ کو وہاں اتارنے کی تجویز اس لئے رد کر دی گئی کہ یہ سب بہت وسیع علاقے میں اترتے۔

میسنگ کا کہنا ہے کہ اس کے مقابلے میں آج ہم یہ صلاحیت حاصل کر چکے ہیں کہ ایک چھاپہ مار ٹیم 25ہزار فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگائے اور منزل سے 25 میل کے فاصلے پر پیرا شوٹ کے ذریعے نیچے کی طرف پرواز کرتے ہوئے یہ لوگ رات کے وقت ایک آنکھ کھلی رکھ سکتے ہیں اور دوسری آنکھ سے اپنے مخفی آلات پر نظر رکھتے ہوئے وہ اس سفر میں نقشے کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں۔ ایک خفیہ کوڈ کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطہ کرنا بھی ان

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے لئے ممکن ہے۔ ایک شخص ایک سیکنڈ میں روشنی اور دوسرا تین چمکاروں سے پیغام رسانی کرسکتا ہے اور یہ سب لوگ صرف دس میٹر کے دائرے میں محو پرواز ہوسکتے ہیں۔

خصوصی فوج کے ایک سابق کمانڈر اوراب سپیشل آپریشنز ایکسپو کے ڈائریکٹر آپریشنز، ٹام بمبیک نے حال ہی میں فلوریڈا کے میکڈل ہوائی اڈے کے نزدیک ہونے والے ایک مظاہرے کے بارے میں بتایا کہ اس میں پیراشوٹ کے ذریعے نیچے اترنے والے ایک جانباز نے بارہ ہزارفٹ کی بلندی سے چھلانگ لگائی۔ ایک ہزار کی بلندی تک پہنچنے کے بعد اس نے پیراشوٹ سے تعلق توڑ کر فضا میں دوڑنا شروع کیا اور اس طرح اپنے آپ کو اڑاتے ہوئے وہ ٹیمپا خلیج کے چینل میں اتر گیا۔ پانی کی سطح سے نیچے جا کر اس نے کنارے کی طرف تیرنا شروع کیا۔ سانس لینے کے آلہ کی مدد کے باوجود سطح آب پر بلبلوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ کنارے پر پہنچنے کے بعد اس نے 5.56 رائفل سے داغے جانے والے کارتوسوں کے خالی خولوں سے اس جگہ کو بھر دیا۔ اس نشانی کا پتہ دیتے ہوئے اس نے پانی ہی میں سے ایک واٹر پروف ریڈیو کے ذریعے ہیلی کاپٹر کو آنے کا اشارہ دیا۔ ہیلی کوپٹر نے وہاں پہنچنے پر اس کو تین ہزار فٹ کی بلندی تک اٹھا کر محفوظ مقام پر پہنچا دیا۔ (یہ فاصلہ کسی بھی ہلکے ہتھیار سے ہونے والی فائرنگ کی زد سے باہر تھا) اس ساری کاروائی میں پندرہ منٹ لگے۔ بمبیک کا کہنا ہے کہ امریکی جہاز جب بلقان کی ریاستوں میں محصور دیہات کے باشندوں کے لئے خوراک پھینکا کرتے تھے تو ان میں سے بہت سے بنڈل اس جگہ سے خاصی دور گر جاتے تھے جہاں اصل میں ان کو پہنچانا ہوتا تھا لیکن اب یہ ٹیکنالوجی فرسودہ اور متروک ہو چکی ہے۔ اے آئی کارپوریشن نے حال ہی میں فضا سے اشیاء نیچے پھینکنے کی ٹیکنالوجی میں ہونے والی پیش رفت کا یوں اعلان کیا ہے کہ ’’ہم نے بیس ہزار پونڈ وزنی سامان حال ہی میں بار برداری کے مخصوص طیاروں کے جو 150 ناٹس کی رفتار سے پرواز کر رہے تھے، ذریعے بڑی حفاظت سے ڈراپ کیا جو حیرت انگیز صحت اور درستگی کے ساتھ مقررہ جگہ پر گرا۔

یہ منفرد سسٹم راکٹوں کا ایک گچھا اس وقت داغتا ہے جب اوپر سے گرنے والا سامان زمین کے قریب پہنچتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بلندی کی پیمائش کرنے والا ایک آلہ لیزر کی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مدد سے بڑے تسلسل اور تواتر کے ساتھ راکٹ کی رہنمائی کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اسے فائر کب کھولنا ہے۔ جلد ہی ہم ساٹھ ہزار پونڈ وزنی سامان ڈراپ کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ کارپوریشن کے ایک نمائندے نے بتایا، اس مقصد کے حصول کے لئے شیری ساؤان قسم کی گاڑیاں پہلے ہی اسمبل ہو چکی ہیں اور اس وقت میدان میں آنے کے لئے تیار کھڑی ہیں۔

بورئے بستر کے ساتھ پی ایچ ڈی:

خصوصی آپریشنز کے ماہرین مستقبل میں پیش آنے والے بہت آگے کے معاملات پر سوچ بچار کر رہے ہیں۔ ورجینیا میں الیگزنڈریہ کی ایک پرانی بستی کے عقب میں واقع کانفرنس روم میں ایک چھوٹی سی میٹنگ کے شرکاء کے درمیان کل کی چھوٹے پیمانے پر ہونے والی جنگوں کا موضوع زیر بحث تھا۔

اس محفل کے تقریباً پچاس سامعین......ادھیڑ عمر کے تاجر جن میں چند ایک خواتین بھی شامل ہیں۔ اپنی فولڈنگ کرسیوں پر آگے کو جھکے ہوئے امریکی فوج کے سپیشل آپریشنز کمانڈ کے لیفٹیننٹ کرنل مائیکل سمپسن کی باتیں بڑے غور سے سنتے نظر آتے ہیں۔ یہ مجمع ان کمپنیوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے جن میں سے اکثر چھوٹی چھوٹی مصنوعات کی تیاری کرتی اور فوج کو فروخت کرتی ہیں (یا بیچنے کی کوششوں میں مصروف ہیں)

چاق و چوبند کرنل سمپسن کے پاس ماسٹر کی دو ڈگریاں ہیں، ایک بین الاقوامی تعلقات کے مضمون کی اور دوسری سٹریٹیجک سٹڈیز کی، لیکن اس نے زندگی کے چودہ برس دنیا کے مختلف حصوں میں ایک ''رُک سیک'' (سیاحوں کا سفری بوریا بستر) گھسیٹتے ہوئے سپیشل آپریشنز کے عمل میں گزارے ہیں۔

سمپسن نے جب اپنی کمان کی مستقل ضروریات کا ذکر شروع کیا تو اس کے سامعین نے فوراً تفصیلات رقم کرنے کے لئے کاغذ قلم سنبھال لئے۔ یہ تفصیلات کل کی محدود جنگوں کے لئے درکار چھوٹی چھوٹی مصنوعات سے متعلق تھیں۔

ان اشیاء میں برف پر چلنے کے قابل گاڑیاں، بغیر فلم کے کام کرنے والے الیکٹرانک کیمرے، توانائی کے ہلکے اور متحرک یونٹ، ضرورت کے مطابق رنگ بدلنے والا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سازوسامان، تربیت، تصادم اور ری ہرسل کیلئے سہ جہتی تصویری سامان اور آوازوں کے خودکار طریقے سے ترجمہ کرنے کے سامان کی تفصیلات شامل تھیں (خلیج کی جنگ کے خصوصی آپریشنز یونٹوں کے ہمراہ عربی زبان جاننے والوں پر مشتمل دو بٹالین موجود تھیں......ضرورت کے مقابلے میں یہ تعداد خاصی کم تھی)۔

سمپسن نے کچھ دوسری ضروریات کا ذکر اس طرح کیا: ''اس کے علاوہ ہم ہلکے مگر ٹھوس اور کھردرے ریڈیو سیٹوں کے ایک یونٹ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جو عالمی یونٹوں کو مربوط کرنے میں مدد دے سکے۔ ایک فیکس مشین بھی معہ پیغام رسانی کے لئے کوڈ اور ڈی کوڈ کی استعداد کے درکار ہوگی...... یہ اشیاء مہیا ہو جائیں تو ہمارے سپاہیوں کی پشت پر لدے ہوئے سامان کے بوجھ میں 30 پونڈ کی کمی واقع ہو جائے گی۔''

ایک دوسرے سپیکر نے ایسی ٹیکنالوجی مہیا کرنے کی ضرورت پر زور دیا جو کسی بھی مشن کی منصوبہ بندی میں معاون ہو سکے اور جو خطرات کی فضا تیار کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو جسے تربیت اور ریہرسل کے دوران کام میں لایا جا سکے...... اور یہ سارا سازوسامان کسی مشن کی تکمیل کے لئے خصوصی آپریشن کے سپاہیوں کو لے جانے والے طیارے میں موجود ہونا چاہئے۔ ان جانبازوں کو مشن کی تکمیل کے لئے جاتے ہوئے سفر کے دوران بھی منصوبہ بندی، تربیت اور ریہرسل کی ضرورتوں سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔

سامان تیار اور فراہم کرنے والوں کو بتایا گیا کہ خصوصی آپریشنز کے لئے درکار سامان عام طور سے سادہ ہونا چاہیے تا کہ مقامی فوجی اسے آسانی سے استعمال کر سکیں۔ مکمل بلیک آؤٹ میں بھی اس کا آسانی سے استعمال ہو سکے اور ایل پی آئی یعنی مداخلت کے کم سے کم امکان اور ایل پی ڈی فیس پکڑے جانے کے کم سے کم امکان کا اہتمام بھی اس میں موجود ہو۔

پینٹاگون میں خصوصی آپریشنز کے ماہر کرنل ٹریگ چلڈریس نے ضرورتوں کی متذکرہ تفصیل میں اضافہ کرتے ہوئے کہا، ''ہمیں ایسے طیاروں کی ضرورت ہے جو عمودی طور سے اوپر اٹھ سکیں اور ایک ہزار فضائی میلوں تک افقی طور پر اڑان کی صلاحیت رکھتے ہوں۔'' اور ''ہمیں اصل حقیقتوں اور خفیہ فرضی اطلاعات کی ضرورت نہ صرف ریہرسل کے دوران بھی پیش آئے گی۔ مثال کے طور پر آج ہم ایک کمرے میں فائر کھولنے کے بعد جھوٹ موٹ کی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک حقیقت تیار کرنے کی صلاحیت حاصل کر چکے ہیں جسے خود ہم بھی حقیقی تسلیم کر لیتے ہیں۔'' لیکن چند سال بعد ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ تمام کے تمام عملے کو جھوٹ موٹ کی حقیقت کا رنگ دے دیں۔ ریہرسلیں اس طرح کریں کہ اصلی لڑائی میں محسوس ہو کہ اس تجربے سے تو ہم پہلے بھی گزر چکے ہیں اور پھر اصل حقیقت کے ساتھ ایسا راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے جس سے غلط لوگوں کے ردعمل کو بدلنا ممکن ہو سکے۔ مثلاً یہ لوگ یہ سوچنے لگ جائیں کہ دروازہ سیدھی طرف کو کھل رہا ہے جب کہ حقیقتاً یہ الٹی طرف کو کھلتا ہو۔

فوجی ٹیلی پیتھی کی طرف:

اس وقت اور بھی بہت سے انتہائی حیرت انگیز امکانات زیرغور ہیں۔ خصوصی آپریشنز کمان کے میجر جنرل سڈنی شاچندنے جولائی1992ء میں2020ء تک کے لئے ٹیکنالوجی کا ایک منصوبہ پیش کیا تھا جس میں ڈی این اے شناخت کا ایک مسروقہ طریقہ اختیار کرنے اور انسانی جسم کا پورا خون تبدیل کرنے کا اہتمام تھا۔ یہاں تک کہ اس میں کیمیاوی ٹیلی پیتھی کی گنجائش پیدا کرنے کا پروگرام بھی شامل تھا۔

ان میں سے کچھ منصوبے شاید خیالی پلاؤ ہی ثابت ہوں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ایسی ہی بہت سی اختراعات جو بظاہر کتنی ہی حقیر کیوں نہ نظر آ رہی ہوں، اب سامنے آ رہی ہیں۔ دنیا کو اب محض ایسی ٹیکنالوجی کے بارے ہی میں نہیں بلکہ عام طور سے محدود جنگوں کے مستقبل کے بارے میں اور تیسری لہر کے زمانے کی جنگوں کی اقسام کے متعلق بھی جو اس کا حصہ ہیں، سوچنا ہوگا۔

تیسری لہر کے زمانے کی چھوٹی چھوٹی جنگوں کے گہرے اثرات کے بارے میں حکومتوں، امن کے داعیوں، حتیٰ کہ فوجی مفکروں نے بھی بہت کم غور و خوض کیا ہے۔ محدود جنگ کی موثر اور ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کے جغرافیائی، سیاسی اور سماجی اثرات کہاں ہوں گے؟ خصوصی آپریشنز کے یونٹوں سے متعلق ان ہزاروں لاکھوں سپاہیوں کا کیا بنے گا جنہیں اس ترقی کے نتیجے میں فارغ کر دیا جائے گا؟

سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ سوویت یونین کے انتشار کے بعد اس کی خصوصی آپریشن کی فوج، سپٹنز کے سپاہی کیا اپنا ہنر اور مہارت دوسرے ملکوں کو فروخت تو نہیں کر رہے ہیں؟

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان ہزاروں عرب اور ایرانی جوانوں کا کیا بنے گا جو سوویت روس سے برسرپیکار مجاہدین کی مدد کے لئے افغانستان میں داخل ہوئے۔ ان میں سے اکثر کو گوریلا جنگ اور خصوصی آپریشنز کی تربیت دی گئی لیکن اب ان کی اپنی حکومتیں بشمول مصر، طونس اور الجیریا کے ان کی واپسی میں رکاٹیں پیدا کر رہی ہیں کیونکہ انہیں خطرہ ہے کہ اب وہ اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو حکومت کے مخالف انقلابیوں کے لئے بروئے کار لائیں گے۔

خصوصی فوجی دستوں کی حیثیت فوج کی اشرافیہ کی سی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ اشرافیہجمہوریت کے لئے واقعی خطرہ ہے جیسا کہ بعض ناقدین کا خیال ہے۔

کچھ لوگوں کے نزدیک خصوصی آپریشنز کو جن کے فرائض کی بنیاد ہی جعلسازی اور فریب کاری پر ہوتی ہے، بجائے خود غیر اخلاقی قرار دینا غلط نہ ہوگا۔ لیکن یہی بات ان حالات کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے جن میں آنے والے زمانوں میں ان خصوصی دستوں کو کاروائی پر مجبور ہونا پڑے گا۔ (یا اب بھی وہ یہ سب کچھ کرنے پر مجبور ہیں)۔لسانی تعصّبات ، سرحدوں کے باہر سے ہونے والی جارحیت ، دہشت زدگی کی کاروائیوں، یرغمالی بنانے کے واقعات، انسانیت کی بنیاد پر فلاحی کام کرنے والے اداروں کی دواؤں اور اشیائے خوردنی کی چوریاں، منشیات کی تجارت اور بم دھماکوں جیسے کاموں کو آخر کس طرح اخلاقی قرار دیا جا سکتا ہے؟

خصوصی آپریشنز کے داعیوں کا کہنا ہے کہ بڑے بڑے تصادموں کو روکنے، چھوٹی جنگوں کو محدود رکھنے، وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کو برباد کرنے اور ایسے ہی متعدد دوسرے مثبت اقدامات کے حصول کے لئے اس کی قسم کے ترقی یافتہ ہتھیاروں ہی سے مداخلت کا کام لیا جا سکتا ہے۔

اخلاقیات کے معاملے کو ایک طرف رکھ دیا جائے تب بھی محدود جنگیں اس لئے بھی اہمیت اختیار کر جائیں گی کیونکہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے حکومتوں کے نزدیک بڑی روایتی فوجوں کے مقابلے میں یہ نسبتاً کم خرچ ہوں گی۔ ان کے استعمال میں محض داؤ پیچ کی خاطر ہی نہیں بلکہ فن حرب کے تقاضوں کے نکتہ نظر سے بھی ان میں اضافہ ضروری ہے۔

ایسا وقت بھی آ سکتا ہے جب حکومتیں ہی نہیں، اقوام متحدہ جیسی بین الاقوامی ایجنسیاں بھی......حتیٰ کہ کرہ ارض پر موجود غیر قانونی کھلاڑی یعنی وقتی طور پر کام کرنے والے خفیہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ادارے جو بھاڑے کے ٹٹوؤں سے لے کر مذہبی جنونیوں تک سے کام لینے میں عار نہیں سمجھے___ محدود ہتھیاروں سے محدود جنگوں کا یہی طریقہ اختیار کرلیں۔

جو لوگ زیادہ پرامن دنیا کے خواب دیکھ رہے ہیں، انہیں ''ایٹمی موسم سرما'' کے تصور کو ایک طرف رکھ کر ابھی سے اپنے دھیان میں اکیسویں صدی کی سیاست، اخلاقیات اور محدود جنگ آزمائی کے ادراک پر توجہ دینی چاہیے۔

فضائی جنگیں

پندرہویں اور سولہویں صدی میں یورپی اقوام اٹلانٹک کے اس پار جانے اور وہاں کے حالات جاننے کے اشتیاق میں بری طرح مبتلا تھیں لیکن نئی دنیا کے انکشاف کے بعد ان کے لئے وہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسی طرح فضائی تسخیر کی ہماری خواہش اب کتنی ہی زوال آمادہ کیوں نہ ہو جائے۔ بہت سے ملکوں کی باہمی محاذ آرائی میں مصروف افواج کا انحصار بہت حد تک میزائلوں اور خلائی سیاروں پر اتنا بڑھ گیا ہے کہ ان سے لاتعلقی اب بہشت بریں کو نظرانداز کرنے کے مترادف ہوگی۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ مستقبل میں جو جنگیں ہوں گی، فضا کی وسعت کو ان میں کلیدی درجہ حاصل ہوگا۔

امریکی فوجی ہیڈ کوارٹر پینٹا گون میں کمانڈ اور کنٹرول پالیسی کے سابق ڈائریکٹر کرنل ایلن کمپسن کا کہنا ہے کہ ''خلیج کی جنگ وہ پہلی لڑائی تھی جہاں لڑاکا فوجوں کو زیادہ تر فضائی مواصلاتی رابطوں کے ذریعے متعین اور متحرک کیا گیا اور اس ذریعے سے انہیں ہدایات دی گئیں اور کنٹرول کیا گیا۔

برطانیہ کے تجارتی فضائی ادارے مارٹا مارکونی سپیس یو کے لمیٹڈ کے سرپیٹر انیس اور ڈیٹس کمنگز کے بیان کے مطابق ''امریکہ کی دو سو ملین ڈالر کی فضائی مشین کو حالات جنگ میں ٹیسٹ کرنے کا یہ پہلا موقع تھا اور یہیں سے فرانس اور برطانیہ کے اس جنگ میں ایک ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کا جواز مہیا ہوا......''

امریکہ کا سب سے پہلا خلائی جاسوس سیارہ اگست 1960ء میں فضا میں چھوڑا گیا۔ خلیج کی جنگ کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے امریکی فضائی مشین میں فضا سے نہایت اعلیٰ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور معیاری تصاویر لینے کے لئے کے ایچ 11 نامی سیارہ، غیر ملکی ٹیلی فون گفتگو ریکارڈ کرنے کے لئے خفیہ میگنم نامی سیارہ، غیر ملکی علاقوں سے ریڈار کے ذریعے مواد جمع کرنے کے لئے لاکھرا سیارہ، سفید بادل نامی جہاز، دشمن کے جہازوں کی نشان دہی کرنے اور انتہائی خفیہ جمپ سیٹ طیارہ غیر ملکی برقی مواصلات کے ذریعے بھیجے جانے والے پیغامات کا پتہ لگانے کے ساتھ ساتھ متعدد دوسرے مواصلاتی سیارے جو موسم اور جہازرانی کے بارے میں معلومات مہیا کرتے تھے، فضائے بسیط میں گردش کر رہے تھے۔ مجموعی طور پر ساٹھ سیارے اتحادیوں کے لئے براہ راست جنگی خدمات ادا کر رہے تھے۔ تاریخ عالم میں آج تک کسی فوج نے ارضی سطح سے بلندی پر ہونے والے واقعات پر اتنا بڑا جوا کبھی نہیں کھیلا۔

چوتھی جیت

''فضا' جنگ میں چوتھی جیت کے اضافے کا باعث بنی۔'' یہ انس اور کمنگز کا بیان ہے۔'' اس نے تصادم کے عام رخ کو متاثر کیا اور زندگی بچانے کا اہتمام بھی۔ فضا ہی سے عراقی فوجوں کی عام حالت اور اتحادیوں کی بمباری سے اسے پہنچنے والے نقصانات کا اندزہ ممکن ہوا۔ سکڈ میزائل کے حملوں کے بارے میں وارننگ بھی فضا ہی سے آتی۔ جہاز رانی کا ایک ایسا محفوظ سسٹم وجود میں لانے کا ذریعہ بھی فضا ہی بنی جس نے میدان میں لڑنے والے ہر سپاہی، میزائل، ٹینک، بمبار طیاروں اور جہازوں کی کارکردگی میں حیرت انگیز صحت اور درستگی سے اپنے فرائض انجام دینے کا سامان بہم پہنچایا۔'' فضا میں اڑنے والے سیاروں سے اہداف کی نشاندہی، زمینی دستوں کو ریتلے طوفانوں سے بچنے، ہوا میں نمی کا تعین کرنے اوراتحادی کمانڈر شواز کوب کو یہ بتانے میں حیرت انگیز چابکدستی کا مظاہرہ کیا کہ صحرا کا کون سا علاقہ ٹینکوں کی نقل وحرکت کا متحمل ہوسکتا ہے۔

ٹیکنیکل ٹیکنالوجی کے ایڈیٹر میکن یارک کا کہنا ہے کہ'' اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ نہایت چھوٹے، معمولی اور خاموشی سے کام کرنے والے متعدد یونٹوں نے بھی فضا سے برآمد ہونے والے مواد سے استفادہ کیا ہے۔ خصوصی آپریشن کے دستوں کو فضائی سیارے ہی لینڈنگ کے لئے پانی کی گہرائی متعین کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ہیلی کوپٹروں کی لینڈنگ زون مخصوص کرنے کے فرائض وہی انجام دیتے ہیں اور فوجوں کی نقل وحرکت و

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غیرہ پر نظر بھی رکھتے ہیں۔'' اس لئے ثابت ہوا کہ فوج کے پورے منظرنامے میں پیدل دستوں کی وسیع نقل وحرکت سے لے کر چھوٹے فوجی دستوں یا ہیلی کوپٹروں پر سفر کرنے والی ٹیموں کی خفیہ دست اندازی تک فضا نے انتہائی اہم کردار انجام دیا ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ کیا اب جنگی اخراجات میں کمی کے وقت فضا کی اہمیت کم کرنے کے متعلق غور کرنے کی نوبت آ سکتی ہے؟ میجر جنرل ٹامس مورہن اس طرف اشارہ کرتا ہے، ''فضائی کمان امریکی فضائیہ کی دو وسعت پذیر کمانوں میں سے ایک ہے۔ دوسری سپیشل آپریشنز ہے۔ فضائیہ کے جنرل ڈونالڈ کبتانہ کا جو امریکی فضائیہ کی دو وسعت پذیر کمانوں میں سے ایک ہے۔ دوسری سپیشل آپرشنز ہے۔ فضائیہ کے جنرل ڈونالڈ کبتا نہ کا جو امریکی فضائی کمان کے سربراہ بھی ہیں، کہنا ہے کہ مستقبل میں فوجوں کی تعداد میں کمی کے زمانے میں ہمیں فضا پر زیادہ انحصار کرنا ہوگا۔ آئندہ فضائی سسٹم ہی کو فوقیت حاصل ہوگی۔ فضا پر یہ بڑھتا ہوا زور پورے عالمی فوجی توازن کی شکل ہی بدل دیتا ہے۔

''فضائی قوتوں'' اور ''غیر فضائی طاقتوں'' کے درمیان ان دنوں اختلافات کی ایک وسیع خلیج حائل ہو رہی ہے جو عوام اور پریس دونوں کی نگاہوں سے مخفی ہے۔ موخرالذکر قوتیں اجتماعی طور سے پھر مُصر ہیں کہ فضا سب کی مشترکہ ملکیت ہے اور پرامن فضائی سرگرمیوں سے استفادہ کرنے کا حق قطع نظر اس حقیقت کے کہ اس پر خرچ کون کر رہا ہے، سبھی کو ہے کیونکہ یہ بنی نوع انسان کی ''مشترکہ میراث ہے، کچھ ملک اقوام متحدہ کی فضائی ایجنسی کے قیام پر زور دے رہے ہیں جس کے ذمے فضائی سرگرمیوں کے کنٹرول اور پھر ان سے حاصل ہونے والے فوائد کی تقسیم کا کام ہو۔ اقتصادی مقاصد کے لئے فضا پر کنٹرول کی خاطر لڑائیوں میں شدت پیدا ہونے کے امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جبکہ متوازی سطح پر فوجی مقاصد کے لئے فضا کے استعمال پر تصادمات کا امکان بھی یقیناً موجود ہے۔

ان دونوں امکانات کے درمیان امتیاز کرنا بعض اوقات مشکل ہو جاتا ہے۔ جیسے جیسے اس میدان میں عالمی مقابلہ بازی زور پکڑ رہی ہے، دنیا بھر کی خفیہ ایجنسیاں، اقتصادی اور ٹیکنالوجی سے متعلق خفیہ سرگرمیوں پر زیادہ سے زیادہ توجہ دے رہی ہیں۔ فوجی خلائی سسٹم جو مصنوعی سیاروں کے ذریعے سننے، تصویریں اتارنے اور حریفوں کی سرگرمیوں کو مانیٹر کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ وہی سسٹم یقیناً معیشی سرگرمیوں سے آگاہی کا موثر ہتھیار ثابت ہوگا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیکن فضا کی فوجی اہمیت محض خلائی سیاروں کی نگرانی تک محدودنہیں ہے۔1987ء میں فضا اور میزائل بردار خلائی سیاروں کی مجموعی تعداد850 تھی۔ ان میں سے امریکہ اور اس وقت کے سوویت یونین کے سات سو سیارے گردش میں تھے جبکہ دوسری تمام اقوام کے سیاروں کی تعداد سو اور ڈیڑھ سو کے درمیان تھی۔1989ء تک ان سیاروں کی مجموعی تعداد دگنی ہوگئی اور1700 تک پہنچ گئی لیکن ان میں سے ایک ہزار کے قریب کا تعلق امریکہ اور سوویت روس کے مقابلے میں دوسرے چھوٹے ملکوں سے تھا۔ دوسرے لفظوں میں غیر سپر طاقتوں کی طرف ے دو برس کی قلیل مدت میں اڑائے جانے والے سیاروں کی تعداد میں دس گنا اضافہ ہوگیا تھا۔

میزائل داغنے کی صلاحیت رکھنے والے یا اس کے حصول کے لئے کوشاں ملکوں میں ایران سے تائیوان اور شمالی کوریا تک کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کے میزائلوں کا تعلق اگرچہ مختلف اقسام سے ہے۔ مثلاً یمن، لیبیا اور شام فراگ۔7 قسم کے میزائل داغ سکتے ہیں جن کی مار ستر میل تک ہے اور جو ایک ہزار پونڈ تک وزنی ہتھیار اور بارود اٹھا کر لے جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بھارت نے1989ء میں اگنی میزائل کا کامیاب تجربہ کیا جو دو ہزار پونڈ بارود اٹھا کر ڈھائی ہزار میل تک لے جا سکتا ہے اور اس طرح اس کے شمال میں واقع دشمن ہمسایہ ملک پاکستان تک ہی نہیں بلکہ افریقہ، مشرق وسطیٰ، روس، وسط ایشیائی مسلم ریاستوں سے لے کر چین اور جنوبی ایشیا کے متعدد دوسرے ممالک تک مار کرنے کے لئے کام میں لایا جاسکتا ہے۔

اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ شمالی کوریا مشرق وسطیٰ کی منڈیوں میں میزائلوں کی بھرمار کر رہا ہے......اور اس سے بھی اہم یہ بات کہ زیادہ میزائلوں کی تیاری کے لئے فیکٹری ٹیکنالوجی بھی فراہم کر رہا ہے، یہ امر یقینی ہے کہ میزائلوں کی بھوکی ریاستوں کے مسائل کم ہونے کی بجائے زیادہ بڑھیں گے۔ بہرحال اس سلسلے میں اعصابی تناؤ میں اضافے کے اثار برابر سامنے آ رہے ہیں۔ شمالی کوریا کے میزائل سکڈ سی ایس جنہیں روڈنگ کا نام بھی دیا جاتا ہے، ایران جیسے خریداروں کو زیادہ دور تک اور بہتر نشانہ لگانے والے میزائل جو صدام حسین کے فرسودہ مال کے مقابل میں بہتر مال کے طور پر پیش کئے جا رہے ہیں۔ یہ عام طور سے پانچ سے چھ سو کلومیٹر تک مار کرنے کے اہل قرار دیئے جاتے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تھوڑے سے ردوبدل کے بعد یہ رفتار دگنی کی جا سکتی ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر ایسے ڈیڑھ سو میزائل خریدنے کے بعد ایران، پہلی بار اسرائیل کو زد میں لانے میں کامیاب ہو سکتا ہے اور شمالی کوریا جاپان پر ضرب لگانے کی پوزیشن میں آ سکتا ہے۔

اس صورت حال نے میزائلوں کی خود رو پیداوار میں کمی کی کوششوں کی حوصلہ افزائی کی۔1987ء میں جی۔7 اقوام......دنیا کے سات سب سے بڑے اقتصادی ممالک نے برآمدات کے ایک مشترکہ کنٹرول پروگرام پر صاد کیا جس کا مقصد دوسرے ملکوں کو ایسے میزائل اپنے تصرف میں لانے سے روکنا تھا جو 7 پونڈ وزن سے زیادہ ایٹمی ہتھیار 175 میل سے زیادہ فاصلے تک اٹھا کر لے جا سکتے ہوں۔اس سلسلے میں طے شدہ معاہدے کو میزائل ٹیکنالوجی کنٹرول کے قانون کا نام دیا گیا تھا، مگر امریکہ کے ہتھیاروں کے کنٹرول اور تخفیف اسلحہ ایجنسی کے سابق سربراہ کیتھلین بیلی کے اس بیان پر کہ ''اس معاہدے سے جہاں تھوڑی بہت مدد حاصل ہو سکتی ہے وہاں یہ حقیقت بھی مدنظر رہنی چاہیے کہ اس کے بعد سے میزائل سازی کی رفتار میں اضافے نے صورت حال زیادہ خراب کر دی ہے۔'' ہم آئندہ صفحات میں زیادہ تفصیل سے اظہار خیال کریں گے۔

ایران سے اسرائیل تک

اس خطرے کو جیسے جیسے زیادہ شدت سے محسوس کیا جاتا ہے ویسے ہی بیشتر متعلقہ ممالک فضائی نگرانی کا اپنا اپنا نظام قائم کرنے کے بارے میں زیادہ سنجیدگی سے سوچ بچار کرنے لگتے ہیں۔ قریبی اتحادی بھی ایسی خفیہ معلومات کے لئے جن کا تعلق زندگی موت جیسے اہم معاملات سے ہو اور جس کے بارے میں خصوصی سیارے خفیہ معلومات مہیا کر سکتے ہوں، دوسروں پر انحصار کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔

فرانس کے وزیر دفاع نے حال ہی میں یورپی اقوام کو فضائی نگرانی کے لئے مصنوعی سیاروں کا اپنا سسٹم وجود میں لانے کا مشورہ دیا ہے تاکہ وہ اس میدان میں امریکہ کے محتاج نہ رہیں۔ اس کے جواب میں متحدہ عرب امارات نے مساچوسٹس کی فرم لیٹن آئٹیک آپٹیکل سسٹم سے اپنا جاسوس سیارہ خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا جس پر متعدد امریکی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حلقوں نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور یہ خدشہ ظاہر کیا کہ ایسے مصنوعی سیارے کے حصول کے بعد متحدہ عرب امارات کی حکومت اس سے حاصل شدہ معلومات میں دوسری اور خاص طور سے امریکہ مخالف عرب ریاستوں کو حصہ دار بنا سکتی ہے لیکن وہ حکام جو اس قسم کی خرید وفروخت کے حامی ہیں یہ اشارے کر رہے ہیں کہ بے شمار دوسرے ملک جیسے مثال کے طور پر جنوبی کوریا اور سپین وغیرہ اپنا فضائی نظام ترتیب دینے کے لئے کوشاں ہیں اور اب اس بارے میں کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ امریکہ اسے پسند کرے یا نہ کرے، مصنوعی سیاروں کے ذریعے خفیہ معلومات کی بہم رسانی کا نظام روز بروز وسعت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

میزائلوں سے محفوظ دنیا؟

23 مارچ 1983ء کو اس وقت کے امریکی صدر رونالڈ ریگن نے ''سٹریٹیجک ڈیفنس انیشیسی ایٹو'' کے نام سے ایک حفاظتی منصوبہ پیش کیا۔ اس پروگرام کا مقصد امریکی سرحدوں کے گرداگرد ایک ایسی حفاظتی ڈھال کا قیام تھا جس میں سے میزائل گزر کر امریکہ کے اندر نہ پہنچ سکیں۔ اس تجویز کے خلاف اٹھنے اور ایک عشرے تک جاری رہنے والے شور وشعب کا ذکر کرنے کا یہ موقعہ نہیں ہے، بہرحال اس مرکزی خیال کو کہ فضا میں ایسے ہتھیار متعین کئے جائیں جو سوویت بلاسٹک میزائلوں سے ایٹمی مواد خارج ہونے سے قبل ہی انہیں مار کر گرا سکیں، فوراً ہی ''سٹار وار'' کا نام دے دیا گیا اور مخالفوں نے یہ کہہ کر اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا کہ یہ ناقابل عمل ہے اور یہ کہ اس سے عدم استحکام پھیلنے کا خطرہ بڑھ جائے گا۔

لیکن امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان ایک مکمل ایٹمی جنگ کا خطرہ چونکہ پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا اس لئے ریگن کے بعد آنے والے امریکی صدر بش (سینئر) نے 29 جنوری 1991ء کو اس پروگرام پر دوبارہ توجہ مبذول کی۔ اب اس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ اتفاقی یا چھوٹے پیمانے کے ایٹمی حملوں کے خلاف تحفظ فراہم کرنے پر توجہ دی جائے اس نئی تجویز کا تعلق زیادہ تر ان ہتھیاروں کو غیر موثر یا محدود رکھنا جو زمینی اڈوں پر موجود تھے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

13 مئی1993ء کو صدر کلنٹن کے وزیر دفاع لے اسپین نے بالآخر ''سٹار وار'' کے عہد کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اس کی جگہ معمولی حجم کے ایک پروگرام کا بلاسٹک ڈیفنس کے نام سے اجراء کیا گیا جس کا مقصد امریکی اور اتحادی افواج کو خلیج کی جنگ جیسے علاقائی تصادمات میں سکڈ میزائل کی قسم کے ہتھیاروں سے محفوظ رکھنا تھا۔ فضائی ضرورتوں کے پیش نظر تیار کئے جانے والے ہتھیاروں پر جاری مزید کام ختم کر دیا گیا۔ اس محدود پروگرام کے پیچھے یہ مفروضہ نظر آتا ہے کہ آج کے زمانے میں ملکوں اور حکومتوں کو اپنے مخالفوں کی طرف سے تھوڑی دور تک مار کرنے والے میزائلوں سے زیادہ خطرہ ہے۔

امریکی فضا کی کمان کے سربراہ جنرل چارس ہانز کی بات اگر درست تسلیم کر لی جائے تو پھر اس مفروضے کو بجائے خود تھوڑی دور تک مار کرنے کے قابل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کا کہنا ہے ''جس ٹیکنالوجی کے طفیل ایس ایس 25 کی تیاری (ایک قسم کا وزنی متحرک اور بہت دور تک مار کرنے والا میزائل) ممکن ہوئی ہے۔ اس کی مہربانی سے اب سے آٹھ دس برس بعد اس میزائل کا حصول زیادہ قیمت ادا کرنے والے کسی بھی گاہک کے لئے ممکن ہوگا۔ اس کا یہ اندازہ سی آئی اے کے اس اندازے سے ملتا جلتا ہے کہ ایک عشرے کے بعد ایک تہائی دنیا، ایٹمی ہتھیاروں کو میزائل پر لاد کر امریکہ پر حملہ کرنے کی استعداد حاصل کر چکی ہوں گی۔

قصہ مختصر یہ کہ بڑھتے ہوئے اخراجات، بجٹ میں کمی اور شدید مخالفتوں کے باوجود، میزائل کے دفاعی نظام کے لئے دباؤ جاری رہے گا اور جیسے جیسے میزائل کے ذریعے ایٹمی، کیمیائی اور بائیولاجیکل ہتھیاروں کی ترسیل کے امکانات میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ یہ دباؤ زیادہ شدت اختیار کرے گا۔ (ان مہلک ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے معاملہ میں بھی ہم بعد میں غور وخوض کریں گے)

مستقبل میں جھانکتے ہوئے حقیقتاً ہم صرف ایک نہیں بلکہ متعدد انٹی میزائل نظاموں کے بارے میں اندازے قائم کر سکتے ہیں۔ یہ سوچنا غلط نہ ہوگا (لیکن ایسا اسی صورت میں ہوگا اگر امریکہ اور ان ملکوں کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع ہوتی گئی) شمالی کوریا کے قریب ہونے کی وجہ سے جاپان امریکی پیٹرائیٹ میزائل کو زیادہ بہتر بنانے کی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کوششوں میں لگا ہوا ہے۔ برطانیہ کی وزارت دفاع، بلاسٹک میزائل کے توڑ کے ایک محدود سسٹم کا بغور مطالعہ کر رہی ہے تاکہ انگلستان کو1875ء میل کے فاصلے سے داغے جانے والے میزائل کے حملے سے محفوظ کیا جا سکے۔ (سرکاری وضاحت کے مطابق یہ فاصلہ اس لئے تعین کیا گیا ہے کہ ایک چینی ایس ایس لے میزائل اگر دور دراز لیبیا سے داغا جائے تو شمالی سکاٹ لینڈ اس کی زد میں آ سکتا ہے۔ فرانس بھی بلاسٹک میزائل کے توڑ کے لئے اپنا سسٹم بنانے کے عمل میں مصروف ہے۔

مغربی یونین کے ممبر ممالک کے خیالات میں تبدیلی بہرحال اور بھی حیرت انگیز ہے، یہ ملک برسوں میزائل کے خلاف دفاعی نظام کے بارے میں شک وشبے کا اظہار کرتے رہے۔ ستمبر 1993ء میں روم میں ہونے والی میٹنگ میں یورپی یونین کے ممبران اپنی تقریروں میں خاصی پریشانی کا اظہار کرتے رہے۔ اٹلی کے وزیر دفاع نے جنوب میں واقع تمام یورپی ممالک کو درپیش خطرات کی خصوصی نشان دہی کی اور بلاشبہ یہ خطرہ میزائلوں کی تیاری میں وسعت اور وسیع پیمانے پر تباہی مچانے والے ہتھیاروں کی وجہ سے محسوس کیا جا رہا تھا۔ وزیر دفاع کی تقریر میں زور دیا گیا تھا کہ ''اٹلی، مذہبی جنونیوں' قوم پرستوں اور لسانی تصادمات کی وجہ سے، فوجی مداخلت کے خطرات کی زد میں ہے۔ اس کے جنوب میں لیبیا کی موجودگی، شمالی افریقہ میں متشددانہ اسلامی تحریکوں کی زد میں آنے والی حکومتیں اس کے ہمسائے میں ہیں۔ مشرق میں بلقانی ریاستوں کی جنگیں اور خود یورپ کی لسانی اور سیاسی تقسیم اور تصادمات کی وجہ سے اٹلی کے وزیر دفاع کی طرف سے اٹلی کے خطرے میں ہونے کے متعلق اس کے الفاظ دیر تک فضا میں بڑی بلند آہنگی سے گونجتے رہے۔

اس لئے صدر رونالڈ ریگن کے ابتدائی دفاعی منصوبے کو مردہ قرار دینا اگرچہ غلط نہ ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس وقت دنیا واشنگٹن کی مدد سے یا اس مدد کے بغیر اپنے آپ کو سکڈ اور اس سے بھی بڑے اور مستقبل میں تیار ہونے والے زیادہ موثر میزائلوں سے محفوظ رکھنے کی تیاری میں پوری طرح مصروف ہے۔

ایٹم بم رچمنڈ پر

میزائلوں کے خلاف قائم کئے جانے والے دفاعی سسٹم کے ساتھ ہی مصنوعی خلائی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سیاروں کے مقابلے کے ہتھیاروں (اے ایس۔ اے ٹی) کی تیاری کی طرف بھی توجہ مبذول کرنی پڑے گی جس کا مقصد حریفوں کو آنکھوں اور کانوں سے محروم کرنا ہوسکتا ہے۔1993ء میں جب امریکی کانگرس نے ملک کے فوجی بجٹ میں کٹوتیوں کا فیصلہ کیا تو امریکی فضائیہ کے چیف آف سٹاف نے اپنی ایک تقریر میں نہایت دردمندانہ اپیل کرتے ہوئے کہا: ''ہمارے لئے ایسا راستہ تلاش کرنا لازمی ضرورت کا درجہ رکھتا ہے جس پر چلتے ہوئے ہم ایسی صلاحیت حاصل کرسکیں جس کی بناء پر دنیا کی کوئی دوسری قوم، فضا میں سخت محنت سے حاصل کی ہوئی ہماری برتری سے ہمیں محروم نہ کر سکے۔ فضائیہ کے سربراہ نے امریکہ کی فضائی سٹریٹیجی کے پورے تصور کو نئی شکل دینے کی تجویز پیش کرتے ہوئے یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ ''ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ اپنے مخالفوں کو اپنے خلاف فضا استعمال میں لانے کی استعداد سے محروم کر دیں۔''

اس کا کہنا تھا کہ اس مقصد کے حصول کے لئے امریکہ کو ''اوزاروں'' کے ایک سیٹ کی ضرورت ہوگی۔ ان میں خلائی سیاروں کی کارکردگی کے توڑ کا اوزار بھی شامل ہونا چاہیے۔'' مگر اس کی یہ بات سنی ان سنی کر دی گئی اور اس تقریر کے ایک ماہ بعد خلائی سیاروں اور میزائلوں کے توڑ کے ایک چھوٹے سے فوجی پروگرام کو مسترد کر دیا گیا۔

لیکن امریکہ کو جو مسئلہ درپیش تھا اسے تو بہرحال مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ اخبار نیوری پبلک میں ایلیٹ اے ٹو ہن رقم طراز ہے، ''خلیج کی جنگ میں ہمیں اپنے خلائی سیاروں کو اندھا کرنے یا ناکارہ بنانے کی کسی کوشش کا سامنا نہیں کرنا پڑیا۔ ہمارے دشمن کے پاس فضا تک رسائی کا اپنا کوئی ذریعہ یا موقعہ موجود ہی نہیں تھا، لیکن یہ صورت حال مستقبل قریب میں تبدیل بھی ہوسکتی ہے۔

اب یہ بات بالکل واضح ہوکر سامنے آ گئی ہے کہ مستقبل میں امریکہ سے متصادم کوئی بھی علاقائی قوت جو پہلا کام کرے گی وہ یہ ہوگا کہ اسے اپنی آنکھیں آسمان پر مرکوز کرنا ہوں گی۔ ستم کی بات یہ ہے کہ چونکہ امریکہ کا زیادہ انحصار اس کے فضائی اثاثوں اور ترقی یافتہ مواصلاتی نظام پر ہے اس لئے یہ کسی بھی وقت خطرے کی زد میں آ سکتا ہے، کوئی بھی مخالف اسے ناکارہ بنانے یا بگاڑنے میں کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بہت دن پہلے 1961ء میں سوویت یونین کے وزیر دفاع مارشل روڈ یان نے کمیونسٹ رہنماؤں کو بتایا تھا کہ میزائلوں کو دوران پرواز تباہ کرنے کا مسئلہ کامیابی سے حل کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد اسی سال جولائی میں خروشیف لاف زنی کر رہا تھا کہ سوویت میزائل فضا میں ایک مکھی تک کو ضرب شدید لگا سکتے ہیں۔ سوویت یونین 1968ء کے اوائل ہی میں اے ایس اے ٹی نامی ہتھیار ٹیسٹ کر چکا تھا۔

1980ء تک سوویت یونین نے فضا میں اہداف کو نشانہ بنانے کے کم از کم بیس ٹیسٹ مکمل کر لئے تھے اور 14 تجربوں کے ایک سلسلے میں 9 کو مہلک قرار دیا جا چکا تھا۔ اس کے مقابلے میں امریکہ میں مصنوعی سیاروں کے توڑ کا کوئی ہتھیار ممکن ہے جلد ہی کامیاب ہو جائے لیکن ابھی تک اس قسم کی کوئی کوشش نہ کرنے کا فیصلہ ہی برقرار ہے۔ حقیقتاً اس نوع کے ہتھیار کی تیاری کے پروگرام کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ اس کی بجائے وسیع پیمانے پر انتقامی کاروائی کے پروگراموں پر ہی تکیہ کیا جا رہا ہے۔

مثلاً فیصلہ یہ ہے کہ کسی امریکی مصنوعی سیارے پر براہ راست حملے کو اب قریب قریب ایٹمی حملے کی سطح پر لیا جائے گا۔ ایک محقق کے بیان کے مطابق ایسی کسی بھی کاروائی کو واشنگٹن پر ایٹم بم پھینکنے کے برابر تو قرار نہیں دیا جائے گا البتہ ایسی کسی کوشش کو ورجینیا میں رچمانڈ پر ایٹم بم گرانے کی کوشش کا نام ضرور دیا جائے گا۔

مصنوعی سیاروں کو مارنے کا طریقہ

اس قسم کی صورت حال سے بچنے کے لئے امریکہ اور سابق سوویت یونین کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے دونوں نے ایک دوسرے کے مصنوی خلائی سیاروں پر حملہ نہ کرنے کی پابندی قبول کر لی لیکن کسی مصنوعی سیارے کو نشانہ بنا کر نیچے گرانا اس کے مالک کو اندھا کرنے کا مشکل راستہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ آسان، سستا اور موثر طریقہ سیارے کو نرم روی سے ہلاک کرنے یعنی اسے نقصان پہنچانے، بگاڑنے، تباہی کے راستے پر ڈالنے یا اس کے تیار شدہ پروگراموں میں ردوبدل کرنے کا ہو سکتا ہے۔ یہ یقین کرنے کی وجوہ موجود ہیں کہ ایک بار سوویت یونین ایک امریکی سیارے کے کام میں دخل اندازی کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جسے بعد میں بڑے پراسرار طریقے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے ''مردہ'' قرار دینے کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ واقعہ دونوں سپر طاقتوں کے اس فیصلے پر پہنچنے سے بہت پہلے کی بات ہے کہ فضا میں توڑ پھوڑ کا ایسا کھیل بہت خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔

امریکہ کے خلائی سیارہ سسٹم کے کچھ اجزاء اس سے کہیں زیادہ غیر محفوظ اور حملے کی زد میں آ سکتے ہیں جتنا کہ ان کے بارے میں عام خیال ہے۔ خلیج کی جنگ کے متعلق پینٹاگون کی فائنل رپورٹ میں کہا گیا ہے۔ ''امریکہ کے خلائی مواصلات ذرائع جام کئے جانے، رکاوٹوں کی زد میں آنے، مانیٹرنگ کا شکار ہونے اور چکمہ دینے والوں کے چکر میں پھنسنے کی حد تک قطعاً محفوظ نہیں تھے بشرطیکہ دشمن میں یہ سب کرنے کی صلاحیت ہوتی یا وہ ایسا کرنے کا فیصلہ کرسکتا۔''

امریکی میرین کور ہیڈ کوارٹرز میں کمان اور کنٹرول کے ماہر رونالڈ ایلیٹ کے انداز کے مطابق 11 برس سے بھی زیادہ بری صورت حال یہ ہے کہ کمپیوٹروں اور مواصلاتی نیٹ ورکس میں استعمال ہونے الی بیشتر اشیاء کا تعلق چونکہ معمول سے ہٹ کر کارآمد ہونے والی چیزوں سے ہوتا ہے اس لئے ان میں شرارتاً نصب کئے جانے والے غیر ضروری اجزاء کا پتہ چلانا کچھ زیادہ ہی مشکل ہوتا ہے۔ یوں مصنوعی سیاروں اور وائرلیس کمپیوٹر نیٹ ورکس کی کارکردگی خراب کرنے کے مواقع ڈھونڈنے والوں کو آسانی سے ایسے مواقع مل جاتے ہیں اور چونکہ اس قسم کے سسٹم ڈیزائن اور نصب کرنے والے اور ان کا انتظام سنبھالنے میں بہت زیادہ لوگ حصہ لیتے ہیں اور چونہ متعلقہ ملکوں کے سیاسی ڈھانچے غیر مستحکم ہوتے اور سیاسی اتحادوں میں رخنہ اندازی ہوتی رہتی ہے، اس لئے یہ بات یقینی ہے کہ سیاروں کے توڑ کے جاسوسی نظام میں موجود مسائل آنے والے وقتوں میں کئی گنا بڑھ سکتے ہیں۔

سرد جنگ کے زمانے میں دشمن کا سب کو پتہ ہوتا تھا......آنے والے کل میں شاید اپنے کسی حریف کی نشان دہی کا امکان ہی باقی نہ رہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح آج دہشت گردوں کے حملوں کے بعد کی صورت حال میں محسوس کیا جاتا ہے۔

بلیک ہول اور جال میں ڈالنے کے دروازے

پہلی بات تو یہ ہے کہ امکانی حریفوں کی تعداد اور ان کی ہمہ جہتی مخالفت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دشمن کے مصنوعی سیاروں اور ان سے متعلق

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کمپیوٹروں اور نیٹ ورکس کو تہس نہس کرنے یا ان میں گڑ بڑ کرنے کے زیادہ نازک طریقے وجود میں آ رہے ہیں۔ (نام نہاد بلیک ہولز، وائرس، جال میں پھانسنے کے دروازے وغیرہ۔ کمپیوٹروں کے اندرونی نظام میں دخل اندازی کرنے والوں کی نو دریافت تکنیک اور انہیں نقصان پہنچانے کے حالیہ طریقے ممکنہ اور معمول کے مطابق مروج معاملات ہیں۔)

تیسری بات یہ ہے کہ اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ کسی حریف کا سسٹم تباہ کرنے والا ایسا انتظام کرے کہ اس پر شک ہونے کی بجائے کوئی تیسرا فریق شک و شبے کی زد میں آ جائے۔ مثلاً چین امریکہ کے مواصلاتی نظام پر اس طرح حملہ آور ہو کہ دیکھنے والوں کو یہ سب اسرائیل کے جاسوسوں کی کاروائی نظر آئے یا اس کے برعکس معاملہ بھی ہوسکتا ہے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ اس کام کے لئے جس ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے وہ ریڈیو مرمت کرنے کی کسی چھوٹی سی دکان سے بھی مہیا ہوسکتا ہے اور اس کی مدد سے مصنوعی سیاروں کے سگنلوں، زمینی سٹیشنوں اور ان سے متعلقہ مجموعی نیٹ ورکس کے کام میں مداخلت کی جا سکتی ہے۔

آخری بات یہ کہ آپ کسی دہشت پسند گروہ، منشیات کے کسی بے تاج بادشاہ حتیٰ کہ کسی ایسی ننھی منی ریاست کے خلاف جس کے پاس حملہ آور ہونے کا کوئی انفراسٹرکچر یا شہری کمان ہی موجود نہیں ہے جوابی انتقامی کاروائی کیسے کریں گے؟ اور ''ان فو'' دہشت پسندوں کی کسی ایسی ٹیم سے کیسے نپٹیں گے جس کے متعلق یہ اطلاع ہو کہ وہ امریکہ پہنچ رہی ہے اور اس کا پروگرام ملک کے انتہائی غیر محفوظ مواصلاتی نظام اور مواصلاتی سیاروں سے اس کے رابطوں میں رخنہ پیدا کرنا ہے یا چلئے کسی ایسی ٹیم کے خلاف کیا کریں گے جو امریکہ پہنچی ہی نہیں بلکہ آدھی دنیا کے فاصلے پر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی اس نیٹ ورکس میں دخل اندازی کی کوشش کر رہی ہے جو مواصلاتی سیاروں سے حاصل ہونے والے مواد کو پراسیس کرکے آگے پہنچاتا ہے......اس مسئلے کی طرف ہم جلد ہی دوبارہ لوٹیں گے۔

سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد دنیا کو اس خطرے کا احساس ہوا کہ روس کے ایٹمی سائنس دان ملازمتوں سے فارغ ہونے اور مالی مدد میں کمی ہونے کے بعد اپنی خطرناک معلومات اور تجربات لیبیا یا پاکستان یا ایٹمی رازوں کی جو یا دوسری حکومتوں کے پاس، ملازمتوں کے حصول یا نقد رقوم کے عوض فروخت کرنے پر مجبور ہو سکتے ہیں۔ مصنوعی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سیاروں کے انجینئر اور میزائلوں کے سائنس دانوں کے بارے میں بھی یہی خدشہ ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اس فیصلے پر پہنچنے میں کسی کو دقت نہیں ہونی چاہیے کہ اپنی جنگ سے اکھڑے ہوئے یہ ناآسودہ اور مایوسی کے شکار ماہر اور میزائل انجینئر جو مثلاً قازقستان کے بٹورائم میزائل کے تجرباتی اڈے سے فارغ کر دیئے گئے ہیں، چین کو خفیہ معلومات کی پیش کش کر سکتے ہیں، اس کے بعد صدام حسین کو بھی۔

یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ مثال کے طور پر چین، سابق سوویت یونین کے ماہروں کی مدد سے یہ جان سکتا ہے کہ سوویت یونین کے سسٹم کے کسی حصے کو جوڑ توڑ کے ذریعے کس طرح بگاڑا جا سکتا ہے۔ اس میں اس کے مقاصد ظاہر ہے اپنے ہوں گے۔ سوچنے کی اصل بات یہ ہے کہ کیا امریکہ کی ''دوسو بلین ڈالر کی فضائی مشین'' دخل اندازی کے خطرات سے محفوظ ہے؟

سیاروں کا تحفظ محض فوجی معاملہ نہیں ہے۔ دنیا میں قیام امن کیلئے ہونے والے متعدد معاہدوں......جن میں ایٹمی کیمیائی اور بائیو لاجیکل ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے معاہدے شامل ہیں۔ نیز فوجی نقل وحرکت کو محدود رکھنے، متحارب ملکوں کے درمیان اعتماد بحال کرنے، قیام امن کی کوششوں کو بروئے کار لانے اور آئندہ ماحولیاتی جنگوں سے دنیا کو محفوظ کرنے کے معاہدے ابھی تک توثیق کے مراحل میں ہیں یا عمل درآمد کے منتظر۔ لیکن کوئی بھی معاہدہ اس وقت کارآمد ہوتا ہے جب اس پر دستخط کنندگان کی نگرانی کا انتظام ہو اور مانیٹرنگ اور اس کی تصدیق کرنے کا اہم ترین ذریعہ خصوصی سیاروں کی مدد سے کی جانے والی نگرانی ہی ہو سکتا ہے۔

ان تمام اسباب کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ خصوصی طور پر کسی کو معلوم نہیں کہ آئندہ آنے والے عشروں میں فضا کی لڑائیاں اور تدارک جنگ کی کوششیں کیا رخ اختیار کرتی ہیں تاہم یہ بات بڑی واضح ہے کہ یہ دونوں صورتیں، اکیسویں صدی میں زیادہ مرکزی کردار انجام دیں گی۔

اس صدی کے خاتمے سے پہلے، اگر جنگ کے مخالفوں نے دنیا کو مدافعتی طریقے اختیار کرنے پر رضامند نہ کر لیا تو ہمارے بچے فضا میں تصادمات کو بہت زیادہ بلندی تک اٹھتے اور کہیں زیادہ خطرناک صورت اختیار کرتے ہوئے دیکھیں گے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فضا کا مرکزی علاقہ

دنیا کے ترقی یافتہ ممالک سمیت آج کسی کے پاس بھی فضا میں دور تک رسائی کا کوئی جامع فوجی نظام موجودنہیں ہے۔ اس نکتے پر بڑی اہم اور بہت حد تک نظرانداز کی جانے والی کتاب کے مصنف جان کولنس نے بہت زور دیا ہے اس میں زمین اور چاند کے پورے سسٹم کا تجزیہ فوجی اصطلاح میں کیا گیا ہے۔ مصنف کو یہ ذمہ داری امریکی کانگرس کی طرف سے تفویض کی گئی تھی۔ اس کتاب کا نام ہے فوجی فضائی دستے، آئندہ پچاس برس میں، یہ کتاب گہرے غور وخوض سے مطالعہ کی مقتضی ہے۔

کولنس جو کانگرس لائبریری کا ایک سینئر تجزیہ نگار ہے، سیاسی جغرافیائی تقاضوں کی روشنی میں کام کرنے والے ہافورڈ جے میکندر(1947-1861) کا ذکر کرتا ہے جس نے گذشتہ صدی کے موڑ پر یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ مشرقی اور مرکزی یورپ اور روس عالمی قوت کے مرکزی خطے کی حیثیت رکھتے ہیں جبکہ افریقہ اور یوریشیا کا باقی ماندہ حصہ عالمی جزیرہ ہے۔

میکندر نے اس سلسلے میں ایک ضابطہ وضع کیا جسے بار بار دہرایا جاتا رہا ہے اور جو اس طرح ہے:

☆ مشرقی یورپ پر حکمرانی کرنے والا عالمی قوت کے مرکزی خطے کا حکمران ہوتا ہے۔
☆ مرکزی خطے پر حکمرانی کرنے والے کے پاس عالمی جزیروں کی کمان میں ہوتی ہے۔
☆ اور جو عالمی جزیروں کا حکمران ہے، وہی دنیا کا حاکم ہے۔

اس ضابطے کو سامنے آئے تقریباً ایک صدی گزر چکی ہے لیکن میکندر کے اس نظریے کو اب زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا کیونکہ ہوائی اور فضائی قوتوں نے گذشتہ صدی کے موڑ پر سامنے آنے والے اس سیاسی جغرافیائی نظریے کو فرسودہ بنا دیا ہے، مگر کولنس نے میکندر کے نظریے کی روشنی میں ڈرامائی طور پر ایک نیا متوازی نظریہ پیش کر دیا ہے۔ ''ارضی فضا'' وہ کہتا ہے، ''جو کرہ ارض کو پچاس ہزار میل یا اس سے بھی زیادہ بلندی تک گھیر لیتی ہے اسی صورت حال کا سبب بن سکتی ہے جو اکیسویں صدی کے وسط تک دنیا میں فوجی برتری کی کلید تصور ہوگی۔''

☆ جو کوئی ارضی فضا پر حکمران ہوگا، زمین پر بھی اس کی حکمرانی ہوگی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

☆ چاند پر حکمرانی کرنے والا ہی ارضی فضا کا حاکم ہوگا۔
☆ ایل چار اور ایل پانچ پر حکمرانی کرنے والا زمین اور چاند کے پورے نظام کا حاکم ہوگا۔

ایل چار اور ایل پانچ چاند کی آزادی یا رہائی کے مقامات ہیں۔ فضا کے یہ وہ دو مقامات ہیں جہاں پر زمین اور چاند کی کشش بالکل یکساں ہے، اصولاً ان مقامات پر قائم کئے جانے والے فوجی اڈے بہت لمبے عرصے تک ایک ہی پوزیشن میں بغیر زیادہ ایندھن استعمال کئے قائم رہ سکیں گے۔ وہ کل کے فضائی جنگجوؤں کیلئے اونچی گراؤنڈ کا کام بھی دیں گے۔

فی الحال یہ ساری باتیں زبانی جمع خرچ ہی نظر آتی ہیں لیکن ٹینکوں اور فضائی جنگوں کے بارے میں ابتدائی پیش گوئیاں بھی پہلے ایسی ہی تھیں جو کوئی بھی ایسے نظریات کو کلیتاً ایک طرف رکھ دیتا ہے یا اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ فوجی مقاصد کے لئے فضا کی تسخیر کا مرحلہ ختم ہو چکا ہے یا یہ کہ بجٹ کی کٹوتیاں اس دوڑ کو ختم کر دیں گی وہ یقیناً کوتاہ نظری کا شکار ہے۔

تیسری لہر کی جنگ ہی نہیں بلکہ تدارک جنگ کی کوششیں بھی اسی طرح زمین سے باہر کی کاروائیوں پر انحصار کرتی نظر آئیں گی۔ مدافعتی امن پسندی کے تقاضے ہمیں حال سے آگے جھانکنے کی ضرورت کا احساس دلاتے ہیں، معاملہ محض ڈالروں کا نہیں بلکہ انسانی مقدر کا مسئلہ درپیش ہے۔

روبوٹ، محاذ جنگ پر

ازمنہ وسطیٰ کی ایک یہودی داستان میں ''غلام'' نام کی ایک ایسی کٹھ پتلی کا ذکر ہے جو اپنے مالک کی جان بچانے کے لئے' پراسرار طور پر زندہ شخصیت کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ آج ایسے غلاموں کی ایک نئی نسل ہمارے سامنے ہے اور یہ ہیں جنگجو روبوٹ جنہیں جنگ اور تدارک جنگ دونوں کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے والا کوئی فرد بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

روبوٹوں کو میدان جنگ میں اتارنے کی بات خاصی پرانی ہے۔ پہلی جنگ عظیم

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے بعد سے فوجی روبوٹوں کی تیاری کا معاملہ عملی طور سے یکے بعد دیگرے مختلف قسم کی رکاوٹوں اور پشیمانیوں کا ذریعہ بنتا رہا ہے۔ بے خبر لوگ تو لڑنے والے روبوٹوں کا ناطہ سائنس فکشن کی ''روبوکوپ یا ٹرمینیٹر 2'' قسم کے فلموں سے جوڑتے رہتے ہیں۔ جبکہ روایتی حکام اس بارے میں شکوک وشبہات ہی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے فوجی مفکرین بہرحال اب اس ٹیکنالوجی کے بارے میں سنجیدگی سے غور وفکر کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نئے حالات روبوٹائزیشن کی طرف پہلے کے مقابلے میں اب کہیں زیادہ مضبوطی سے بڑھنے پر مجبور کر دیں گے۔

فضا اور ٹی آر ڈبلیو کے شعبہ دفاع کے سابق نائب صدر لیوس فرینکلن کو جو ایک کامیاب دفاعی کنٹریکٹر بھی ہے پورا پورا یقین ہے کہ آئندہ دس پندرہ برسوں میں روبوٹ سسٹموں پر مشتمل ایک چھوٹا موٹا سیلاب فوجی زندگی میں دخل انداز ہو چکا ہوگا۔

اس کی واحد مثال یہ پیش کی جا سکتی ہے کہ خلیج کی جنگ میں ریموٹ کنٹرول کے ذریعے اڑائے جانے والے طیاروں یا آر پی ویز کو زبردست اہمیت حاصل ہوئی۔ مجلّہ ''ڈیفنس نیوز'' کے مطابق اس جنگ کے دوران ان طیاروں کی حمایت میں اس حد تک ہیجان انگیز جوش کا مظاہرہ ہوا کہ اس کے بعد پائلٹوں کے بغیر اڑائے جانے والے ان بمبار طیاروں کی مانگ میں زبردست اضافہ ہو گیا۔

قسم قسم کے فوجی روبوٹ تیار کرنے والے صنعت کار دفاعی اخراجات میں کمی کے پروگراموں کے باوجود اس عشرے کے خاتمے تک اس شعبے میں چار ارب ڈالر کی مارکیٹ کی توقع کر رہے ہیں۔ ان کا اندازہ ہے کہ اس مد میں امریکی اخراجات میں دس گنا اضافہ ہونے والا ہے۔ بحریہ کی اکیڈیمی کے فیکلٹی ممبر لیفٹیننٹ جوزف بھیل کا خیال ہے کہ ''ان لوگوں کی یہ پُرامیدی رنگ لاتی ہے یا نہیں، یہ بات طے ہے کہ مستقبل کی جنگوں میں دوسرے ملک جنگ کا یہ طریقہ امریکہ کے خلاف بھی استعمال کر سکتے ہیں۔''

متعدد ایسے حقائق جن کا تعلق طویل المدتی معاملات سے ہے ان پیش گوئیوں کو حقیقت پسندانہ قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے پہلی حقیقت کا تعلق ٹیکنالوجی سے ہے۔ جوں جوں کارخانوں اور دفاتر میں روبوٹوں کی تعداد بڑھتی ہے، اس موضوع پر شہری تحقیقات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اس چپس سے جو ٹیلیفون نیٹ ورکس کی خرابی از خود درست

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرنا پڑتا ہے۔ ''سمجھ داری سے تعمیر کی جانے والی عمارتیں'' اور سمارٹ شاہراہوں کی تعمیر کی بنیاد مستقبل کی روبوٹ سے متعلق معیشت کی تیز رفتاری سے منسلک کی جا رہی ہے۔ یہی صورت حال فوجی شعبے میں ان کے عمل دخل کی راہ ہموار کرے گی۔

سخت قسم کی سودے بازی

ایسی شہری معیشتوں میں جہاں لیبر سستی ہے، روبوٹائزیشن کا عمل ست ہے۔ جیسے جیسے لیبر مہنگی ہوتی جاتی ہے، خودکار مشینوں بالخصوص روبوٹوں سے کام لینے کی طرف توجہ مبذول ہوتی جاتی ہے۔فوج پر اس کا اطلاق بھی اس اصول کے تحت ہوتا ہے۔ جبری بھرتی کے ذریعے جن ملکوں میں کم تنخواہ پر سپاہی آسانی سے میسر آ جاتے ہیں ان میں متبادل اور ٹیکنالوجیکل انتظام کی کوشش کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ اس کے مقابلے میں پیشہ ورفوجیوں کو بڑے بڑے مشاہرے پر لینے کی نوبت آ جائے تو روبوٹ میدان جنگ کے سستے سودے کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

کیمیائی ، جراثیمی یا ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کی وجہ سے ہی روبوٹائزیشن کے عمل کو تقویت ملے گی کیونکہ جنگ کے میدان ان ہتھیاروں کی موجودگی میں زہریلے اثرات سے پُر ہوں گے جو زندہ سپاہیوں کے لئے خطرناک ہو سکتے ہیں جب کہ جنگجو روبوٹوں کی تیاری کے وقت یہ صورت حال پیش نظر رکھ کر کام آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

فوجوں کو روبوٹائز کرنے کے حق میں سب سے اہم عنصر عوام کا رویہ ہوسکتا ہے جن کو اس طرح جانی نقصان میں کمی کی حقیقت کو قبول کرنے کے لئے آسانی سے تیار کیا جا سکتا ہے۔ امریکی فوج کی تحقیقاتی اور ترقیاتی لیبارٹریوں کے سابق سربراہ میجر جنرل جیری ہیری سن کے بیان کے مطابق خلیج کی جنگ میں اتحادیوں کے نقصانات برائے نام ہونے کی وجہ سے جنگ کا ایک ایسا نیا معیار قائم ہوگیا ہے جس نے بہت سے لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔ یہی حقیقت مستقبل میں روبوٹ فوجوں کے قیام اور تیاری کا ذریعہ بنے گی۔

جنگل میں سب سے مشکل ڈیوٹی ہیلی کاپٹروں کے ان فرائض پر مشتمل ہوتی ہے جن میں وہ فوج کے لئے جاسوسی کا فریضہ انجام دیتے ہیں یا سکاؤٹ مشن کے طور پر معلومات کی فراہمی کے لئے پروازیں کرتے ہیں۔ اس عمل میں مثال کے طور پر پائلٹوں کا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جانی نقصان کم کرنے کے لئے کم بلندی پر پرواز کرنے والے روبوٹ جو اپنے حجم اور شکل سے طیارے نظر آ رہے ہوں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مختلف آلات سے لیس ہوگا جو مختلف قسم کے مواد کو پراسیس کر کے فیلڈ کمانڈر تک پہنچانے کے لئے کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ یہ دستوں کی شکل میں بھی پرواز کر سکتے ہیں۔ خلیج کی جنگ کے بعد امریکی فوج نے ''اکیسویں صدی کی فوج کے لئے سٹریٹیجک ٹیکنالوجی'' کے نام سے جو رپورٹ تیار کرائی، اس کے مطابق ''اس صورت میں ایک ایسا کم غیر محفوظ کم خرچ متبادل میسر آ سکتا ہے جس میں عملے کے ارکان کی زندگیوں کو کسی قسم کا خطرہ درپیش نہیں ہوگا۔''

ہنری سی یوئین کی اپنی سوچ ہے (ہنری یوئین وی سی آر کے موجد کے طور پر جانا جاتا ہے)۔ اس نے وی سی آر پلس کے ساتھ ایسا دوسرا ساز وسامان بھی ایجاد کیا کہ آپ الیکٹرانک کی ڈگری لئے بغیر اس کی پروگرامنگ کر سکتے ہیں۔ یہ کارنامہ اس سے اتفاقی طور پر سرزد ہوگیا ہے کیونکہ اصل میں وہ سب میرین کشتیوں کا ماہر ہے اور ٹی آر ڈبلیو میں خدمات انجام دیتا رہا ہے۔ خلیج کی جنگ کے خاتمے کے تھوڑے ہی عرصے بعد اس نے داخلی مطالعے کے لئے ایک مقالہ تیار کیا تھا جس میں اس نے دعویٰ کیا کہ ''نئے ہتھیاروں کی تیاری اور ان کو بہتر بنانے کا اولین مقصد انسانی زندگی کے اتلاف کے خطرات کو کم کرنا یا ان سے مکمل طور پر نجات حاصل کرنا ہونا چاہیے۔'' سادہ لفظوں میں یہ بات یوں کہی جا سکتی ہے کہ نقصان پہنچانے والے ہتھیار یا ساز وسامان کو غیر انسانوں یعنی روبوٹوں تک محدود رکھنے کی ضرورت ہے۔ یوئین نے بغیر ڈرائیوروں کے چلنے والے ٹینکوں کے خاکے بھی پیش کئے جن کی نقل و حرکت بٹالین سٹیشن پر رکھے ہوئے ریموٹوں کے ذریعے کنٹرول کی جا رہی ہوگی۔

اے ٹیم کا تحفظ

جنرل ہیریسن بھی ایسے ہی خیالات کی ترغیب دیتا ہے۔ آپ اپنی اے ٹیم کا تحفظ کریں، اپنے دستوں کو بچائیں۔ اپنے سپاہیوں اور پائلٹوں کو اس وقت تک سنبھالے رکھیں جب تک انہیں جنگ میں جھونکنے کی مجبوری پیش نہ آئے اور یہ مقصد روبوٹوں کو استعمال میں لا کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میں اگر مرکزی کمان کے تحت حرکت کرنے والے ٹینک سے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جس کے پیچھے ایسے چھ مزید ٹینک آ رہے ہوں جن میں کوئی انسان سوار نہ ہو، کام لے سکوں تو اس سے بہتر صورت کیا ہوسکتی ہے۔ جب کہ ایک شخص ریموٹ کے ذریعے ان چھ ٹینکوں کو کنٹرول کر رہا ہو۔

فرینکلن، یوئین اور ہیری سن کی آوازیں ان بہت سی آوازوں میں سے صرف چند ایک ہیں جو ان دنوں تیزی کے ساتھ روبوٹائزیشن کے حق میں بلند ہو رہی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ روبوٹ، فوجی جاسوسی کرنے والے ہیلی کاپٹروں کے پائلٹوں کی یا ٹینک ڈرائیوروں کی جگہ لینے کے علاوہ بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں، وہ خفیہ معلومات جمع کر سکتے ہیں۔ اہداف کی نشان دہی کرنے میں مدد دے سکتے ہیں، وہ دشمن کے ریڈار کو دھوکہ دینے یا اسے مکمل طور پر تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مخالفوں کے نقصان کی تفصیل جمع کر سکتے ہیں، نقصان شدہ ساز وسامان کی مرمت اور ایک خاص دائرے میں پیمائش کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کے استعمال کے لئے کاموں کی ایک لمبی فہرست موجود ہے۔ وہ کسی علاقے کو گھیرے میں لے کر ہتھیاروں کا پتہ لگانے اور ان کی ہلاکت خیزی کو کم کرنے کی ذمہ داری نبھا سکتے ہیں جس سے نقل وحرکت میں آسانی کی صورت پیدا کی جا سکتی ہے۔ ان کی مدد سے فضا کے زہریلے اثرات کم کئے جا سکتے ہیں جس سے نقل وحرکت میں آسانی کی صورت پیدا کی جا سکتی ہے۔ وہ سطح زمین سے نیچے یا سمندر کی تہہ میں آلات نصب کرنے میں کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ بارودی سرنگوں کی صفائی کر سکتے ہیں، بمباری سے تباہ ہونے والے رن وے کو واپس درست حالت میں لا سکتے ہیں اور اس نوع کی لاتعداد خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ پیٹرس برگ کی پی ایچ ڈی ٹیکنالوجی کے ہاروے میران نے اپنے مقالے میں جو اس نے حال ہی میں انسانوں کے بغیر چلنے والے مشینی سسٹم ایسوسی ایشن کے ڈھائی ہزار ممبران کے سامنے پیش کیا تھا، جنگی تصادمات کی کم از کم 57 ایسی صورتیں پیش کیں جن میں روبوٹ حصہ لے سکتے ہیں۔

فوجی روبوٹ تیار کرنے والے اپنے کام کے سلسلے میں ملنے والی حالیہ عزت افزائی سے یقیناً بہت خوش ہیں۔ وہ بعض ایسی حالیہ پیش رفتوں کی وجہ سے بھی خاصے پر جوش ہیں جن میں مصنوعی جاسوسی، اصل حقائق، کمپیوٹر کی طاقت، نمائش کا نظام اور متعلقہ ٹیکنالوجی وغیرہ کا عمل دخل ہے۔ یہ بحث البتہ انہیں پریشان کئے ہوئے ہے کہ موجودہ صورت حال

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے آگے کیا ہے؟ جو سوال انہیں بہت زیادہ پریشان کر رہا ہے وہ یہ نہیں کہ روبوٹی ہتھیاروں کو چالاک یا سمجھ دار کیسے بنایا جائے بلکہ یہ ہے کہ انہیں کس حد تک سمجھ دار اور چالاک بننے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

ان انجینئروں کے درمیان ایک خاموش بحث جاری ہے۔ یہ بحث انسانی نسل کو درپیش اہم ترین مسائل سے چند ایک کے متعلق ہے۔ ان کے سامنے مسئلہ جنگ یا امن کا نہیں ہے بلکہ وہ نسل انسانی کے انتہائی ذہین اور روز بروز خود فہمی سے زیادہ آشنا ہونے والے مہلک روبوٹوں کی غلامی میں جانے کے امکان سے گھبرائے ہوئے ہیں۔

صحرا میں روبوٹ

سائنس فکشن سے متعلق رسائل اور ''دی فورمین پروجیکٹ'' جیسی فلموں کے علاوہ جن میں روبوٹوں کو اپنے بارے میں سوچتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اب پہلی بار یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے خواتین و حضرات جو مستقبل قریب کی جنگوں کی منصوبہ بندی کرنے میں مصروف ہیں۔ اس مسئلے پر پوری سنجیدگی سے غور وفکر کر رہے ہیں۔ مشینی انسان یعنی روبوٹ کو میدان میں لانے کے حامیوں اور ایسے خودمختار ہتھیار تیار کرنیکے جو خودعمل کرنے کی صلاحیت کے مالک ہوں، داعیوں میں ان دنوں یہ نظریاتی بحث بڑے زور وشور سے جاری ہے۔

خلیج کی جنگ میں روبوٹک ہتھیاروں سے بہت کم کام لیا گیا تھا۔ اس میں بھی سب سے نمایاں جو کام تھا، وہ انسانی کنٹرول میں تھا۔ کویت اور عراق کے آسمان پر پائیز آر پی ویز......چھوٹے، غیر مسلح، پائلٹ کے بغیر اڑنے والے طیارے بڑی تعداد میں محو پرواز تھے لیکن انہیں ٹیلی آپریٹرز جو میلوں دور کمپیوٹر سکرین کے سامنے بیٹھے تھے، کنٹرول کر رہے تھے۔ روبوٹ نے اپنے ذمے مقررہ کام ضرور کیا، مگر فیصلے زندہ انسانوں ہی نے کئے۔

اسرائیل کے تیارکردہ ڈیزائن پر امریکہ کی ایک فرم کا تیارکردہ پائیز ''ڈرونز'' نامی طیارہ خلیج کی جنگ میں عراق تو ایک طرف رہا، میڈیا کی نظروں سے بھی اوجھل رہا۔ ان طیاروں نے بہت کام کیا، ان میں سے کچھ بحری جہاز وس کرنسن کے عرشے سے اڑائے گئے، دوسرے امریکی فوج اور بحریہ کے زمینی اڈوں سے بحریہ کے ڈپٹی منیجر پروگرام،

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ریڈورڈای ڈیو کے بیان کے مطابق بغیر انسانوں کے اڑنے والے ان پائینر طیاروں نے 330 پروازوں میں حصہ لیا اور ڈیزم سٹارم کی جنگ شروع ہونے کے بعد ان طیاروں نے تقریباً ایک ہزار گھنٹے فضا میں گزارے، اس پوری جنگ کے دوران کم از کم ایک طیارہ فضا میں ضرور موجود ہوتا۔

آر پی ویز نے فوجی جاسوسی مشن پورے کئے، بمباری سے ہونے والے نقصانات کا جائزہ لیا۔ خلیج میں بارودی سرنگوں کا پتہ لگایا۔ عراقی گشتی کشتیوں کی نگرانی کرنے کے علاوہ اور بھی بہت سی خدمات انجام دیں۔ ایسے تین طیاروں پر چھوٹے ہتھیاروں سے حملہ کیا گیا اور ایک کو مار گرایا گیا تھا۔

فضا میں محو پرواز پائینر طیاروں نے میزائل پھینکنے والے متحرک لانچروں کو اس وقت ڈھونڈ نکالا جب وہ اپنے اڈے پر واپس پہنچے۔ سلک و ورم، میزائل اڈوں کی نشان دہی کی اور یہ چھان بین بھی کی کہ یہ اڈے بےعمل ہیں یا باعمل۔ انہوں نے ان پیدل عراقی فوجوں کی نقل وحرکت نوٹ کی جو سعودی عرب میں واقع الکسنجی کے مقام پر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھ رہی تھیں۔ کیمروں یا خفیہ آلات سے حاصل ہونے والی یہ ساری معلومات جو بغیر پائلٹوں سے اڑنے والے طیاروں کے ذریعے حاصل کی گئیں، زمینی اڈوں تک پہنچائی جاتی رہیں اور پھر وہاں سے عراقی فوج کی صفوں پر حملے کے لئے روانہ ہونے والے کوبراز اور اے وی 8 بی ایس طیاروں کو فراہم کی گئیں۔ دوسرے مقامات پر پائینر طیاروں نے راستوں کا از سرنو تعین کرنے اور پروازوں کی منصوبہ بندی کرنے میں اسی طرح مدد بہم پہنچائی کہ فوج کے اپاچی ہیلی کوپٹروں کے لئے کاروائی کرنے میں آسانی پیدا ہوگئی۔

مشینی انسان یعنی روبوٹ استعمال کرنے والے صرف پائینرز ہی نہیں تھے، امریکہ کی 87 ویں فضائی کمپنی نے بھی ان سے ایک تجرباتی عمل کے سلسلے میں کام لیا اور دو بوری سامان ان کے ذریعے مطلوبہ مقام پر پہنچا کر اور پھر وہاں 5 منٹ میں اسے اسمبل کرنے کا کارنامہ کردکھایا۔ پھر انہیں مختلف علاقوں کی گشت کے لئے کام میں لایا گیا۔ دوسرے ایسے فضائی طیاروں میں جو انسانوں کے بغیر اڑائے جاتے ہیں، کینیڈا کا سی ایل 89 اور فرانس کا مارٹ نامی جہاز شامل ہے۔ ان کو اہداف کی شناخت، دشمن کو فریب دینے یا دیگر ایسے ہی مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، پھر یہ بھی ہے کہ روبوٹ محض فضائی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کارروائیوں ہی کے لئے استعمال نہیں کئے گئے، جرمنوں نے ''ٹرائیکانہ'' نامی جن گشتی کشتیوں کو بارودی سرنگیں صاف کرنے کے لئے استعمال کیا وہ بھی بغیر انسانوں کے یہ کاروائیاں مکمل کر رہی تھیں۔

ان تجربوں کی کامیابی کی وجہ سے زیادہ اہم اور بڑے منصوبوں پر کام کرنے کی تحریک ہوئی۔ مثلاً امریکی بحریہ ان دنوں ''ای ٹریکٹ میپل'' نام کے ایک ایسے منصوبے پر نصف ارب ڈالر خرچ کر رہی ہے جس کی کامیابی کی صورت میں جہاز نمبر ایک کا کمانڈر، جہاز نمبر 2 سے ریڈار اور دوسرے فوری ذرائع سے حاصل ہونے والا مواد وصول کر سکے گا اور اس کے ساتھ ہی جہاز نمبر 3، 4 یا مثال کے طور پر دس اور بیس سے خودکار میزائل داغنے کا عمل شروع ہو سکے گا۔ پوری ٹریکٹ میپل دشمن کو دھوکہ دینے یا دشمن کی طرف سے اپنی طرف آتے ہوئے میزائلوں کے رہنما نظام کو جام کرنے کا فریضہ بھی انجام دے سکیں گے۔ اس کے ذریعہ ٹاسک فورس کمانڈر کو ریموٹ کے ذریعے بحری جہازوں کے جن میں گشتی جنگی جہاز اور تباہ کن جہاز بھی شامل ہوں پورے بیڑے کا کنٹرول دیا جا سکتا ہے۔

یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس انتظام میں توسیع کر کے زیادہ پیچیدہ قسم کا اڈہ بھی قائم کیا جا سکتا ہے، جہاں ہیلی کاپٹروں کے بیڑے، بحری جہاز، ٹینک اور زمین پر مددگار طیارے وغیرہ سبھی کچھ ایک واحد روبوٹک انتظام کی شکل میں موجود ہو اور جسے ٹیلی آپریٹر کنٹرول کر رہے ہوں۔ یوں تصور کی آنکھ سے ایک ایسے میدان جنگ کا نقشہ سامنے لایا جا سکتا ہے جس میں روبوٹ ہی روبوٹ نظر آئیں۔

آج اٹلی سے لے کر اسرائیل، جنوبی افریقہ، روسی فیڈریشن، جرمن اور جاپان تک عملاً سینکڑوں مختلف روبوٹک آر اینڈ ڈی منصوبے زیرعمل ہیں۔ شہری مقاصد کے لئے بھی ایسے ہی منصوبے جلد سامنے آ سکتے ہیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے جوہری ٹیکنالوجی تخلیق کی جا سکتی ہے۔ جاپان ایوی ایشن الیکٹرانک انڈسٹری لمیٹڈ نامی کمپنی نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے پرواز کرنے والا ایک ایسا ہیلی کوپٹر ایجاد کیا ہے جس کو جائیز ٹو شیبویشا کے الفاظ میں شدید درجہ حرارت، ٹینکوں کی آتش زنی، آتش فشاں مادوں کی شعلہ افشانی کی تصویریں لینے یا مواد جمع کرنے کیلئے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ یاماہا نے جو پیانو اور موٹر سائیکلوں کی تیاری کے لئے مشہور ہے، فصلوں کی صفائی کے لئے آلہ 50 کے نام سے ایک

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیلی کاپٹر تیار کیا ہے جو ریموٹ کنٹرول کے ذریعے پرواز کرے گا۔ کیوٹو یونیورسٹی اور دو سرکاری ایجنسیاں ایک چھوٹا روبوٹک جہاز تیار کررہی ہیں جو موسمی اور مخالف ماحول میں نیز ریڈیائی لہروں کو کام میں لانے کے امکانات سے پر ہوگا۔ یہ جہاز فضا میں غیر معینہ عرصہ تک معلق کھڑا رہ سکے گا اور اس کے لئے مائیکرو ویو کے ذریعے نیچے زمین سے توانائی مہیا ہوتی رہے گی۔ اس دوران کو فاسٹو لمیٹڈ نے زیر آب تعمیراتی کام کے لئے کئی ٹانگوں والا ایک روبوٹ بھی تیار کرلیا ہے۔

جاپان کا آئین اسلحے کی برآمد پر پابندی عائد کرتا ہے، لیکن یہ بات سوچنے کی ہے کہ زیر آب کام کرنے والے اس روبوٹ کو ان ان مقامات پر بارودی سرنگیں بچھانے یا خفیہ آلات نصب کرنے سے جہاں تک عام انسان کی رسائی معمول کے حالات میں ناممکن ہے کون روک سکے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ ان روبوٹوں کو...... بالکل اسی طرح جس طرح ٹرکوں اور جیپوں کو استعمال کیا جاتا ہے، فوجی اور شہری مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

بہت سے روبوٹ فیکٹریوں کے تحفظ کے مقاصد کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔ میزائلوں اور ایٹمی ہتھیاروں کے اڈوں کا ذکر تو فی الحال جانے دیجئے البتہ دہشت پسندوں سے حفاظت کے لئے بھی روبوٹ تیار کئے جا سکتے ہیں۔ فوجی روبوٹروں کا جائزہ لینے کے لئے ایک چھوٹی سی کتاب ''آدمی کے بغیر جنگ'' شاید اس موضوع کے سلسلے میں بہت مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ یہ سٹیون ایم شیکر اور ایلن آر دائز دو محققوں کی مشترکہ تصنیف ہے۔ ہم نے بھی بہت سے حوالے اسی کتاب سے لئے ہیں...... ان کے بیان کے مطابق کولوریڈو کی روبوٹ ڈیفنس نامی ایک کمپنی نے دوٹن کی ایک سواری، سنتری کے فرائض انجام دینے کے لئے تیار کی ہے جسے پراڈلر (شکاری) کا نام دیا گیا ہے۔

شکاری

پراڈلر کو 19 میل کے فاصلے سے کنٹرول کے ذریعے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ اس کے اندر کمپیوٹر اور گھومتے ہوئے ویڈیو کیمرے نصب ہیں۔ یہ کسی بھی نصب شدہ عمارت یا مشین کے گرد گھومنے اور اس میں داخلے کے مقام کی نگرانی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اپنی پوزیشن برقرار رکھنے کے لئے یہ لیزر رینج فائنڈر اورایسے ہی دوسرے آلات سے کام لیتا ہے۔ ان میں ایسے آلات بھی ہیں جو کسی علاقے میں تبدیلیوں کی نشان دہی کر کے انہیں درست حالت میں واپس لانے کی استعداد رکھتے ہیں۔ فاصلے پر بیٹھا ہوا آپریٹر وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے جس کی کیمرے جانچ کر رہے ہیں۔

اس گاڑی میں رات کو دکھائی دینے کے قابل بنانے والے آلات نصب کئے جا سکتے ہیں۔ ان میں جانچ پڑتال کرنے والے آلات، ریڈار اورایسے برقی آلات بھی شامل ہیں جو زلزلے کی پیش گوئی کر سکیں۔ اسے متنوع قسم کے ہتھیاروں سے لیس کرنا بھی ممکن ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ بیکٹل نیشنل نامی فرم نے اس گاڑی کو مشرق وسطیٰ کے ایک ملک میں تنصیبات کے تحفظ کے لئے کام میں لانے کی تجویز پیش کی ہے۔

اس عرصے میں اسرائیل جو دشمن ہمسایوں میں گھرا ہوا ہے اور جس کی فوج ان کے مقابلے میں بہت کم ہے، امن اور جنگ دونوں حالتوں کے لئے روبوٹ ٹیکنالوجی ڈیزائن کرنے اور اس سے کام لینے والوں میں دنیا بھر کے لیڈر کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ بحیرہ گلیلی کے نزدیک اسرائیل کے ''اسکر'' نامی کارخانے میں برآمد کیلئے برابر اوزار تیار کئے جا رہے ہیں۔ یہ کارخانہ سٹیف وویمر نامی ایک باریک بین ماہر اور اس کے بیٹے ایٹن کی کوششوں سے قائم ہوا ہے اور اسے فیکٹری روبوٹائزیشن میں دنیا بھر میں مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ روبوٹوں کا جنگی استعمال بھی اسرائیل میں خاصی ترقی کر چکا ہے اور اس نے 1982ء کی جنگ میں شام اور لبنان کے خلاف آر پی ویز کو نہایت شاندار کامیابی سے استعمال کیا اور اس کے بعد دہشت گردی کی وارداتوں کے خلاف بھی برابر استعمال کر رہا ہے۔ ایک واقعہ کے مطابق اس قسم کے ایک جہاز نے بھاگتے ہوئے دہشت پسندوں کا ان کے اڈے پر پہنچنے تک پیچھا کیا تاکہ بعد میں فضائی حملے کے ذریعے اس اڈے کو تباہ کیا جا سکے۔

روبوٹ کی دہشت

بہرحال جیسا کہ شیکر اور وائز نے توجہ دلائی ہے، ''روبوٹک ٹیکنالوجی کو غیر موثر بنانے میں دہشت گرد اب زیادہ چالاکی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔'' اس سلسلے میں ان دونوں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے ایک واقعہ کا ذکر بھی کیا ہے جس میں ایک روبوٹ، ریموٹ کنٹرول آپریٹر کی ہدایات کے مطابق ایک بم کو غیر موثر بنانے کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ بم رکھنے والے انقلابی کسی نہ کسی طرح آپریٹر کے ویڈیو کنٹرول پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئے اور اس کی مدد سے روبوٹ کو اس پر حملہ کرنے کے لئے اس کا رخ بدلوانے کی کوشش میں لگ گئے۔ آپریٹر اپنے ہی روبوٹ کے ذریعے تباہ ہونے سے بال بال بچا۔

وہ کہتے ہیں: ''روبوٹ گاڑیاں جو اخلاق اور ضمیر کے دباؤ سے آزاد ہیں اور جنہیں خودکشی کے کسی مشن کا سامنا ہونے کا خطرہ بھی نہیں ہے، آنے والے کل کے زمانے میں خوفناک دہشت گرد ثابت ہوسکتی ہیں۔ مشینی قاتلوں کا استعمال، ان کے مظالم کا شکار ہونے والوں کے لئے دہشت اور پریشانی کا باعث ہوسکتا ہے اور اس سے دہشت گردوں کو زبردست پبلسٹی بھی مل سکتی ہے۔''

ابھی تک ہم مشینی آدمیوں کی بات کرتے آ رہے ہیں، مگر یہ آگے اور زیادہ ترقی یافتہ میدان تک پہنچنے کے لئے پہلا بلکہ آدھا قدم ہے۔ یہ میدان پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ متنازعہ ہے جسے خودمختار روبوٹ کا نام دیا جا تا ہے۔ ان خودمختار روبوٹوں کا مقابلہ ریموٹ کنٹرول یا ٹیلی آپریٹروں کے ذریعے کنٹرول کئے جانیوالے روبوٹوں سے کیا جائے یہ موخر الذکر نہات معمولی قسم کی چیز نظر آئیں گے۔ ان سے زیادہ سمارٹ جیسے ٹو ماہاک کروز میزائل وغیرہ کی ایجادیں اب سامنے آ گئی ہیں۔ انہیں ایک دفعہ داغ دیا جائے تو پھر وہ کوئی ہدایات وصول نہیں کرتے۔ وہ اپنی خودمختارانہ حیثیت میں عمل کرنے کے لئے پہلے سے تیارشدہ پروگرام کے پابند ہوتے ہیں۔

اس سلسلے کا فائنل مرحلہ ایسے ہتھیاروں کی تیاری کا کام جو وجود یا حرکت میں آنے کے بعد' اپنے بارے میں زیادہ سے زیادہ فیصلے خود کرتے ہیں۔ یہ نام نہاد خودمختار ہتھیار ہیں اور ٹی آر ڈبلیوز کے الیکٹرانکس اور ٹیکنالوجی ڈویژن کے جنرل منیجر مرون ایلس سٹون کے بیان کے مطابق ''آخرکار ایسے تمام ہتھیاروں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دینا ہوگی۔''

ریموٹ کنٹرول کے زور پر روبوٹوں کے ذریعے استعمال کئے جانے والے ہتھیاروں کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کا زیادہ انحصار ایسے غیر محفوظ مواصلات پر ہوتا ہے جو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانوں کا رابطہ کمتر مگر اچھے طریقے سے بات سمجھنے والی مشینی مخلوق سے کراتے ہیں۔ اگر مواصلات کا یہ سلسلہ منقطع ہو جائے، الٹ پلٹ ہو جائے یا بیرونی مداخلت کا شکار ہو جائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دشمن اس کے استعمال کے طریقے تک رسائی حاصل کر لے تو روبوٹ بیکار ہو جاتا ہے یا پھر اپنی تباہی کا سامان خود پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے لیکن اگر مواد جمع کرنے، تجزیہ کرنے اور خود فیصلہ کرنے کی اہلیت خود اسی ہتھیار میں سمو دی جائے تو پھر مواصلاتی رابطے داخلی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور زیادہ محفوظ بھی ہو جاتے ہیں۔

خود مختار روبوٹ کی دوسری خصوصیت رفتار ہے۔ انسانی ذہن کے مقابلے میں وہ کہیں زیادہ تیز رفتاری سے فیصلے کر سکتے ہیں۔ جنگ میں تیزی آنے کی صورت میں یہ خصوصیت یقیناً کلیدی اہمیت رکھتی ہے۔ شیکر اور وائز کا کہنا ہے کہ ''میزائل کے دفاعی نظام کے مختلف اجزاء کو کسی بھی حملے کے توڑ کے لئے اپنے پاس موجود مواد کا اتنی تیز رفتاری سے تبادلہ کرنے کے قابل ہونا چاہیے کہ فیصلے تک پہنچنے کے لئے انسان موقعہ پر موجود ہونے کے باوجود اس میں حصہ لینے کے قابل نہ ہو سکیں۔''

ایسے فیصلے آزادانہ اور خود مختارانہ طور پر لینے کے سلسلے میں اگر روبوٹس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے تو پھر انہیں سپر سمارٹ قرار دینا بھی درست ہوگا۔ اسی لئے اب ایسے روبوٹوں کی تلاش ضروری ہوگئی ہے جو اپنے تجربوں سے خود کچھ سیکھ سکیں۔ امریکی بحریہ کی لیبارٹری نے ایک ایسا کمپیوٹر پروگرام تیار کیا ہے جو ''ڈیفنس نیوز'' کے مطابق روبوٹ گاڑیوں کو بنیادی فیصلے لینے اور غیر متوقع حالات پیش آنے پر ان سے نبرد آزما ہونے کے قابل بنانے میں مدد دیتا ہے۔''

ایک بناوٹی پرواز کے دوران ٹیسٹ میں اس پروگرام کی مدد سے ایک ایف/اے 18 کو، طیارہ بردار جہاز کے عرشے پر وقت کی سو فیصدی پابندی کے ساتھ اتار لیا گیا۔ اس پروگرام کی مدد سے انٹی ایئر کرافٹ میزائل کی زد سے طیارے کو بچانے کی استعداد 40 فی صدی سے 90 فی صدی تک بڑھانے میں کامیابی حاصل کر لی گئی۔

خود مختار ہتھیاروں کی وکالت کرنے والوں کا دعویٰ ہے کہ وہ ان میں بہتر تحفظ، رفتار اور بعض صورتوں میں اپنے ہی تجربات سے سیکھنے کی صلاحیت فراہم کرنے کا اہتمام کر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے روبوٹوں کو ٹیلی آپریٹروں کے ذریعے کام میں لائے جانے والے روبوٹوں کے ساتھ ایک بڑا اسسٹم تشکیل دینے کے لئے مربوط نہیں کیا جا سکتا۔

جیسا کہ ابتدا میں سوچا گیا تھا، فوجی مصلحت کے نقطہ نظر سے کسی ایسے دفاعی منصوبے کے قیام کے لئے جس سے عالمی سطح پر مصنوعی سیاروں کے نیٹ ورکس، خفیہ آلات اور زمینی اڈوں کا رابطہ ہو، واحد خود مختار میگا روبوٹ ہی کو ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے جس کے کم از کم کچھ اجزاء یقینی طور پر خود مختاری سے کام لینے کے قابل ہوں۔ بہرحال یہ تمام منصوبے حقیقت سے ابھی تک بہت دور ہیں۔

امریکی فوجی ہیڈکوارٹر پینٹا گون کی دفاعی تحقیقی ایجنسی نے ایس ڈی آئی، ڈی اے، آر پی اے وغیرہ کی آراء سے قطع نظر کوئی ایک عشرہ قبل خود فیصلہ کرنے کے قابل گاڑیوں کی تیاری کے بارے میں تحقیقات جاری رکھنے کی تجویز کی حمایت کی تھی۔ اس کا شارک پروگرام ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے اسے باہمی ابلاغ کرنے والے کمپیوٹروں کے ایک گروپ نے ترتیب دیا ہو۔ اس سے ان میں ایک قسم کے اجتماعی ''شعور'' یا بظاہر ٹیلی پیتھی کے رابطے وجود میں آنے کا گمان بھی ہوتا تھا۔

روبوٹوں کے حامیوں کو جس مدافعت کا سامنا ہے اس کی کچھ وضاحت کے لئے شاید موجودہ صورت حال سے مدد مل سکے۔ یہاں بھی شہری اقتصادیات کے متوازی حالات موجود ہیں۔ فوجی روبوٹائزیشن میں بھی بالکل اسی طرح جس طرح کہ تجارت کی دنیا میں ہے، اس عمل کے خلاف مفادات کی جنگ جاری ہے۔ ایک دفعہ پھر شیکر اور ائز کی بات پر توجہ دیجئے۔ ''خود کار مشینوں کے استعمال سے فیکٹری کے مزدور کی ملازمت پر زد پڑتی ہے۔ فوج میں اکثر اوقات اعلیٰ سطح کی انتظامیہ ہتھیاروں کے نظام پر مسلط ہوتی ہے۔ روبوٹک سسٹم کے متعارف ہونے سے ان کے بہت سے مفادات خطرے میں پڑ جائیں گے، فیکٹریوں میں ہونے والی مدافعت کے مقابلے میں ان کی مدافعت کہیں زیادہ شدید ہوگی......''

ان کا کہنا ہے کہ امریکہ میں ''فضائیہ کا علم پائلٹوں نے اٹھا رکھا ہے۔ بحریہ میں جہازراں اور جہازی کمانڈر اسے کنٹرول کر رہے ہیں۔ فوج کی کمان عملاً ان کے ہاتھ میں ہے جن کا لڑنے والے سپاہیوں سے تعلق ہے۔ دوسری قوموں کی فوجی انتظامیہ میں بھی یہی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صورت حال ہے ۔ منصوبہ بندی کرنے والے خفیہ اطلاعات کی فراہمی میں مصروف' مواصلاتی حکام' دیگر اشیا کی سپلائی میں مصروف لوگ اورلڑائی میں حصہ نہ لینے والے شعبوں سے متعلق دیگر افراد کی طاقت کے مراکز تک رسائی کم ہی ہوتی ہے۔'' تیسری لہر کی جنگ کے طور طریقے اختیار کرنے بالخصوص فوج کو روبوٹائز کرنے کی صورت میں یہ سب کچھ بدل سکتا ہے اور جو حکام اس وقت انسانوں پر مشتمل فوج کا انتظام سنبھالے ہوئے ہیں، اس صورت میں ان کے اختیارات پر یقیناً زد پڑے گی۔

اس کے باوجود روبوٹوں کو اختیارات تفویض کرنے، خاص طور سے انہیں خودمختار بنانے کا مسئلہ یوں آسانی کے ساتھ ختم نہیں کیا جا سکتا۔ مخالفین کا کہنا ہے کہ روبوٹی ہتھیار میدان جنگ میں اچانک رونما ہونیوالی متعدد تبدیلیوں کے مطابق اپنے آپ کو نہیں ڈھال سکیں گے۔ کیا انسانی نگرانی کے قدم قدم پر انتظام کی ضرورت پیش نہیں آئے گی؟ روبوٹ کو ہلاک کرنے والے کے پاس اس کا اخلاقی جواز کیا ہوگا اور یہ امتیاز کیسے کیا جائے گا کہ کون سا روبوٹ دشمن ہے اور یوں خطرے کا باعث ہے اور کون سا ہتھیار ڈالنے کی سعی کر رہا ہے؟ کیا کوئی ناقص روبوٹ، نظم ونسق کی بلندی سے بالاتر ہوکر لبلبی دبا کر وسیع پیمانے پر لامتناہی تباہی پھیلانے کا ذریعہ نہیں بن سکتا؟ کیا پروگرام ترتیب دینے والے خاکی انسان اتنے سمجھ دار ہیں کہ وہ میدان جنگ کے حالات میں رونما ہونے والی امکانی تبدیلیوں کا پہلے سے اندازہ کر سکیں؟

یوں یہ وہ مقام ہے جہاں سے ڈاکٹر سٹرینج لو کا منظرنامہ شروع ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے مشین سے ایک نیا انسان برآمد کرکے کیا ہم جنگ سے بھاگ سکتے ہیں؟ روبوٹوں کے حامی کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ عام لوگ اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں۔ ہمارے مہلک ترین ایٹمی ہتھیاروں میں سے کچھ ایسے ہیں اور وہ بڑی مدت سے اس شکل وصورت میں موجود ہیں جو جزوی طور سے اپنے خودمختار اجزاء پر ہی تکیہ کرتے ہیں۔ سوویت ایٹمی حملے کے خطرے کے ساتھ رفتار اور خطرے کا تعلق اتنا زیادہ تھا کہ ہتھیاروں کی خودمختاری پر صرف ایک حد تک بھروسہ کرنے ہی سے اس کے خلاف کوئی رکاوٹ کھڑی کرنے کا یقین ہوسکتا تھا۔ اس حقیقت کے باوجود ایٹمی ہتھیاروں کا سورج طلوع ہونے کے بعد آدھی صدی گزرنے پر بھی کسی حادثے یا غلطی سے ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کی نوبت نہیں آئی۔ یہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ فیصلہ کرنے کے مجاز انسان بھی نظم ونسق سے عاری ہو سکتے ہیں۔

بہرحال یہ یقین دہانی ہر ایک کے لئے نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے اس میں فرق یہ ہے کہ اگر انسان نظم ونسق کی پابندیاں توڑنے کی کوشش کرتے نظر آئیں تو اتنا وقت مل سکتا ہے کہ ان کو روکا جا سکے یا ان کے اس فیصلے سے رونما ہونے والے اثرات کی شدت کو کم کیا جا سکے لیکن روبوٹ ہتھیاروں کے سسٹم کے معاملے میں ایسی صورت سامنے نہیں آ سکتی۔ بالخصوص جب ان میں انسانی ذہن سے بھی ارفع اور اعلیٰ قسم کی سمجھ داری سمو دی گئی ہو جس کی بنیاد پر وہ فوری فیصلے کرنے، ازخود سیکھنے اور ایک دوسرے سے ابلاغ کرنے کی صلاحیت حاصل کر چکے ہوں۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بہترین روبوٹک ڈیزائنز بھی غلطی کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ کمپیوٹر پروگرام تیار کرنے والی بہترین ٹیم بھی ہر شئے کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ خطرہ ناکام ہونے کا ہو، غلطی کرنے کا ہو یا حیرت زدہ ہونے اور موقعہ سے فائدہ اٹھانے میں ناکامی کا، یہ وہ صورت حال ہے جسے کلازوٹ ''جنگ کی دھند'' کا نام دیتا ہے۔

انہی مہیب اور خوفناک امکانات کی وجہ ہی سے ممتاز سائنس دان فوجی روبوٹائزیشن کے یکسر مخالف ہوگئے ہیں لیکن حقیقت اب بھی پوری طرح واضح نہیں ہے۔ امکانی اختلاط کی لامحدود صورتیں سامنے ہیں جن سے نئے نظام وجود میں لائے جا سکتے ہیں جو ٹیلی آپریشنوں کو خودمختاری کی لاتعداد اقسام سے مربوط کر سکیں اور یہی وہ صورتیں ہیں جن کے پھلنے پھولنے کے وسیع امکانات اکیسویں صدی کے اوائل میں صاف نظر آ رہے ہیں۔ مصنوعی سیاروں، میزائلوں اور اعلیٰ ٹیکنالوجی کے زور پر لڑی جانے والی محدود جنگوں کی طرح روبوٹ بھی خواہ ہم اسے پسند کریں یا ناپسند، تیسری لہر کی تہذیب میں ابھرتی ہوئی جنگوں کی اقسام میں اپنی جگہ ضرور بنائیں گے۔

خودمختار ہتھیاروں کی بحث کو انجام تک پہنچانے کی کوشش ہمیں آگے ہی آگے لئے جا رہی ہے۔ اگر فوجی روبوٹائزیشن پر ہونے والے کام کے سرے، کبھی کمپیوٹر بائیلوجی اور اس کے ارتقا کے سلسلے میں ہونے والی تحقیقات کی طرف راغب ہوگئے تو پھر اس صورت حال میں موجود ہر قسم کی کشمکش کا خاتمہ ہو سکے گا۔ لاس الموس نیشنل لیبارٹری کے ٹی 13 کمپلیکس سسٹم گروپ کی تحقیقات کے مطابق انسان کا بنایا ہوا کوئی بھی ایسا سسٹم جو کسی زندہ سسٹم کا مثنیٰ ہو آزادانہ رویوں کو جنم اور ترقی دیتا ہے۔ اس شعبے میں کام کرنے والے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سائنس دان اس صورت حال کے اخلاقی اور فوجی پہلوؤں کے بارے میں بہت زیادہ پریشان ہیں۔ لاس الاموس میں طبیعات کے ماہر ڈوئن فارمر نے جو اب اپنی ذاتی کمپنی تشکیل دے رہا ہے، ایک مضمون میں جو اس نے الیٹا بیلن کے ساتھ مل کر لکھا ہے یہ اندازہ قائم کیا ہے کہ ایسی جنگی مشینوں کو جو اپنے طور پر اپنے تئیں ازسرنو بنانے کی صلاحیت سے آراستہ ہوں گی، انہیں ان کے مقررہ مقام پر پہنچانے کے بعد ہم اگر اپنی سوچ تبدیل بھی کر لیں، ان کو دوبارہ توڑنا ممکن نہیں ہوگا، حقیقتاً وہ ہمارے کنٹرول سے باہر ہوں گی۔

اگلے ابواب میں ہم کچھ ''خودساختہ اور خودمختار'' مشینوں سے ملاقات کریں گے، لیکن ان کے فراہم ہونے سے بہت پہلے ضرورت ہے۔ یہ سوال کرنے کی کہ انسانی تخیل اور بصیرت کی تمام تر وسعتوں سے کام لیتے ہوئے روبوٹری کی تشکیل کے بعد' یہ صلاحیتیں کیسے اور کس حد تک جنگ کی طرح قیام امن کے لئے بھی بروئے کار لائی جا سکتی ہیں؟

کیا روبوٹک عہد تیسری لہر کی جنگ کی طرح اس عہد میں تدارک جنگ کی کوششوں کا نقیب بھی ہو سکتا ہے؟

داونچی کے خواب

لیونارڈو ڈاونچی کے اڑتی مشینوں، بارعب ٹینکوں، راکٹوں اور آتشی بگولوں کے بارے میں سوچنے سے پہلے ہی تخلیقی ذہن مستقبل کے ہتھیاروں کی تیاری کے متعلق غور کرنے میں مصروف تھے۔

سب میں تو نہیں البتہ بہت سے ملکوں میں آج بھی جب کہ فوجی اخراجات میں کمی کا غلغلہ بلند ہے۔ فوجی سوچ پوری طرح اپنے ہی خیالات میں مگن ہے۔ سوچ بچار کرنے والے فوجیوں سے اگر پوچھا جائے کہ ان کی فوجوں کی آنے والے برسوں میں ضروریات کیا ہوں گی تو وہ اپنی میز کی دراز سے اپنے خوابوں کے ہتھیاروں کی ایک چمکتی دمکتی فہرست آپ کو پیش کر دیں گے۔ ان میں سے شاید ہی کچھ ایسے ہوں جن کے وجود میں آنے کا یقین کیا جا سکتا ہو۔ تاہم کچھ ضرور ایسے ہوں گے جن کی تیاری کا خواب پورا ہوگا اور تیسری لہر زمانے کی جنگ آزمائیوں میں وہ اپنا کردار بھی انجام دیں گے۔

زیادہ قومیں اب ہلکے پھلکے اور سمارٹ ہتھیاروں کی طلب گار ہیں اور ان میں بھی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ نئے خفیہ قسم کے ہتھیاروں سے آغاز کرنے کی خواہش مند ہیں۔ امریکہ کے جنگی منصوبہ ساز آئندہ نسل کے ایسے خفیہ آلات کے حصول کے لئے مرے جا رہے ہیں جو کسی ایک جگہ منجمد یا متحرک اشیاء کے بارے میں پانچ سو سے ہزار میل تک کے فاصلے سے معلومات حاصل کر سکیں۔ ایسے آلات طیاروں اور فضائی گاڑیوں پر نصب کئے جا سکیں گے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ عدم مرکزیت کے موجودہ دور میں اس قسم کے آلات تھیٹر کمانڈروں کی تحویل میں ہوں گے جو انہیں ضرورت کے مطابق ان معلومات کی روشنی میں استعمال میں لاسکیں گے جو انہی آلات سے حاصل کی گئی ہوں گی۔ یہ سمارٹ خفیہ آلات مختلف قسم کے مواد کو بے اثر کر سکیں گے یا پھر اس کا تجزیہ کر کے مختلف قسم کے ڈیٹا مراکز میں چیک کرنے کے مراحل سے گزاریں گے۔ اس سارے عمل کا نتیجہ فوری وارننگ کا اہتمام، اہداف کو نشانہ بنانے کے کام میں بہتر صلاحیتوں کا حصول اور نقصانات کا اندازہ کرنے کی سہولتوں میں اضافے کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ ترجیحات میں خفیہ آلات سرفہرست ہیں۔

امریکی افواج اب اپنے ٹینکوں کیلئے بھی خصوصی قسم کے سمارٹ اسلحے بارود کی تلاش میں ہیں، آنے والے زمانے کی ضرورتوں کے پیش نظر خفیہ آلات کا ایک جال ٹینکوں کی بیرونی سطح پر چاروں طرف اس طرح پھیلانے کے امکانات سامنے لائے جا رہے ہیں کہ اس کے بعد ٹینک آس پاس کی ہر چیز کی شناخت اور اقسام کے بارے میں معلومات جمع کر کے ٹینک میں موجود کمپیوٹر تک پہنچا دیں اور کمپیوٹر کی توپ، ٹینک کے باہر نصب شدہ اور موثر ہتھیاروں کو داغ کر ٹینک کی طرف آنے والے گولوں کا رخ بدل سکے گا یا انہیں مکمل طور سے تباہ کر سکے گا۔ ایسے ترقی یافتہ ہتھیاروں کی موجودگی سے خوفناک قسم کی بالخصوص کیمیائی جنگوں میں از خود رکاوٹیں پیدا ہوسکتی ہیں۔

کچھ دوسرے منصوبہ ساز کلی طور پر برقی جنگی میدانوں کے تصور میں کھوئے ہوئے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ صورت حال توپ خانے کے لئے بارود کے استعمال کے خاتمے کی نوید دے گی۔ اس منظرنامے میں گولوں کو برقی قوت سے آگے کی طرف دھکیلا جا سکے گا اور الیکٹرانس کی رہنمائی میں اہداف تک پہنچایا جا سکے گا۔ تمام گاڑیاں برقی قوت سے چلیں گی، دوبارہ چارج کی جا سکیں گی اور اس مقصد کے لئے ایک جہاز ان کے اوپر مسلسل

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پرواز کر کے توانائی انہیں منتقل کرتا رہے گا۔

ہالی ووڈ سوٹ

اب ایک فوجی سپاہی کا نیا اور انفرادی تصور سامنے لایا جا رہا ہے۔ امریکی افواج کی تحقیقاتی اور ترقیاتی لیبارٹری کے سابق سربراہ میجر جنرل جیری ہیری سن کی وضاحت کے مطابق فوجی کو اب کوئی ایسی شئے نہ سمجھا جائے جس کے جسم پر رائفل لدی ہو یا جس کے بازو پر ریڈیو لٹکا ہوا ہو۔ اب اسے بھی ایک سسٹم کے طور پر دیکھنا لازم ہے۔ ایس آئی پی ای یعنی سپاہی کے تحفظ اور اجتماع کے نئے تصور کے متعلق تحقیقات کا آغاز پہلے ہی ہو چکا ہے۔ یہ سب کچھ ایک نئے ''سوٹ'' میں جمع کر دیا گیا ہے جو سپاہی کو ایٹمی، کیمیائی اور جراثیمی ہتھیاروں سے محفوظ رکھے گا اور اسے رات کو دکھائی دینے والے چشمے فراہم کرے گا۔ اس سوٹ میں نشانہ لگانے کا ایک سسٹم بھی نصب ہوگا جو آنکھ کی حرکت کے ساتھ ساتھ بندوقوں کو اس ہدف کی طرف متوجہ کرے گا جس پر سپاہی کی نظر ہوگی۔

یہ سوٹ ان صفات اور اسی نوع کی متعدد دوسری صفات سے متصف ہوگا اور ہالی ووڈ کے خصوصی تاثرات کے شعبے سے درآمد ہوگا۔ یہ ایک جامع ڈھانچے پر مشتمل ہوگا جو سپاہی کے بار بار انجام دیئے جانے والے فرائض کی روشنی میں سب کچھ اس طرح سیکھ جائے گا کہ اس میں ملبوس مرد و زن سپاہی لوگ دس میل تک چل سکیں گے۔ دوران سفر اونگھ بھی سکیں گے۔ یہ ایسا سوٹ ہوگا جس کے پہننے والے کی طاقت کئی گنا بڑھ جائے گی۔ جنرل ہیرلین اس کو اس طرح بیان کرتا ہے، ''میں اس شخص (سپاہی) کو ایک ایسے ''ایکسو سکیلیٹل'' قسم کے سوٹ میں بند کرنا چاہتا ہوں جو اسے اچھال کر ایک ہی چھلانگ میں اونچی عمارت کے اوپر پہنچا دے۔'' یہ کل کے سپاہی کے سپرمین ہونے کی طرف واضح اشارہ ہے۔

اس سمارٹ سوٹ کے اندر بند سپاہی بہرحال فولادی بازوؤں والا کوئی بے مغز کارٹونی کیریکٹر نہیں ہوگا بلکہ وہ ایک سمجھ دار مرد یا عورت ہوگی جسے معلومات کے کثیر ذخیرے کو پراسیس کرنے، اس کا تجزیہ کرنے اور ان کی بنیاد پر عملی اقدامات کا فیصلہ کرنے کی تمیز حاصل ہوگی۔

ایسا ہر سپاہی جو سپرمین اور کام کو اختتام تک پہنچانے والے فرد کی حیثیت سے جانا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پہچانا جائے گا، اسے اس حد تک سنجیدگی سے ضرور لیا جا رہا ہے کہ ایبرڈین میری لینڈ میں امریکی فوج کی انسانی انجینئرنگ لیبارٹری کے ایک گروپ نے اس کے موجودہ تصور کو شکل دینے کا فرضہ انجام دیا ہے۔

پینٹا گون میں جنگی ضروریات کے ڈائریکٹر میجر جنرل فورسٹر کے بیان کے مطابق ایس آئی بی ایس کا آخری مقصد'' فرد کے موثر ہونے کی صلاحیت میں اضافہ کرنا ہے تاکہ آپ سپاہیوں کی کم تعداد میں گزارہ کر سکیں۔ نرم جلد کے ماسک سپاہی جتنی کم تعداد میں میدان جنگ میں آئیں گے، جانی نقصانات بھی اتنے ہی کم ہوتے جائیں گے۔''

فوریسٹر کہتا ہے،''اسے سائنس فکشن کا حصہ سمجھئے یا نہ بہرحال ایکسوسکیٹیل ڈھانچہ یا ایکسو انسان اس کے متعلق اس وقت زوروں سے بحث جاری ہے اور اگرچہ یہ دور کی بات نظر آتی ہے تاہم یہ سب کچھ طبعیات کے قوانین سے عین مطابقت رکھتا ہے۔ اس پر عمل کرنے کے لئے قوانین میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے اصل کمال ان پر کفایت اور قابل اعتماد طریقے سے عمل کرنے میں ہے۔

چیونٹیوں کی یلغار

معروف قوانین کے ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے دیکھا جائے تو اس وقت اور بھی بہت زبردست قسم کے امکانات موجود ہیں۔ مثال کے طور پر مائیکرو مشینیں ان دنوں ابتدائی مائیکرو مشینوں کو پیٹنٹ کرایا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر ایک برقی موٹر جس کی طوالت ایک ملی میٹر ہے مگر جو پروفیسر جونز جی سمٹ س کے بیان کے مطابق چیونٹی کی جسامت کے ایک روبوٹ کو چلا سکتی ہے۔''

پروفیسر سمٹس جو بوسٹن یونیورسٹی میں الیکٹریکل انجینئر ہے، کہتا ہے:''ذرا سوچئے اگر آپ ایک چیونٹی کو کنٹرول کر سکتے ہوں تو اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ مائیکرو روبوٹ کو چلانے کے لئے جس توانائی کی ضرورت ہوگی اسے ایک مائیکروفون سے حاصل کیا جا سکے گا جس میں آواز کو توانائی میں بدلنے کی صلاحیت موجود ہوگی۔

اس بارے میں زیادہ تخیل آفرینی کی ضرورت نہیں ہے کہ دشمن کے ریڈار کی تنصیبات پر روبوٹی چیونٹیوں کی یلغار سے کیسی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے یا یہ طیارے کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انجنوں اور کمپیوٹروں کے مرکزی حصے میں داخل ہوکران کا کیا حشر کرسکتی ہیں۔

یہ امر بھی خاصا دلچسپ ہے کہ کل آنے والی مشینوں کے مقابلے میں جو''نینو'' مشینوں کے نام سے اس وقت تیاری کے مراحل میں ہیں۔ یہ مائیکرو مشینیں کافی بڑی، بے ڈول اور جناتی قسم کی نظر آئیں گی۔ اگر مائیکرومشینیں اتنی چھوٹی ہیں کہ وہ انفرادی خلیوں کی نگرانی کرسکتی ہیں تو متذکرہ ''نینو'' مشینیں ان ذروں کی نگرانی کے قابل ہیں جن سے خلیے تشکیل پاتے ہیں۔ ''نینو'' روبوٹ اتنے چھوٹےہوں گے کہ وہ انسانی جسم کے اندر دوران خون کی لہروں میں سب میرینوں کی طرح تیرتے پھریں گے اور ذروں کی سطح پر سرجری میں بھی کارآمد ثابت ہوں گے۔''

''نینو'' ٹیکنالوجی پر امریکہ اور جاپان میں کام ہو رہا ہے جہاں یوتا، روبیٹا مورا اور ہیروشی مروشیتا جیسے محققوں نے ایک جائزہ مکمل کرلیا ہے جس کے مطابق ''نینو'' میٹر کی دنیا اور انسانی دنیا کے درمیان باہمی اختلاط ممکن ہوگا۔25 سائنس دانوں کے جو''نینو'' ٹیکنیکل پر کام کر رہے ہیں، ایک حالیہ جائزے کے مطابق اگلے دس یا بیس سال میں ہم نہ صرف ذرے کی سطح کے اجزاء تیار کرلیں گے بلکہ انہیں خودسازی کے قابل بھی بنالیں گے۔ مطلب یہ کہ ان کی نسل کشی بھی ممکن ہو سکے گی۔

یہاں ہم خود ساختہ جنگی مشنوں کی طرف واپس آتے ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ مثال کے طور پر سمارٹ قسم کے خفیہ آلات جن کے بارے میں اب تک ہم بات چیت کرتے رہے ہیں۔ یہ موجودہ ٹیکنالوجی کی آخری توسیعی حدوں تک پہنچ چکے ہیں لیکن آر اے این ڈی کارپوریشن کے ایک ماہر طبیعیات کا کہنا ہے کہ اب ہم ایسے خفیہ آلات کی تلاش میں ہیں جن کا مواصلاتی نظام میں داخل کیا جانا ممکن ہو یا ایسے آلات جو وہاں بیس سال تک پڑے رہیں اور محض اس انتظار میں دم سادھے رہیں کہ بوقت ضرورت ریموٹ کے ذریعے انہیں متحرک کیا جا سکے۔ سطح زمین کے نیچے پڑے ہوئے ان آلات کا سائز اتنا چھوٹا ہوگا کہ مشکل ہی سے ان کی نشاندہی کی جا سکے گی۔

اس کے بعد سپر سمارٹ خفیہ آلات اور بارودی سرنگوں کے بارے میں سوچئے جن میں سے کچھ ''نینو'' میٹر کے سائز کی ہوں گی اور جیسا کہ پچھلے پیراگراف میں بیان کیا جا چکا ہے، اپنی نسل میں اضافہ کرنے کے قابل بھی ہوں گی۔ اب اپنے ذہن میں ایک تصویر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لایئے جس میں ایک عالمی پولیس فورس ان خفیہ آلات اور بارودی سرنگوں کو ایک پسماندہ ملک کی زمین میں بو دیتی ہے اور اس کی پروگرامنگ اس طرح کر دی جاتی ہے کہ فوجی لحاظ سے اس حساس علاقے میں ان کی تعداد مقررہ گنجان حد تک پہنچ جاتی ہے۔ عملاً ایسی اشیاء کو ڈھونڈ نکالنا غیر ممکن ہوگا اور بظاہر ان سے بظاہر کوئی خطرہ بھی نہیں ہوگا لیکن ان سرنگوں کو باہر سے توانائی کے ذرات کے ذریعے مسلح اور زندہ کرنا ممکن ہوگا۔ عین اس وقت اس ملک کے مقامی صدام حسین سے کہا جاتا ہے کہ وہ کیمیاوی ہتھیاروں کے اپنے پلانٹ بند کر دے یا پھر اپنے تمام فوجی اڈوں کی تباہی کے لئے تیار ہو جائے۔ یہ صورت حال اس وقت تک موثر رہتی ہے جب تک دشمن ری پروگرامنگ نہیں کر لیتا یا خفیہ آلات اور سرنگیں نسل بڑھانے کے عمل کو روکنے سے انکار کر دیتی ہیں۔ اس موقعہ پر بہرحال یہ سب باتیں اور منصوبے خیالی پلاؤ پکانے کے مترادف ہیں، مگر لیونارڈو نے جب اڑتی مشینوں کی نقشہ کشی کی تھی، اس وقت ان کی حیثیت بھی تو یہی تھی۔

طاعون

بہرحال ''نینو'' ٹیکنالوجی کی خوساختہ نسل کشی تک پہنچنے اور غیر معمولی دہشت زدگی کا سامنا کرنے کے وقت کا ہمیں انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے بہت پہلے جب سائنسی علم کا پھیلاؤ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا، روایتی کیمیائی اور جراثیمی ہتھیاروں کو ''غریب آدمی کے ایٹم بم'' سے خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔

اگرچہ خود اپنی فوجوں کو نقصان پہنچانے کا خطرہ مول لئے بغیر کیمیائی یا جراثیمی ہتھیاروں کا استعمال آسان نہیں ہے لیکن یہ خطرہ کل کے پول پاٹ یا صدام حسین کو ہرگز پریشان نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر سے لیبیا، ہندوستان، پاکستان، چین اور شمالی کوریا (عراق کا تو ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے) وغیرہ کے پاس، جن میں سے اکثر ممالک آنے والے عشروں میں سیاسی اور اقتصادی عدم استحکام کا شکار بھی ہو سکتے ہیں، ایسے ہتھیاروں کی موجودگی پر بجا طور سے تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

جنوری 1993ء میں دنیا کے 120 ممالک کافی خودستائی اور ربع صدی کی بات چیت کے بعد پیرس میں کیمیائی ہتھیاروں پر پابندی کے کنونشن کے انعقاد کے لئے جمع ہوئے۔ یہ کنونشن اصولی طور پر کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری یا ان کا ذخیرہ کرنے پر پابندی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عائد کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس پر عملدرآمد کے لئے کیمیائی ہتھیاروں پر پابندی کے نام سے ایک تنظیم بھی وجود میں لائی گئی جس کا کام معاہدے پر عمل کے کام کی نگرانی کرنا تھا۔ اس کے انسپکٹروں کوایٹمی توانائی کی ایجنسی کے انسپکٹروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اختیارات دیئے گئے تھےلیکن عرب لیگ کے 21 ممبروں نے اس میں اس وقت تک شمولیت سے انکار کیا جب تک اسرائیل شرکت نہیں کرتا۔ عراق نے تو اس میں سرے سے اپنا کوئی نمائندہ بھیجا ہی نہیں۔ اس کنونشن کے فیصلوں اور معاہدوں کا نفاذ اس وقت تک ممکن نہیں ہوا جب تک آدھا سال گزرنے کے بعد65 ممبر ملکوں نے اس پر دستخط نہیں کر دیئے۔

روس نے جو کیمیائی ہتھیاروں کے خاتمے کی بار بار قسمیں کھا چکا ہے، حال ہی میں اپنے دو سائنس دانوں ویل مرزا یاکوف اور لیو مردووف کو صدر یلسن کی طرف سے امریکہ کو اس معاہدے کے حق میں زہر پھیلانے والے اس ہتھیار کے خاتمے کی یقین دہانی کرانے کے بعد پریس میں یہ انکشاف کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے کہ ماسکو کی ایک لیبارٹری میں ایک نیا کیمیائی ہتھیار تیار کیا جا رہا ہے۔

جہاں تک جراثیمی جنگ آزمائی کا تعلق ہے، جو کئی لحاظ سے وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے کا بدترین ہتھیار ہیں، اب یہ حقیقت ظاہر ہوگئی ہے کہ ایسے ہتھیاروں پر پابندی کے معاہدے پر1972ء میں دستخط کرنے کے بہت بعد بھی سوویت یونین میں ان کی تیاری کا کام جاری رہا۔ حتیٰ کہ گورباچوف کے صاف انکار کے بہت بعد تک بھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ ستم تو یہ ہے کہ سوویت یونین کے انتشار، خاتمے اور پھر روس کہلانے کے بعد بھی ان ہتھیاروں کی تیاری ختم نہیں ہوئی۔ روس کے صدر یلسن نے جب جراثیمی ہتھیاروں کی تیاری کے خاتمے کا کھلے بندوں اعلان کیا، اس کے بعد بھی یہ سلسلہ پوری طرح نہیں رکا۔ اس منصوبے میں جو پروگرام شامل تھا...... اور شاید اب تک بھی شامل ہو وہ طاعون پھیلانے کے ایسے جراثیم کی تیاری تھا جو ایک چھوٹے سے شہر کی آبادی کے کم سے کم آدھے حصے کا کم سے کم وقت میں صفایا کر سکے۔

سوال یہ ہے کہ ایک ایسے ملک میں جو سیاسی لحاظ سے شکست و ریخت کا شکار ہو اور جہاں انتشار کا دور دورہ ہو، وبائیں پھیلانے کا یہ ذریعہ جواب تک سابق سوویت یونین کی لیبارٹریوں میں محفوظ ہے کس کے کنٹرول میں ہوسکتا ہے اور یہ کہ اس قسم کے خوفناک

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ذرائع کو کہاں تک محفوظ قرار دیا جا سکتا ہے۔

سوویت یونین نے 1976ء میں اپنی لیبارٹریوں میں جراثیم کی پیدائش کے خوفناک نتائج سے باخبر ہونے کے باوجود ان زہریلے اڈوں پر پابندی کا مطالبہ کیا تھا۔ اس نے اس موقعہ پر نسلی امتیاز کے نقطہ نظر سے تیار کئے جانے والے ان ہتھیاروں کی...... جو صرف کسی خاص نسلی گروہ سے تعلق رکھنے والوں کو فنا کے گھاٹ اتارنے کے لئے تیار کئے جائیں گے...... تیاری کے امکانات پر تشویش و اضطراب کا اظہار کیا اور انہیں نسلی بنیادوں پر انسان کشی کے ہتھیاروں کا نام دیا۔ سویڈش نیشنل ڈیفنس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر بورائی بیک نے 1992ء میں یہ انکشاف کیا کہ مختلف نسلی اور لسانی گروہوں کے درمیان ہم جیسے جیسے متنوع قسم کے امتیازات سے آگاہی حاصل کرتے جائیں گے، ہمارے لئے کالے اور گورے کے درمیان مشرقی لوگوں، یہودیوں، سویڈش نسل کے افراد اور فن لینڈ کے رہنے والوں کے مابین تخصیص کرنا آسان ہوتا جائے گا اور ہم ایسے ایجنٹ تخلیق کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو ہجوم میں موجود محض ایک خاص گروپ کے لوگوں کو ہلاک کرے گا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ نسلی برتری کی بناء پر کمتر درجے کے لوگوں کی صفائی کرنے والے کل اس ٹیکنالوجی کی مدد سے کیسا حشر برپا کر سکتے ہیں؟

ہتھیاروں کی نسلی تخصیص کے مطابق تیاری کے سلسلے میں تنبیہ، ایک اور لحاظ سے بھی فوری اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ سائنس کی حالیہ تحقیقات سے، جن کا تعلق انسان کی جبلی خصوصیات سے ہے، ڈی این اے کے اصرار کی پردہ کشائی کے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔ اس تحقیق کو آگے بڑھانے سے یہ ممکن ہو سکے گا کہ جنگ کے لئے ہم عام سپاہیوں کی جگہ ''انسانوں کی طرح کے منظم سپاہی'' یعنی ''پیرا ہیومن'' تیار کر کے میدان جنگ میں لے آئیں۔ یہ بلاشبہ بڑی حیرت انگیز بات ہوگی لیکن اسے امکان کی حدوں سے ماورا قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس کے بعد ماحولیاتی ہتھیاروں کا معاملہ سامنے آتا ہے...... جب صدام حسین نے کویت کے تیل کے کنوؤں کو آگ کا فلیتہ دکھایا تو وہ وہی کچھ کر رہا تھا جو کچھ لوگوں کے بیان کے مطابق رومیوں نے کارتھیج کے کھیتوں میں نمک برسا کر کیا تھا اور جو روسیوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران خود اپنے کھیتوں کے ساتھ کیا جب انہوں نے نازی حملہ آوروں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کو خوراک سے محروم رکھنے کے لئے ''زمین کی تباہی'' کی پالیسی اختیار کی، ویت نام کی جنگ میں امریکہ بھی ایسا ہی کچھ کر چکا ہے لیکن آج کے تصوراتی اور بعض فہمیدہ امکانات کے مقابلے میں جن کا تعلق بہت اعلیٰ قسم کے ماحولیاتی ہتھیاروں کی تیاری سے ہے، اوپر بیان کی گئی کارروائیاں بڑی پرانی اور فرسودہ نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ خصوصی برقی لہروں کی مدد سے دور دراز کے کسی علاقے میں زلزلے یا آتش فشاں جیسی قیامتیں ڈھائی جاسکیں۔ ہوا کا رخ تبدل کر دیا جائے، کسی خصوصی فصل کی تباہی کے لئے خاص قسم کے جراثیم چھوڑ دیئے جائیں، لیزر کی مدد سے دشمن کے علاقے کے عین اوپر اوزون کے کسی خاص حصے میں مقررہ سائز کا سورخ کر دیا جائے یا موسم میں ردوبدل کر کے مطلوبہ مقاصد حاصل کئے جاسکیں۔

ورلڈ واچ انسٹی ٹیوٹ کے لیسٹر براؤن نے جو واشنگٹن ڈی سی کے ممتاز ماحولیاتی تھنک ٹینک کی شہرت رکھتے ہیں۔1977ء میں اسی طرف اشارہ کر دیا تھا اور کہا تھا، آب و ہوا میں شعوری تبدیلیوں کی کوششیں اب معمول کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہیں جس سے موسمی جنگ آزمائیوں کے امکانات بڑھ رہے ہیں۔ اس لئے کہ جن ملکوں کو خوراک کی پیداوار بڑھانے کی مجبوری درپیش ہے وہ بارش کی موجود مقدار کے حصول کے لئے مقابلے پر اتر آئی ہیں۔ موسموں میں معمولی تبدیلی لانے کا عمل بھی اگرچہ ابھی تک خاصا مشکل نظر آتا ہے تاہم اس سے موسموں میں بہت بڑے تغیر کی افواہوں کا خاتمہ نہیں ہو سکا۔ عالمی درجہ حرارت میں اضافے کی اطلاعات کی وجہ سے کرہ ارض کے ساحلی علاقوں میں پانی کی سطح بلند ہونے کی خوفناک بحث جاری ہے اور قطبین پر برف پگھلنے کے خدشات کا کھلے بندوں اظہار کیا جا رہا ہے، لیکن برف پگھلانے کا وہ منصوبہ اب بہت کم لوگوں کو یاد ہوگا جو لینن نے انقلاب روس کے فوراً بعد پیش کیا تھا۔

روس کا تاریخی سٹریٹیجک مسئلہ اس کی بحریہ کی گرم پانی کی بندرگاہ سے محرومی تھی۔ اس کی ساحلی پٹی بہت طویل تھی لیکن اس کا زیادہ حصہ سائبریا کے شمال میں واقع تھا جہاں پانی برف اور زمین منجمد رہتی ہے۔ بحیرہ قطب شمالی میں البتہ سائبریا کے دریاؤں کا تازہ پانی شامل ہوتا رہتا ہے، لینن کا منصوبہ ان دریاؤں کا پانی ڈیموں میں ذخیرہ کر کے ان کا رخ جنوب کی طرف موڑنے کا تھا۔ اس طرح سے پن بجلی کی پیداوار میں زبردست اضافہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہو جاتا، جس سے صنعتی سرگرمیوں میں تیزی آ سکتی۔ علاوہ ازیں سائبریا کی آب و ہوا میں گرمی کچھ بڑھ جاتی جو قابل زراعت زمین میں اضافے کا باعث ہوتی۔ اس انتظام کے تحت تازہ پانی سمندر میں گرنے کی مقدار کم ہو جاتی جس سے اس پانی میں موجود نمکیات کی مقدار بدل جاتی جو برف پگھلانے کے عمل پر منتج ہو جاتی۔ یوں روس کی بحریہ کے لئے بندرگاہوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جس سے روس کی دوسرے عالمی سمندروں تک رسائی ممکن ہوتی۔

اس خوفناک ماحولیاتی منصوبے پر تو بوجوہ کوئی پیش رفت نہیں ہوئی البتہ سوویت یونین نے1956ء میں امریکہ کے ساتھ مل کر ایک مشترکہ منصوبے پر عملدرآمد کی تجویز پیش کی جس کے تحت بیرنگ کی کھاڑی کے آگے بند باندھ کر لینن کی تجویز کے مطابق بحیرہ قطب شمالی کے پانی کو گرم کرنا مقصود تھا۔ ایٹمی پمپوں کے ذریعے یہ پانی شمال کی طرف پہنچایا جا سکتا تھا جس سے نہ صرف روس فائدہ اٹھاتا بلکہ الاسکا والے بھی اس سے مستفید ہو سکتے۔

کہا جاتا ہے کہ امریکہ نے اس منصوبے کو پینٹا گان کے اس اعتراض کے بعد مسترد کر دیا کہ اس سے امریکہ کے مغربی ساحل کے زیر آب آنے کا خطرہ تھا کیونکہ اس انتظام کے تحت جنوبی کیلیفورنیا سے لے کر جاپان کے ساحلوں تک پانی کی سطح 5فٹ تک بلند ہونے کی توقع تھی۔

سوویت روس نے اپنی ناکامیوں کا اثر قبول کئے بغیر اس قسم کی ایک اور تجویز اس کے بعد جاپان کو پیش کر دی جس کا مقصد اوکھوسٹک کے سمندر کے پانی کو گرم کرنا تھا۔ یہ تمام منصوبے روسی بحریہ کے جہازوں اور سب میرینوں کے لئے یقیناً بہت اہم ثابت ہوتے۔

بین لاقوامی معاہدے ماحول میں تبدیلیوں کی ایسی فوجی یا غیر فوجی مخالفانہ کوششوں کی مخالفت کرتے ہیں جن کے اثرات ، وسیع ، دیرپا یا شدید ہو سکتے ہوں لیکن بہرحال اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ صدام حسین نے جس رات خلیج فارس میں کویت کے آسمانوں کو دھوئیں کے بادلوں سے سیاہ کرنے کے لئے سمندر میں تیل بہایا تھا اس رات کو بیٹھا وہ ان بین الاقوامی معاہدوں کی شقوں کا مطالعہ کرتا رہتا۔

جب تک اس کے بارے میں صحیح اندازے قائم کرکے اس کے درست استعمال

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی راہ ہموار نہیں کی جاتی اس وقت تک کل کی انقلابی ٹیکنالوجی کرہ ارض کی تباہی کے نئے امکانات لئے ہوئے ہے۔ تیسری لہر کے دور کی ایک نئی جنگی قسم نمو پا رہی ہے۔ کیا اب بھی کسی کا یہ خیال ہے کہ گزرے ہوئے کل کی تدارک جنگ کی کوششیں اب بھی کافی سمجھی جا سکتی ہیں؟

امریکی سینیٹ کی امور خارجہ کی کمیٹی کے سامنے 1975ء میں اقوام متحدہ کے مستقبل کے بارے میں سماعت کے دوران مرحوم مصنف اور ایٹمی ہتھیاروں کے زبردست مخالف نارمن کزن سے سوال کیا گیا تھا کہ ایٹمی ہتھیاروں کے مزید پھیلاؤ کو روکنے کے لئے کیسے اقدامات ضروری ہیں تو اس نے جھلاہٹ سے جواب دیا، دنیا کو اس بارے میں تیس برس قبل غور کرنا چاہیئے تھا۔

شہادت دینے کی جب ہماری باری آئی تو ہم نے سینیٹروں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ اور باقی دنیا اب تیس برس بعد آنے والے ہتھیاروں کے بارے میں پریشان ہونا شروع کر دیں تو بہتر ہوگا۔ آج بھی وہی صورت حال ہے۔ ضعف بصر اور فکر کی کمی کی بیماریاں ایسے عارضے ہیں جو جنگ کے حامیوں اور مخالفوں دونوں کو یکساں طور سے اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

خونریزی کے بغیر جنگ

عالمی ذرائع ابلاغ پر نام نہاد ''سمارٹ'' ہتھیاروں کا انکشاف ان کے پہلی بار استعمال ہونے اور جنرل موریلی کی طرف سے ہم پر ان کی اہمیت واضح کرنے کے کئی عشروں بعد ہوا۔ لیکن یہ ذرائع ان نئی قسم کے ہتھیاروں سے جن کی اہمیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ متذکرہ ہتھیاروں سے بھی کہیں زیادہ ہوگی ابھی تک بالکل ناآشنا ہیں...... یہ وہ ہتھیار ہیں جو لوگوں کو زندہ رکھنے کے لئے بنائے جا رہے ہیں۔

اس وقت ہم تاریخ کے ایک نئے موڑ پر ہیں۔ گذشتہ نصف صدی کے بعد سے جب ہلاکت آفرینی کی کوششیں آخری حدوں کو چھونے لگی تھیں، ہم ایسے موڑ پر آ گئے جب ایٹمی ہتھیاروں کے خطرے کی وجہ سے کم از کم اصولی حد تک اس کرہ ارض کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا تھا......اور وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کو زیادہ سے زیادہ ہلاکت

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خیز بنانے کی کوششیں، شکست خوردگی پر منتج ہو رہی تھیں اور پھر یہ معاملہ اس صورت میں سامنے آیا کہ دونوں سپر طاقتیں عملاً اس نتیجے پر پہنچیں کہ ان کے یہ ہتھیار اور کچھ نہیں تو انتہائی ہلاکت خیز ضرور ہیں......حقیقتاً یہ جدلیاتی نفی کا نکتہ تھا، لیکن یہ ایسا لمحہ تھا جب تاریخ اپنے سفر کا رخ موڑتی ہے۔

آج کرہ ارض پر اسلحہ کی ایک نئی دوڑ کا آغاز ہوسکتا ہے......ایسی دوڑ جس میں ہلاکت آفرینی کی استعداد بڑھانے کی بجائے ہتھیاروں میں ہلاکت خیزی میں کمی پر توجہ دی جائے گی۔ اگر ایسا ہوا تو دنیا کو اس کے لئے میاں بیوی کی ایک ایسی غیر معمولی ٹیم کی کوششوں کا مرہون منت ہونا پڑے گا جو برسوں سے خاموشی کے ساتھ جنگ آزمائیوں کے عمل سے خونریزی کو خارج کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔

امریکہ کی اٹارنی جنرل جینیٹ رینو مئی 1993ء میں امریکی کانگرس کے سامنے امریکہ کے جاسوسی محکمے ایف بی آئی کا وہ معجزاتی سلوک زیر بحث لانے کے لئے پیش کرنے کے قابل ہوئی جو اس نے ٹیکساس میں ''وآلو'' کے مقام پر ایک فرقے کے ساتھ روا رکھا تھا۔ یہ وہ آگ تھی جس نے برانچ ڈیویڈین فرقے کے کمپاؤنڈ میں بہتر زندگیوں کو ختم کر دیا اور چاروں طرف سے الزامات اور جوابی الزامات کے سلسلے کو جنم دیا۔ رینو نے کانگرس کے ممبروں کو بتایا کہ جن مذاکرات کے دوران یا نتیجے میں ایف بی آئی نے اس فرقے کے لوگوں پر جب حملہ کیا تو اس دوران یہ خواہش اس کے دل میں جاگزیں رہی کہ کاش ہلاکت خیزی سے مبرا کوئی ایسا جادو اس کے ہاتھ آ جائے جس کی مدد سے وہ انسانی زندگیوں بالخصوص ان بچوں کی جان بچا سکے جو اس ہجوم کی تحویل میں تھے۔ ایسا موقع کبھی نہ کبھی تو ضرور آئے گا اور اس کے لئے جینیٹ مورس اور اس کا شوہر کرس ہمارے شکریے کے مستحق ہوں گے۔

بظاہر سخت کوش اور سخت گو جینیٹ مورس اوراسکا شوہر سخت گیری کے ہرگز قائل نہیں ہیں۔ وہ فوج کے معاملات پر البتہ توجہ ضرور دیتے ہیں، وہ قومی ریاستوں کی اخلاقیات یا ان پر اعتماد کرنے کے بارے میں بھی کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہیں۔ وہ امن کے علمبرداروں کے درمیان نعرے لگاتے ہوئے بھی کہیں نظر نہیں آئیں گے۔ اس کی بجائے ماضی قریب کے زمانے تک وہ عام طور سے پینٹاگون کے تہ خانے یا واشنگٹن میں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

واقع امریکی عالمی حکمت عملی کی کونسل کے دفتر میں موجود پائے جاتے تھے۔ یہ کونسل جو بی ایس سی کہلاتی ہے، ایک نجی تنظیم ہے جس کا سربراہ سفید بالوں والا بارلیش اے کلائن ہے۔ یہ ریچھ نما انسان ایک زمانے میں سی آئی اے کا ڈپٹی ڈائریکٹر تھا۔1950ء میں ایک پرانے اجتماع میں انہی کلائن صاحب نے نیشنل سیکیورٹی کونسل میمورنڈم نمبر 68 کی تیاری میں پورا پورا حصہ لیا تھا جس میں پہلی بار روسی کمیونزم کے اثر و رسوخ کو محدود کرنے کی کوششوں کو امریکی خارجہ پالیسی کی بنیاد قرار دیا گیا تھا۔ جینیٹ مورس اور اس کے خاوند نے جب جنگ کے عمل سے خونریزی خارج کرنے کے لئے اپنی زندگی کے ماہ و سال وقف کرنے کا فیصلہ کیا تو سب سے پہلے وہ کلائن کے پاس گئے جو ان کا خاندانی دوست تھا۔ اس نے ان کو اپنی اس جی ایس سی کونسل میں شامل کر لیا اور چند اہم افراد کو ان کے ساتھ شانہ بشانہ مل کر کام کرنے کے لئے تیار کیا۔ سخت کوش قسم کے ان مشیروں میں سٹریٹیجک ائر کمان کے سامنے چیف آف سٹاف میجر جنرل کرسٹوفر ایڈمز، فوج کے سابق چیف آف سٹاف جنرل ایڈورڈ میئر اور لارنس لورمونیشنل لیبارٹری کے سائنس دان لوئل وڈ شامل تھے۔ اچھے ذہن کے مالک ان ممتاز افراد کے ساتھ مل کر دورسز جوڑے نے اپنے کام کا آغاز کیا۔ کم از کم اس وقت ہلاکت خیزی کے خلاف وہ دنیا کی پہلی مضبوط آواز بن گئے۔

جینیٹ مورس 47 برس کی شدت پسند، سفید بالوں والی خاتون ہے جس کے بال اس کی کمر تک لہراتے رہتے ہیں۔ موسم گرما کے ایک گرم دن جب ہماری اس سے ملاقات ہوئی تو وہ کالے بوٹ، بھورے رنگ کا پاجامہ، ہلکے رنگ کی جیکٹ اور خاص قسم کا دھوپ کا چشمہ پہنے ہوئے تھی۔ معمولی اور تھوڑی گفتگو پر بے صری کا اظہار کرتے ہوئے وہ الیکٹرانک کی رفتار سے سوچتی اور اس اشارے سے گفتگو کرتی ہے۔ کرائس اس کا شوہر ایک سابق موسیقار ہے جس نے کمپیوٹروں کے ذریعے اپنے لئے ایک نیا راستہ بنایا ہے۔ ہ نرم لہجے میں بات کرتا ہے اور اگرچہ کچھ کچھ گنجا ہو رہا ہے، مگر اپنے باقی بچے ہوئے بالوں کو پونی ٹیل کی شکل میں باندھے رکھتا ہے۔ یہ دورسز جوڑا حقیقی دانش وروں کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے کے نظریے سے دستبردار ہونے کے سلسلے میں آج کے فوجی سن ڈوز کا یہ مشہور مقولہ دہرانے کے بہت شائق ہیں کہ ”ایک سو جنگوں میں ایک سو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کامیابیوں کا حصول مہارت کی انتہا نہیں ہے بلکہ مہارت کی انتہاء، دشمن کو بغیر لڑے زیر کرنے میں ہے۔'' جینیٹ اور کرس مورس اس خیال کو نئی حکمت عملی کے طور پر آگے بڑھانے میں مصروف ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جب اس وقت بہت سی نئی صورتیں موجود ہیں اور نئی ٹیکنالوجی کی کچھ اور فتوحات کچھ دیر بعد اور بھی منظر عام پر آ سکتی ہیں جن سے دشمن کو شکست دینے کے کام میں مدد لی جا سکتی ہے اور وہ بھی کم سے کم خونریزی کے ساتھ......تو پھر آخر خودکشی کے دستے تیار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ غیر مہلک طریقے بہرحال منتشر اور غیر مستحکم صورت میں ہیں اور فوج کے، کہ روایتی طور پر جس کا زور دشمن کو فنا کرنے کا ہوتا ہے، حوالے سے باہر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جنگ اور سفارت دونوں کو نئے سرے سے نیا تصور دینے کی ضرورت ہے۔ ان کا مشن ایسے طریق کار اور ایسے نظریے کو ترقی دینا ہے جس کی روشنی میں غیر مہلک جنگوں کا تصور راسخ ہو سکے۔

وہ ایسی ٹیکنالوجیز کو غیر مہلک قرار دیتے ہیں جن کی مدد سے مہلک ذرائع کے بارے میں اندازے قائم کرنا، ان کی نشان دہی کرنا اور ان کو روکنا ممکن ہو سکے تاکہ لوگوں کی ہلاکت کے خطرے کو کم سے کم کیا جا سکے۔

اس جوڑے نے فوجی اہمیت کے لحاظ سے ایسی ٹیکنالوجیز کی ایک طویل فہرست تیار کرنا شروع کر دی ہے جو غیر مہلک جنگوں کے ان کے معیار پر پوری اترتی تھی۔ انہوں نے یہ خیال بھی رکھا کہ ان کے تیار کردہ طریقے مالی لحاظ سے بہتر، زندگی بچانے والے اور ماحولیاتی لحاظ سے دوستانہ ہوں۔ مطلب یہ کہ ان طریقوں پر عمل کرنے کا مقصد انسانی زندگی کا خاتمہ کسی طور بھی نہیں ہونا چاہیے۔

پھر یہ بھی ہے کہ یہ محض خیالی معاملہ نہ ہو، اس تجویز کے ساتھ بہتر مال بھی سامنے آنا چاہیے جو بہت مہنگا بھی نہ ہو، غیر مہلک ٹیکنالوجیز پر مشتمل ان کی فہرست، ان کے دعووں کے مطابق اسی کروڑ ڈالر کے تحقیقاتی منصوبوں سے بھی بے نیاز کر سکتی ہے جبکہ ایسی تحقیقات کے بیس برس گزرنے کے بعد اور تحقیقات کرنے والوں کی اپنی زندگی میں بھی ان کی کامیابی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ کچھ لوگ اس جوڑے کو ضرورت سے زیادہ پرامید ہونے کا طعنہ دیتے ہیں، لیکن ان دونوں کا کہنا ہے کہ غیر مہلک ہتھیاروں کا لامحدود ذخیرہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صرف 5 برس میں تیار کیا جا سکتا ہے۔ جی ایس سی کے لئے تیار کردہ رپورٹوں میں بھی انہوں نے اس سلسلے میں نئی ٹیکنالوجی پر مشتمل جو فہرست پیش کی ہے وہ ان کے خیال میں پختہ، لائق اعتماد اور صرف 5 برس میں قابل عمل ہو سکتی ہے۔

اپنی اس فہرست سے انہوں نے کیمیائی اور جراثیمی ہتھیاروں کے ساتھ ایسے دوسرے تمام ہتھیاروں کو بھی خارج کر دیا ہے جس کی تیاری کی بین الاقوامی قوانین، معاہدوں یا دستاویزات کی رو سے ممانعت ہے۔

انتہائی خفیہ لیبارٹریاں

موریسز جوڑا، فوج کی بعض انتہائی خفیہ لیبارٹریوں کے کام کے بارے میں جو بظاہر غیر مہلک ہتھیاروں کی تیاری میں تحقیقاتی فریضے انجام دے رہی ہیں، متعدد شبہات کا اظہار کر رہا ہے۔ جینیٹ موریس کا کہنا ہے کہ ''یہ لیبارٹریاں اصل میں غیر مہلک ہتھیاروں کی بگڑی ہوئی شکل سامنے لا سکتی ہیں جس کی صورت یوں ہو سکتی ہے کہ یہ ایسے ہتھیار دو حصوں میں بنائیں۔ اور وہ یوں کہ پہلے حصے کے استعمال سے ایک کمرے میں موجود تمام لوگ بیمار پڑ جائیں جب کہ دوسرے حصے کے استعمال سے ہر وہ شخص ہلاک ہو جائے جو پہلے حملے کی زد میں آ چکا ہو۔ جینیٹ کہتی ہے، انتہائی کیمیائی اور جراثیمی مواد پر پوری طرح نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ غیر مہلک ہتھیار واقعتاً غیر مہلک ہی ہونا چاہیئے۔''

اس بارے میں موریسز جوڑے کا ذہن بالکل صاف ہے۔ وہ کہتے ہیں، ''جنگ کبھی انسان دوست، صاف یا آسان نہیں ہو سکتی۔ یہ ہمیشہ ہی خوفناک رہے گی۔'' بہرحال وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں، ''کسی ایک عالمی قوت کو جو اپنے آپ کو انسان دوست قرار دیتی ہو، دفاع کے غیر مہلک اصول پر عمل کرنے کیلئے رہنمائی کا فریضہ انجام دینا چاہیے اور آج کی ٹیکنالوجی دشمن کو زندہ رکھتے ہوئے جارحیت روکنے کے امکانات سے پُر ہے۔''

انہوں نے امریکہ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ''قوموں میں سے یہ صلاحیت سب سے پہلے ہمیں حاصل کرنی چاہیے۔''

غیر مہلک ہتھیاروں کے اثرات کے جائزہ لیا جائے تو اس بارے میں کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ اس معاملے میں فوج بٹی ہوئی ہے۔ فوج کے سابق چیف آف

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سٹاف ایڈورڈ میئر کا جو جی ایس سی کے مشاورتی گروپ کا رکن بھی ہے، کہنا ہے ''فوج میں ایک گروہ اس کے پوری طرح حق میں ہے اور دوسرا اس کا شدید مخالف ہے۔'' کچھ کے لئے جنگ نام ہی مرنے مارنے کا ہے اور غیر مہلک ہتھیار مردانگی کی توہین ہیں۔

لیکن یہ سوچ گزرے ہوئے کل کے زمانے کی جنگوں کی عکاسی کرتی ہے، جس کا تیسری لہر کے زمانے میں جنگوں کی مروجہ اقسام کی ابھرتی ہوئی اخلاقیات اور ٹیکنالوجی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس نئی سپرٹ کی شہادت، خلیج کی جنگ کے دوران سی این این کے فوجی تجزیہ نگار میری سقوکے، جو ایک زمانے میں امریکی فضائیہ کی طویل المعیاد منصوبہ بندی کے شعبے کا نائب سربراہ بھی تھا، ان الفاظ سے بھی ملتی ہے کہ ''فوجی منصوبہ سازوں کی نظر بموں اور میزائلوں کے استعمال سے آگے تک اور اہداف پر ٹھیک ٹھیک نشانے لگانے تک ہونی چاہیے۔ نئی ٹیکنالوجی کے ذریعے جلد ہی ایسے امکانات کا اہتمام کیا جا سکتا ہے جن میں فوجی اہداف کے کلیدی عناصر کی تباہی، سپاہیوں کو ہلاک کئے بغیر یا ہدف کو مکمل طور پر تباہ کئے بغیر ممکن ہو سکے گی۔ اگر انجن کو اس کی کارکردگی کی حد تک ناکارہ بنانے سے دشمن کے ٹینک کو عمل سے محروم کیا جا سکے یا بندوقوں پر کنٹرول کرنے والے کمپیوٹروں کو تباہ کر کے بندوقوں کو ناکارہ بنانا ممکن ہو سکے تو ایسے ذرائع سے جنگوں میں فتح حاصل کرنا بھی ممکن ہو سکے گا جو زیادہ تر غیر مہلک ہیں۔''

کرنل جون وارڈن کی، جس کے فضائی قوت سے متعلق نظریات نے عراق میں امریکی حربی حکمت عملی اختیار کرنے میں بہت رہنمائی کی، آواز میں بھی اسی اصول کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ وارڈن کے خیال میں خلیج کی جنگ ایک تاریخی موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''اس نے ایک بنیادی تبدیلی کی خبر دی اور وہ ہے، قتل عام کے پرانے تصور کی بجائے ایک عبوری دور کی طرف پیش قدمی، جہاں ہم اپنا کام زیادہ آرام اور موثر طریقے سے انسانی زندگیوں کے اتلاف میں زبردست کمی سے کر سکتے ہیں اور یہ سب کچھ ہمارے اردگرد کے حالات اور بجٹ سے پوری مطابقت رکھے ہوئے ہوگا۔''

خلیج کی جنگ کے خاتمے کے ایک برس بعد امریکی محکمہ دفاع نے سرکاری طور پر ایسی ٹیکنالوجی نظریات اور نظام کو ترقی دینے کے فیصلے کا اعلان کیا تھا جس کی بنیاد ہلاکت آفرینی سے گریز پر ہو۔ اسے محکمے نے اپنے الفاظ میں ''سافٹ کل یا نرم موت'' کا نام بھی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دے دیا تھا۔ اس معاملے میں دلچسپی بڑھنے کے بعد امریکی بحریہ کے جنگی کالج نے بھی ایسے دو جنگی کھیل کھیلنے کا اعلان کیا جن میں غیر مہلک طریقے اپنانے کی کوشش کی جائے گی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ حال ہی میں امریکہ میں فوجی بجٹ میں کمی کی جو دوڑ لگی ہوئی ہے، اس کی وجہ سے گو اس میدان میں سرگرمیاں کچھ ماند پڑ گئی ہیں، لیکن خود بجٹ میں کمی کی وجہ ہی سے بالآخر جنگ کے سستے ، چنیدہ اور کم مہلک طریقے ڈھونڈنے کی ترغیب ملے گی۔

دکھائی نہ دینے والی دیوار

غیر مہلک ہتھیاروں کی تیاری کے امکانات اور ان کی تحسین کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم کچھ چیزوں کو تصور کی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کریں۔ یعنی سوچیں کہ ایک دفعہ ایسے ہتھیار مناسب طریقے سے تیار کر لئے جائیں تو پھر یہ سوچنے کی ضرورت ہوگی کہ انہیں کہاں اور کیسے استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اس صورت حال کو اپنے ذہن میں لائیے کہ اسلامی انتہا پسندوں کا ایک غضب ناک ہجوم سمجھ لیجئے کہ سوڈان کے دارالحکومت خرطوم میں مغربی ممالک کے سفارت خانوں پر حملہ آور ہو رہا ہے۔ یہ ہجوم بیشتر مغربی سفارت خانوں میں زبردست توڑ پھوڑ کرتا ہے مگر ''امریکہ مردہ باد'' کے نعرے لگانے کے باوجود حیرت انگیز طور پر امریکی سفارت خانے سے دور رہتا ہے، نہ ہی وہاں سے کسی کو یرغمال بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

جونہی ہزاروں فسادی امریکی سفارت خانے کی عمارت کی بیرونی دیواروں تک پہنچتے ہیں، ان کے رہنما الٹیاں کرتے ہوئے زمین بوس ہو جاتے ہیں اور وہاں سے بھاگتے نظر آتے ہیں۔ احتجاج کرنے والے سینکڑوں لوگوں کے قدم اکھڑ جاتے ہیں۔ دیواروں تک پہنچنے کی کوئی بھی جسارت نہیں کرتا اور زیادہ تر لوگ دور فاصلے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ چکرانے کے چکر میں مبتلا اور پیچش کا شکار ہونے والوں کی تعداد جوں جوں بڑھتی ہے، ہجوم بکھرتا اور وہاں سے واپسی کا راستہ اختیار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ یہ واویلا بھی کر رہے ہیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہو رہا ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خرطوم میں امریکی سفارت خانے کا ایک ترجمان دوسرے سفارت خانوں پر حملے کو ''بین الاقوامی برادری کے خلاف وحشیانہ جرم کا نام دیتا ہے۔'' وہ اس سوال کا جواب دینے سے گریز کرتا ہے کہ کیا وزارت خارجہ نے حال ہی میں اپنے سفارت خانوں کے تحفظ کے لئے ان کی عمارتوں پر ''کوئی خفیہ ہتھیار'' نصب کیا ہے؟

یہ بات بہرحال سب کو معلوم ہے کہ فرانس اور کچھ دوسرے ملکوں نے ہجوم کو کنٹرول کرنے کے لئے ایک نہایت ترقی یافتہ جنریٹر ٹیسٹ کیا ہے جس سے بہت زیریں قسم کی صوتی لہریں خارج ہوتی ہیں جن کے اثر سے ان کی زد میں آنے والے چکرا جاتے ہیں۔ ان پر غشی کے دورے پڑتے ہیں اور وہ اجابت کنٹرول کرنے کی استعداد سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ اثرات عارضی ہوتے ہیں اور جنریٹر بند ہونے سے ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ان کے کوئی مستقل اور دیرپا اثرات دیکھنے میں نہیں آئے۔

امریکہ میں موٹر سوار ان دنوں اپنی گاڑی پر ایک چھوٹا سا آلہ نصب کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس کی وجہ سے کوئی ہرن وغیرہ ان کی گاڑی کی زد میں نہیں آئے گا۔ جنریٹر کی آواز کا نظام بھی اس اصول کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے جو ہرن بچانے کا آلہ تیار کرنے والوں کے پیش نظر تھا۔ اس نوع کے دیگر طریقوں کو وسعت دے کر اس سے کہیں زیادہ ڈرامائی نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یوں خصوصی فوجی دستوں کو پیراشوٹ یا ہیلی کاپٹروں کے ذریعے ایسے ہجوم میں سے کسی ڈر یا کسی کو نقصان پہنچائے بغیر گزارا جا سکتا ہے، جس نے یرغمالیوں کو گھیر رکھا ہو۔ جینیٹ مورس کا کہنا ہے، ''ہمارا خیال ہے کہ ہم نے کچھ جوابی طریقے دریافت کر لئے ہیں جن سے ہمارے سپاہیوں کے لئے نقصان کے خدشے کے بغیر کسی کھیت میں گھس کر کسی جرم یا یرغمالی کو کچھ لوگوں کے پنجوں سے چھڑا کر باہر لے آنا آسان ہو جائے گا۔''

مورسز جوڑے کا کہنا ہے کہ ایسے مدافعتی آلات کی تیاری کے بارے میں بھی سوچا جا سکتا ہے جو سفارت خانوں کی عمارت میں مادی طور پر اس طرح نصب کر دیئے جائیں کہ ان کی وجہ سے یہ پوری عمارت دیواری برقی لہروں کی دیواروں کے معیار پر آ جائے گی اور ان لہروں کو مرضی کے مطابق مختلف شکلوں میں تبدیل بھی کیا جا سکے گا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک ایسی دنیا میں جو مذہبی، نسلی اور علاقائی اختلافات میں بٹی ہوئی ہو، جس میں مہلک ہتھیار بے معنی ہوکر رہ جاتے ہوں اس لئے کہ ان سے نفرت اور تشدد میں کمی کی بجائے ان کی شدت میں اضافے کی توقع ہی کی جا سکتی ہے۔ غیر مہلک ہتھیاروں کو مقبولیت کے لئے فضا یقیناً سازگار ہوسکتی ہے۔

اس بارے میں یقین سے تو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن ''واکو'' جیسے مخمصوں کا سامنا کرتے ہوئے یہ سوچا ضرور جا سکتا ہے کہ مستقبل میں ایف بی آئی متذکرہ فرقے کے بعد ان کے گرد ایک ایسا صوتی جنریٹر نصب کرنے کی کوشش کرسکے گی جو متشدد ہجوم کو بے عمل کر سکے گا اور جس کی وجہ وہ لوگ خود کو نقصان پہنچانے کے قابل نہیں رہیں گے۔

جینیٹ مورس1990ء میں یروشلم میں ہونے والے ٹمپل ماؤنٹ کے قتل عام کا حوالہ دیتے ہوئے کہتی ہے کہ ''یہ خونریزی کا ایک ایسا واقعہ تھا جس سے بچا جا سکتا تھا اور وہ یوں کہ دیوار گریہ کے قریب جمع فلسطینیوں کو صوتی جنریٹروں کے ذریعے اسرائیلیوں سے دور رکھا جا سکتا تھا جن پر وہ پتھر لوہے کے ٹکڑے اور زنجیریں برسا رہے تھے اور اگر اس ہجوم میں شامل لوگ جنریٹروں سے خارج ہونے والی لہروں کی وجہ سے الٹیاں کرنے یا لڑکھڑانے لگتے یا دردسر ان کو گھیر لیتا تو یہ کچھ لوگوں کے ہلاک ہونے سے تو بہتر ہوتا۔'' ایسا کوئی انتظام وہاں نہ ہونے کی وجہ سے 21افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ اس قسم کی اور اس سے کہیں زیادہ نقصان دہ مثالیں تین مین چوک سے تیمور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

اس خیال کو دہراتے ہوئے واشنگٹن ڈی سی کے سٹریٹیجک اور بین الاقوامی سٹڈیز کے مرکز سے متعلق ٹیلر جونیئر، بلقان اور صومالیہ کے درمیان تصادم کو غیر مہلک ہتھیاروں کی تیاری کے کام میں مزید تیزی پیدا کرنے کی مکمل ترین مثال قرار دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے، ''ذرا سوچئے! عالمی برادری اگر وہاں متحارب گروہوں کو ہلاک کرنے کی بجائے ان کو الگ اور غیر مسلح کرنے میں کامیاب ہوتی ہے تو اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی سوچئے کہ اگر اقوام متحدہ کے قیام امن کے فوجی دستے ان کے گولوں اور آنسو گیس کے علاوہ کچھ اور متبادل سامان سے بھی لیس ہوں تو اس کی کیا اہمیت ہوگی۔'' وہ کہتا ہے کہ ''واکو'' میں امریکی حکومت نے جنگ پر قابو پانے کیلئے1929 کی ٹیکنالوجی سے کام لیا اور نتیجہ جہنم کے عذاب کی صورت میں ظاہر ہوا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اونگھتے ہوئے منشیات فروش

پھر ذرا کروش ہیروئن فروشوں کے کسی رہنما پر جو منشیات کی بھاری مقدار لبنان کی وادی میکالے سے ترکی کے راستے بلغاریہ میں سے گزار کر یورپی منڈیوں تک پہنچانے کے کاروبار میں مصروف ہو، چھاپے کا تصور بھی ذہن میں لائیے ۔ اطلاع ملنے پر ترک فوج کا ایک مسلح اور خصوصی طور پر تربیت یافتہ دستہ منشیات کے اس اڈے پر چھاپے میں لیزر رائفلیں استعمال کر سکتا ہے جس سے اڈے کے باہر کھڑے ہوئے پہریداروں کو عارضی طور پر اندھا کرنا ممکن ہے۔ اسکے بعد بیرکوں اور خواب گاہوں میں ایسی دوائیں سپرے کی جا سکتی ہیں جن کے اثر میں آئے ہوئے منشیات کے اونگھتے ہوئے لارڈ اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

لیزر رائفل کوئی خیالی چیز نہیں ہے ان سے دشمن کے ظاہری اور خفیہ سامان کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔ یہ جن لوگوں کے خلاف استعمال ہوتی ہیں، وہ عارضی طور پر اندھے ہو جاتے ہیں۔ ان سے مستقل طور پر نقصان پہنچانے کا کام ہی لیا جا سکتا ہے لیکن اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ان سے ان کی کتنی قوت کے ذریعے کام لیا جا رہا ہے اور یہ کہ جس شخص کو نشانہ بنایا جا رہا ہے وہ کسی قسم کا سامان استعمال کر رہا ہے اور یہ کہ کیا اس نے رات کو دیکھنے میں مدد دینے والے چشمے تو نہیں پہن رکھے جن سے روشنی کئی گنا بڑھی ہوئی نظر آتی ہے۔ امریکہ کی دفاعی خفیہ ایجنسی کے ریٹائرڈ ڈائریکٹر ایچ پروئس کے بیان کے مطابق اس قسم کے ساز وسامان کے فوجی استعمال کے اشتہارات کھلے بندوں شائع ہو رہے ہیں۔ ایسے لاکھوں آلات اس وقت دنیا بھر میں زیر استعمال ہیں اوران میں سے کچھ سوویت فوجیوں نے افغانستان میں مجاہدین کے خلاف بھی استعمال کئے۔

اسی طرح اب نیند کی طرف مائل کرنے والے عامل صرف جیمز بانڈ کی فلموں کا حصہ ہی نہیں ہیں، عالمی حکمت عملی کونسل نے غیر مہلک فنی ہتھیاروں کی جو فہرست تیار کی ہے اس میں ''ماحولیاتی عامل'' کے نام کے ہتھیار بھی شامل ہیں۔ ان کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ جب ہمیں انسانوں اور ساز وسامان کو بے حس اور غیر فعال بنانے کی ضرورت پیش آئے ، خاموش کرنے اور نیند آور آلات کو ڈی ایم ایس او کی (جو خصوصی ادویہ کو جلد کے ذریعے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہایت تیزی کے ساتھ انسان کے خون میں شامل کر دیتا ہے۔) مدد میں تشدد میں کمی اور اتلاف جان کو محدود کرنے کے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر وہاں جہاں ایٹمی، جراثیمی اور کیمیائی ہتھیاروں سے تحفظ سے پورا اہتمام نہ ہو، دہشت گردوں کے خلاف کارروائیوں میں سرکش باغیوں، نسلی تشدد پسندوں، فسادات روکنے والوں حتیٰ بعض صورتوں میں یرغمالیوں کو رہا کرانے کے لئے خاموش اور بے حس کرنے کے زیرِ عمل آلات بڑے اہم مواقع فراہم کرتے ہیں۔ البتہ ان کی اثر آفرینی کا انحصار، صحت کے ساتھ ان کے استعمال اور کسی خاص علاتے ہیں ان کی فراہمی کے نظام پر ہے۔

اب تک جتنی بھی غیر مہلک ٹیکنالوجی کا ذکر کیا گیا ہے، اس کا ہدف انسان ہیں لیکن اس قسم کے دوسرے غیر مہلک طریقے بھی موجود ہیں، جن کا نشانہ دشمن کا اسلحہ یا کمپیوٹر پروگرام ہوسکتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دشمن کے پاس کتنے ٹینک اور طیارے ہیں یا اس کا ریڈار سسٹم کتنا اعلیٰ اور ارفع ہے، اگر ان سب چیزوں کو جہاں ان سے کام لینے کی ضرورت ہے، استعمال ہونے کے قابل ہی نہ رہنے دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ دشمن کے پاس جتنا زیادہ جنگی سامان موجود ہے اور جتنا زیادہ مال اس نے اس پر خرچ کیا ہے اس کے لئے یہ صدمہ بھی اتنا ہی بڑا ہوگا کہ اس کی کارکردگی کو عارضی طور پر ہی کیوں نہ ہو، معطل کر دیا جائے۔ یوں غیر مہلک ہتھیاروں کے نظریے میں ایک کلیدی نکتہ ''خدمت سے انکار'' کا شامل ہوگیا ہے۔

مثال کے طور پر ''حرکت کرنے یا چلنے میں رکاوٹ'' ڈالنے کا معاملہ ہے۔ جی ایس سی کی ایک دستاویز کے مطابق اس کام کے لئے ہر سطح پر پھسلن کا سامان فراہم کر دیا جاتا ہے۔ وہ یوں کہ ہوائی ڈیلیوری سسٹم یا انسانی عاملوں کے ذریعے ٹیفلان قسم کے کسی ماحولیاتی نیوٹرل مائع کا چھڑکاؤ، ریل کی پٹریوں، راستوں، ریمپوں، ہوائی جہاز لینڈ کرنے والی پٹیوں حتیٰ کہ سیڑھیوں اور دوسرے سامان پر کر دیا جاتا ہے جس سے یہ کافی عرصے تک استعمال کے قابل ہی نہیں رہتے۔ اس کے متبادل ایک اور طریقہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں جہاں یہ چیزیں کھڑی ہیں، وہیں ان کو اسی طرح باندھ دیا جائے کہ حرکت ہی نہ کرسکیں۔ پھر لیمر قسم کی لیس دار اور چپکانے والی اشیا کو ہوائی جہازوں کے ذریعے یا دوسرے طریقوں سے اس طرح مقررہ علاقوں تک پہنچا دیا جائے کہ وہاں رکھا ہوا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سازوسامان وہیں چپک کر رہ جائے اور استعمال کے قابل ہی نہ رہے۔

اس طرح انجنوں کو روکنا بھی ممکن ہے' ٹینکوں' بکتر بند گاڑیوں اور ٹرکوں کو ایسے مادوں کے ذریعے جو ایندھن کو منجمد کر دیں یا اس کی ماہیت تبدیل کر کے عارضی طور پر اس کو ناقابل استعمال بنا دیں۔ توانائی سے چلنے والے سیدھے ہتھیار اپنے اہداف کے ڈھانچوں کی شکل بدل سکتے ہیں اور یوں طیارے زمین پر ہی کھڑے رکھے جا سکتے ہیں۔ پھر دھاتوں کو خستگی کا شکار بنانے کے لئے بھی ایک قسم کا مائع موجود ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ مارٹروں کے استعمال سے نقشوں کی جنگ شروع کر دی جائے یا بے رنگ کیمیائی مائع مادوں کا چھڑکاؤ کر کے دھات کی بنی ہوئی تنصیبات' جیسے پُل' پھاٹک' ہوائی اڈروں کی عمارتیں اور تنصیبات' برقی سیڑھیوں اور ہتھیاروں کے کلیدی اجزاء کو نقصان پہنچا دیا جائے۔ یہ مائع ان اشیاء کو ختم کر کے توڑ پھوڑ کے ذریعے ناقابل استعمال بنا دے گا۔

بعد ازاں ہم اس بات کا جائزہ بھی لیں گے کہ غیر مہلک ذرائع کی بنیاد پر ''خدمات سے انکار'' میں اس چھوٹی فہرست کے مقابلے میں' بہت سے اور امکانات بھی پوشیدہ ہیں۔ یہ بہرحال اب تک طے ہو چکا ہے کہ غیر مہلک ہتھیاروں کی اہمیت ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ ان کی فنی معقولیت اور ان پر اٹھنے والے اخراجات پر بحث و تمحیص کی ابھی بہت گنجائش ہے' لیکن اس بارے میں بہرحال کوئی شبہ نہیں ہے کہ اب تیسری لہر کی جنگ آزمائیوں میں' انسانی زندگی کے اتلاف کے امکان کو کم کرنے کے نقطہ نظر سے ان ہتھیاروں کی تیاری کے معاملے کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ مستقبل سے جنگ کے امکانات کو ختم کرنا شاید ممکن نہ ہو' لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ جنگ سے ہونے والی خونریزی میں کمی ہم ضرور کر سکتے ہیں۔

اس امر کا یقین تو کرس اور جنیٹ کو بھی نہیں کہ آئندہ جنگوں سے خونریزی کا مکمل خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی سطح کے تصادم میں کوئی نہ کوئی تو ضرور زخم کھائے گا جیسا کہ جنیٹ کہتی ہے:

''ایسے واقعات کا سامنا ضرور ہوگا جن میں اتفاقی اور حادثاتی اور پر اموات اور سانحے درپیش ہوتے رہیں گے' کسی کے سر پر بھاری شے گرے تو اس کا زخمی ہونا یقینی ہوتا ہے۔ ہم خونریزی سے مبرا ماحول کی ضمانت کیسے دے سکتے ہیں؟''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مستقبل قریب میں غیر مہلک ہتھیاروں کے مہلک ہتھیاروں کی جگہ لے لینے کا امکان بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ''ہم غیر مہلک ہتھیاروں کے یونٹ' خودکش کمانڈر دستے یا اس نوع کے دیگر انتظامات کی کوئی تجویز نہیں پیش کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ موجودہ صورت حال کا متبادل نہیں ہے کہ جہاں ہمارے سپاہیوں کی زندگیاں خطرے میں ہوں' وہاں ہم ایک روایتی فوج بنانے کی کوشش کریں۔'' مگر بہرحال نئی ٹیکنالوجی کی سہولتیں ہمیں جس حد تک میسر ہیں' کمپیوٹروں کے وائرس کے لئے انسانوں کو خاموش کرنے کی استعداد___ ان کی مدد سے اور ان کو ایک ایسے سسٹم میں مربوط کر کے جس سے ان کی کارکردگی میں اضافہ اور مہلک ہتھیاروں پر انحصار میں کمی کے مقاصد حاصل کرنا ممکن ہو سکتے ہیں۔

غیر مہلک عاملوں کا عمل دخل' نظریاتی غور وفکر کے میدان میں لحہ بہ لحہ بڑھ رہا ہے۔ لیکن یہ کام پرانے رویّوں کے خلاف ایک مشکل' سخت اور مسلسل عمل کا متقضی ہے۔ 1922ء میں ایک سال کی داخلی بحث کے بعد امریکی افواج نے ایک دستاویز شائع کی تھی۔ اس کا مقصد جنگ زدہ علاقوں میں ہونے والی ہلاکتوں اور ماحولیاتی اور سماجی ڈھانچوں کے نقصانات میں کمی کے معاملات پر غور کرنا تھا۔ دستاویز میں اس مسئلے پر تحقیقات کے دائرے کو وسیع کرنے پر زور دیا گیا تھا اور یہ کام فوج ہی کے ایک ادارے کے ذمے لگایا گیا تھا' لیکن جب اس میں1933ء میں ترمیم کی گئی' تب بھی ہلاکت خیزیوں میں کمی کی ضرورت کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت تک یہ ایک متنازعہ مسئلہ تھا۔

بہرحال جس حقیقت کو سمجھنے کی اب ضرورت ہے' وہ یہ ہے کہ غیر مہلک ہتھیاروں اور جنگوں اور فوجی ذرائع سے اس کے متعلق نئے نظریات کی تشکیل' یہ دونوں باتیں' تیسری لہر کے معاشروں کی پیداوار ہیں جس کی زندگی میں رواں خون' معلومات' برقیات' کمپیوٹر مواصلات اور ذرائع ابلاغ کا محتاج ہے اور اس میں ذرائع ابلاغ کی اہمیت روز افزوں ہے۔

غیر مہلک ہتھیاروں کی سیاست:

تیسری لہر کے زمانے کے متعدد دوسرے حیرت انگیز مظاہر کی طرح' جو ٹیلی ویژن

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے لے کر علم الخلق کی تصویر کشی تک پھیلے ہوئے ہیں' غیر مہلک ٹیکنالوجی بھی ایک طرف اخلاقی الجھاؤ میں اضافہ کرتی ہے' تو دوسری طرف اس کے کچھ انسانی فوائد بھی نظر آتے ہیں۔

یہ بات اب تک پوری طرح واضح ہو جانی چاہیے کہ ایسے ہتھیار اگر ''اچھے لوگوں'' کی بجائے دہشت پسندوں اور مجرموں کے ہاتھ لگ گئے تو اس سے ان کی طاقت میں زبردست اضافہ ہوسکتا ہے۔ چھوٹے پیمانے پر دیکھا جائے کہ اس صورت میں دہشت پسند یا احتجاجی سیاستدان شہری اداروں کے ڈھانچوں' ہوائی اڈوں' پانی کے ذخیروں کے ساتھ' ان پر کیمیائی مادوں کا سپرے کر کے کیا کچھ نہیں کر سکتے؟ ذرا تصور کی آنکھ سے دیکھئے کہ آج کے دیواری نقشوں والی لوہے کی چادروں پر' ڈبوں میں محفوظ متذکرہ قسم کے کیمیاوی مادوں کے سپرے کا کیا نتیجہ برآمد ہوسکتا ہے۔ ویسے ٹینک کو کسی طریقے سے بے وقعت کرنے کے عمل کا ذکر خاصا امید افزا نظر آتا ہے' لیکن سوچنے کی بات ہے کہ اس عمل کے ذریعے شہری گوریلے' پولیس اسٹیشن سے باہر پولیس کی پارک شدہ گاڑیوں سے کیا سلوک کر سکتے ہیں؟ اور اگر آج کچھ شر پسند کمپیوٹرز کو وائرس کے ذریعے ناکارہ بنا رہے ہیں تو کل یہی یا کچھ دوسرے لوگ مائیکرو ویو ہتھیاروں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کر سکتے! اس بارے میں سوچنا بھی لازم ہے۔

مختار اداروں کی طرف سے استعمال کی صورت میں بھی' غیر مہلک ہتھیاروں کے بارے میں بڑے جامع قسم کے سیاسی اور اخلاقی امور سامنے آتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ جینٹ رینؤ' واکوٗ میں کوریش فرقے کے کچھ لوگوں کو' ان کی مدد سے تشدد سے دور رکھنے میں اور یوں مرنے والے کچھ بچوں کی زندگی تو ضرور بچا لیتیں لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ بہت سی جابر حکومتیں بھی اپنے ملک کے پر امن مظاہرین کے خلاف یہی ہتھیار استعمال کر سکتی ہیں۔

ہجوم پر قابو پانے اور احتجاجی مظاہروں کو منتشر کرنے کے لئے یہ ٹیکنالوجی اتنی موثر ہے کہ ان کی موجودگی میں جمہوریتوں کو اپنی پولیس کے لئے نئے قوانین وضع کرنے کی ضرورت ہوگی۔ پھر یہ سوال ابھرتا ہے کہ ان ہتھیاروں کی درجہ بندی کیسے کی جائے' اور یہ کہ ان میں سے کون سا ہتھیار واقعی غیر مہلک ہے' ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن میں رد و بدل

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی گنجائش ہے- یعنی کم قوت بروئے کار لا کر انہیں کمتر درجے کے عارضی نقصان پہنچانے کے کام میں لایا جا سکتا ہے اور ٹیوننگ کرنے کے بعد ان کی قوت بڑھا کر ان سے مہلک ہتھیاروں کا کام بھی لیا جا سکتا ہے- اس صورت میں انہیں مہلک قرار دیا جائے گا یا غیر مہلک؟ مورسیز جوڑے اور عالمی حکمت عملی کونسل کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ان سوالوں اور دیگر متعلقہ مسائل کو نظر انداز نہیں کیا-

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مضمر خطرات سے بالخصوص جمہوریت کو لاحق خطرات سے بخوبی آ گاہ ہیں- یہی وجہ ہے کہ موسیز جوڑا' اسرار کے اس نا قابل دخول حصار کو توڑنے کی کوشش کر رہا ہے جو اس نسل کے ہتھیاروں کی تیاری کے سلسلے میں خفیہ لیبارٹریوں اور خدمات کے مراکز میں احتسابیوں نے ضرورت سے زیادہ سختی کے ساتھ قائم کر رکھا ہے- یہ اخفاء اتنا سخت ہے کہ مورسیز جوڑے کو بھی جسے اعلیٰ ترین سطح سے کلیرنس مل چکی ہے' ان ہتھیاروں کی تیاری کے مراکز تک رسائی کی اجازت نہیں مل سکی-

یہ دونوں میاں بیوی' فوجی اخفاء کی ضرورت کو ایک حد تک درست قرار دیتے ہیں' لیکن وہ اس بات پر بھی پورا زور دے رہے ہیں کہ مستقبل کے لئے غیر مہلک جنگ آزمائیوں کا معاملہ اتنا اہم ہے کہ اسے وسیع تر پبلک بحث مباحثے کے لئے سامنے لانا ضروری ہے' وہ وزارت دفاع کے بعض حکام کے عتاب کا نشانہ بھی بن چکے ہیں' اس لئے کہ وہ غیر مہلک ہتھیاروں کی تیاری کے معاملے کو امریکی کانگریس کی نگرانی کا پابند کرنے کی بات کر رہے تھے- ان کا کہنا ہے کہ اس مسئلے سے انسانی حقوق کے کچھ ایسے خطرناک معاملات متعلق ہیں کہ ان کو محض فوجیوں کی صوابدید پر چھوڑنا درست نہیں ہوگا-

اسی طرح ان ہتھیاروں کو وسیع پیمانے پر متعارف کرانے سے جغرافیائی اور سیاسی لحاظ سے بھی متعدد مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا- مثال کے طور پر اگر دنیا کی واحد سُپر پاور____امریکہ' روایتی ہتھیاروں کی بجائے غیر مہلک ہتھیاروں پر زیادہ انحصار کرنا شروع کر دے تو کیا دوسرے ممالک اس کو اس کی کمزوری پر محمول نہیں کریں گے؟ کیا غیر مہلک ہتھیاروں کے استعمال کا عروج ایڈونچرازم کا راستہ تو ہموار نہیں کرے گا یا اس کو غلطی سے یک طرفہ طور پر تخفیف اسلحہ کے مترادف تو نہیں سمجھا جائے گا؟

اس حالت میں مسابقت کی ایک نئی دوڑ بھی شروع ہو سکتی ہے' غیر مہلک

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہتھیاروں کو عام کرنے کی دوڑ جو ہر طرف جاری و ساری نظر آئے' کیا اس کے بعد جہاں ہلاکتیں کم ہوں گی' وہاں جمہوریت کا عمل دخل بھی تو کم نہیں ہو جائے گا؟ کیا ریاستیں' غیر مہلک ہتھیاروں کے استعمال سے اپنے اوپر تنقید کرنے والوں کو اندھا کرسکتی ہیں' ان کی اکھاڑ بچھاڑ میں کامیاب ہوسکتی ہیں اور ان کو شکست سے دوچار کرسکتی ہیں اگر غیر مہلک ہتھیار عام کرنے کی دوڑ شروع ہو جائے تو اس سے کس ملک کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچے گا؟ وہ کون سی اقوام ہیں جو اس طرح کے سمارٹ ہتھیار تیار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں؟ کیا یہ صورت حال جاپانی ٹیکنالوجی کے لئے ایک نیا میدان سامنے لانے کا باعث نہیں ہوگی؟ جاپانی آئین کی شق 9 آج بھی ہتھیاروں کی برآمد پر پابندی عائد کرتی ہے' لیکن ہتھیاروں کی تعریف کیا ہے؟ اور کیا غیر مہلک ہتھیار بھی اس تعریف کے دائرے میں آتے ہیں؟

جب سفارت کار ناکام ہو جائیں:

ماضی میں جب سیاستدان خاموش ہوتے تو اکثر گولے برسنا شروع ہو جاتے' امریکہ کی عالمی سٹریٹیجی کونسل کے بیان کے مطابق کل سفارتی گفت وشنید فیل ہونے کی صورت میں' حکومتیں روایتی خونخوار قسم کی جنگ میں الجھنے کی بجائے پہلے غیر مہلک ہتھیار بروئے کار لاسکتی ہیں- سینٹ مورس کو یقین ہے کہ سفارت کاری کی ناکامی اور پہلی گولی چلنے کے درمیان کا زمانہ ایسا عرصہ ہے جسے اب سے پہلے کبھی ماپنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی- اس کو غیر فضائی علاقہ تصور کیا جاتا رہا ہے- اس طرح غیر مہلک قسم کی جنگ آزادی محض جنگ کے متبادل کے طور پر یا اس کی توسیع کے طور پر سامنے نہیں آتی' بلکہ اس سے بالکل مختلف قسم کی چیز ـــــ ایسی شے جو عالمی تناظر میں انقلاب انگیز حد تک نئی چیز ہے- ایک درمیانی نوعیت کا معاملہ' رُکنے اور سانس لینے کی جگہ اور مقابلے کے ایسے میدان کی صورت میں سامنے آتی ہے' جہاں خون ریزی کے بغیر فیصلوں پر پہنچنے کی صورت پیدا ہوسکتی ہے-

لیکن اس صورت حال میں تدارک جنگ کے سلسلے میں بھی اتنے ہی سوالات ابھرتے ہیں جتنے کہ جنگ کے بارے میں' غیر مہلک ہتھیاروں کے تعلق سے جنگی نظریے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے ساتھ ساتھ کیا کوئی تدارک جنگ کی نظریہ سازی بھی کرسکتا ہے؟ یہ سوال سیاستدانوں' دفاعی ٹھیکیداروں' مزدوروں' سفارت کاروں اور دنیا بھر میں امن کی تحریکیں چلانے والوں کے لئے غور طلب ہے- اس لئے کہ اس وقت جب ہم نسلی اور قبائلی جھگڑوں' علیٰحدگی کی تحریکوں' خانہ جنگیوں اور سرکشی کی وارداتوں کے زمانے کی طرف دوڑ رہے ہیں' جو کل کی دنیا کے مظاہر ہیں- اس سوال کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے-

اب جو چیز صاف طور سے ظاہر ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ جو فوجی انقلاب' فضائی زمینی جنگ کے ساتھ شروع ہوا تھا اور جس کی رونمائی خلیج کی جنگ میں ہوئی تھی- ابھی طفولیت کے عہد میں ہے- آنے والے ماہ و سال میں فوجی بجٹوں میں کٹوتیوں کے نعروں اور امن کی ضرورتوں کے دعوؤں کے باوجود دنیا بھر میں فوجی نظریات میں' نئے چیلنجوں اور نئی ٹیکنالوجی کے جواب میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں گے- چھوٹی جنگوں کی دنیا میں' چھوٹے جنگجوؤں کے سرخرو ہونے ہی کی توقع کی جا سکتی ہے- ایسی دنیا میں جو مواصلات' موسمی رپورٹوں اور بے شمار دوسری چیزوں کے لئے فضا پر انحصار کے لئے مجبور ہے' جن کا فضا پر انحصار بڑھنا بھی یقینی امر ہے- ایک ایسی دنیا میں جس کے کارخانے کمپیوٹروں اور خود کار مشینوں کے محتاج ہیں' جنگ بھی انہی عناصر کی بشمول روبوٹائزیشن کے محتاج ہوگی' جیسے جیسے دنیا بھر کی لیبارٹریوں سے فنی کامیابیاں برآمد ہوتی رہیں گی' فوجیں بھی خلقیات سے لے کر نینو ٹیکنالوجی کو استعمال میں لانے پر مجبور ہوں گی- چاہے اس کا نتیجہ اچھا ہو یا برا- لیکن وہ بھی آج کے ڈاونچی کا خواب پورا کریں گی- اس وقت ایسی دنیا میں' جس میں شہریوں کا قتل عام بعض اوقات سیاسی لحاظ سے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے' غیر مہلک ہتھیاروں کو ترقی دینے کی کوششیں جاری رہیں گی- اعلیٰ انتخابی عمل سے گزرنے کے بعد روایتی ہتھیاروں کو غیر مہلک ہتھیاروں کے ساتھ ملانے کے بعد یہ توقع ضرور کی جا سکتی ہے کہ اس طرح بلا امتیاز ہلاکتوں میں کمی کرنا ممکن ہوسکتا ہے-

ان میں سے ترقی کے اقدام کو تیسری لہر کی ابھی تک ناپختہ جنگی فارم میں شامل کر لیا جائے گا- یاد رکھیئے کہ یہ وہ کام ہے جس کا عکس' مستقبل میں تیسری لہر کی معیشت اور تہذیب میں صاف نظر آ رہا ہے' مگر یہ سوچنا بالکل غلط ہوگا کہ کل کی غالب جنگی قسم کا تعین سٹلائٹ' روبوٹ یا غیر مہلک ہتھیاروں سے ہوگا- کیونکہ مشترکہ جُزو جو ان سب اجزاء کو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مربوط کرتا ہے' اسلحہ نہیں ہے- فوجی ٹینک یا طیارے یا میزائل' نہ ہی سٹلائٹ اور ہتھیار یا لیزر رائفلیں' ان میں جو مشترک چیز ہے' وہ غیر مرئی ہے- یہ وہی ذریعہ ہے جو دولت پیدا کرنے' کل کے معاشرے اور علم کو جنم دینے کے نظام کی نشان دہی کرتا ہے-

اس طرح ہمیں ترقی کی ایک واضح شکل نظر آتی ہے' جو تیسری لہر کی جنگی قسم' فضائی زمینی جنگ سے شروع ہوئی- خلیج کی جنگ سے جنگ کی نئی اقسام کا ایک ہلکا سا اشارہ ملا- آئندہ آنے والے زمانے میں یہ مزید وسعت اختیار کرے گا اور اس میں ترقی پذیر ٹیکنالوجی سے حاصل ہونے والے امکانات شامل ہوتے جائیں گے' لیکن ان سے بھی اس کی پوری ترقی کے مراحل طے نہ ہوں گے-

تیسری لہر کے دور کی جنگی قسم کے ارتقاء کا مرحلہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک اس کے مرکزی ذریعے کو سمجھا اور استعمال میں نہیں لایا جاتا-

چونکہ تیسری لہر کے زمانے کی جنگی شکل کا ارتقاء اس وقت تک نامکمل ہے' جب تک اس کے بنیادی نکات سمجھے اور نافذ نہیں کیئے جاتے- اس لئے تیسری لہر کی جنگی قسم کی ترقی کی انتہا' اس وقت تک ممکن نہیں ہوگی' جب تک ایک ایسی شے کے شعوری نقشے کے سامنے آنے میں' جسے دنیا نے ابھی دیکھا ہی نہیں ہے- کوئی رکاوٹ موجود ہے اور یہ ہے عالمانہ مسابقت پر مبنی حکمت عملی-

اس کے ساتھ ہی جنگ کا تصور ایک بالکل ہی نئی سطح کا رخ کرتا ہے-

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چوتھا حصہ

علم

علم کے سپاہی:

تیسری لہر کے زمانے کی جنگوں کی شکل جیسے جیسے صورت پذیر ہو رہی ہے' ''علم کے سپاہیوں'' کی ایک نئی نسل بھی ظاہر ہونا شروع ہو گئی ہے- باوردی اور بے وردی' دونوں قسم کے دانشور جو اس نظریے میں پختہ یقین رکھتے ہیں کہ علم کو جنگ جیتنے یا روکنے کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے' اگر ہم ان کی سرگرمیوں پر نظر ڈالیں تو ہمیں ابتدائی اور محدود فنی کاوشوں سے لے کر اس مقام تک جسے آئندہ کبھی ''علمی حکمت عملی'' کا نام دیا جائے گا' ترقی کی طرف تیز رفتاری سے اٹھتے ہوئے ان کے قدم صاف نظر آئیں گے-

پال سٹراس مان ذہین' حساس اور چیکوسلوواکیہ سے تعلق رکھنے والا' ایک انفرمیشن سائنس دان ہے- وہ ایکس روکس کارپوریشن میں انفرمیشن سروس کا سربراہ بھی رہ چکا ہے اور حکمت عملی کی تیاری اور منصوبہ بندی کے شعبوں میں مہارت اس کی وجہ شہرت ہے- اس حیثیت میں اس نے متعدد تحقیقاتی مقالے لکھے ہیں' جن میں شہری معیشت میں کمپیوٹروں کارکنوں کی پیداواری صلاحیتوں اور کاروباری منافع خوری کے درمیان باہمی رشتوں کی ماہیت بیان کی گئی ہے- حال ہی میں اس نے پینٹا گان میں دفاعی اطلاعات کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں- اس طرح گویا وہ امریکی فوج کا چیف انفرمیشن افسر بھی رہ چکا ہے-

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سٹراس مان' ٹیکنالوجی کے متعلق اعداد وشمار کا چلتا پھرتا بنک ہے- کمپیوٹروں کی اقسام' ان کے پروگرام' نیٹ ورکس' مواصلاتی ریکارڈ اور اس نوع کی بیشتر معلومات اس کو ازبر ہیں- لیکن ایک روایتی فنی ماہر ہونے سے بڑھ کر اس نے انفرمیشن کے اقتصادی پہلوؤں پر زیادہ غور وخوض کیا- اس کے علاوہ وہ اپنے کام کو ایک انوکھی اور تاریخی تیز رفتاری سے بھی آشنا کرتا ہے- ایکس روکس سے وابستگی کے زمانے میں شوقیہ طور پر اس نے اور اس کی بیوی مونا نے مل کر' مواصلات کی تاریخ سے متعلق ایک نہایت خوبصورت عجائب گھر تعمیر کیا تھا- (جس میں تحریر کی ایجاد سے لے کر کمپیوٹر تک پہنچنے کی پوری نشانیاں موجود تھیں-) اس کی ذاتی زندگی بھی' جنگ سے متعلق اس کے نظریات پر اثر انداز ہوئی- دوسری جنگ عظیم کے دوران ایک چھوٹے لڑکے کی حیثیت میں اس نے چیکوسلوواکیہ کے گوریلا کمانڈو گروپ میں شامل ہو کر نازیوں کے خلاف سرگرمیوں میں حصہ لیا تھا- سٹراس مان کہتا ہے:

''جنگ آزمائی کی تاریخ' عقیدے اور نظریے کی تاریخ ہے- ساحلوں تک جانے کا' ہمارا اپنا ایک نظریہ ہے- بمباری کے جواز میں بھی ہمارے پاس ایک نظریہ موجود ہے- زمینی فضائی جنگ کا نظریہ بھی حقیقت کا روپ دھار چکا ہے' لیکن جو کچھ ہمارے پاس موجود نہیں ہے وہ ہے انفرمیشن یا معلومات سے متعلق ''نظریہ'' مگر یہ زیادہ دیر غائب نہیں رہے گا- فروری 1933ء میں امریکی فوج کی اکیڈیمی کے شعبے ''ویسٹ پوائنٹ'' نے سٹراس مان کو انفرمیشن مینجمنٹ کا وزیٹنگ پروفیسر مقرر کیا- اس کے ساتھ ہی واشنگٹن میں واقع فورٹ فیئر کی قومی دفاعی یونیورسٹی نے جنگ کے متعلق انفرمیشن کا مضمون اپنے نصاب میں شامل کرنے کا اعلان کیا-

دفاعی یونیورسٹی اور ویسٹ پوائنٹ' اس میدان میں تنہا نہیں ہیں- امریکی وزیر دفاع کے دفتر میں ''صحیح اندازے'' کے نام سے ایک یونٹ قائم ہے' جس کا بنیادی کام مخالف فوج کی قوت کا اضافی طور پر اندازہ لگانا ہے- اس یونٹ نے جو اینڈی مارشل کی سربراہی میں کام کر رہا تھا' اطلاعاتی جنگ آزمائی میں جسے ''انفوڈاکٹرن'' بھی کہا جا سکتا ہے- زبردست دلچسپی کا اظہار کیا- پینٹا گان سے باہر ٹی اے ایس سی یعنی تجزیاتی کارپوریشن کے نام سے ایک علیٰحدہ نجی تھنک ٹینک قائم کیا گیا جو جنگ اور انفرمیشن کے موضوع پر تحقیقات میں مصروف ہے- خلیج کی جنگ سے حاصل ہونے والے نتائج کی روشنی میں' دوسرے ملکوں کی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

افواج بھی انفرمیشن کے نظریے پر سوچ بچار کر رہی ہیں' یہ غور وفکر اس شعبے میں امریکہ کی برتری کے مقابلے کی وجہ ہی سے کیا جا رہا ہے۔

اس نظریے پر اب تک ہونے والی بحث میں زیادہ تر توجہ الیکٹرانک دور کی جنگوں کی تفصیلات کی روشنی پر بھی دی جا رہی ہے۔ یعنی حریف کے ریڈار کی تباہی' اس کے کمپیوٹروں کو وائرس کے ذریعے خراب کرنا' اس کی کمان اور خفیہ اطلاعات کے مراکز کو میزائلوں کے ذریعے تباہ کرنا اور جھوٹے سگنلوں کے ذریعے اس کے ساز وسامان کی نقل وحرکت کے عمل کو چکمہ دے کر غلط راستوں پر ڈالنا وغیرہ۔ لیکن سٹراس مان' مارشل اور دوسرے فوجی دانشور اس سے بہت آگے کی بات سوچ رہے ہیں' اور ان کے سامنے اعلیٰ سطح کی وسیع تر حکمت عملی کا میدان موجود ہے۔

پینٹا گون سے وابستگی کے دنوں میں انڈریوز سٹراس مان کا ''باس'' تھا۔ انڈریوز نے سی^3 I (کمان' کنٹرول' کمیونیکیشن اور انٹیلی جنس) کے شعبے میں نائب وزیر دفاع کی حیثیت میں بھی خدمات انجام دی تھیں' اور اس حیثیت میں پرانے اور نئے زمانوں کی ضرورتوں کے درمیان فرق واضح کرتے ہوئے انفرمیشن کو ''سٹریٹیجک اثاثے'' کا نام دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ محض میدان جنگ میں خفیہ سرگرمیوں یا دشمن کے ریڈار یا ٹیلی فون نیٹ ورک پر جنگی حکمت عملی سے حملہ کرنے کا معاملہ ہی نہیں ہے' بلکہ اسے ایک ایسے طاقتور ہتھیار کے طور پر استعمال میں لانے کا مسئلہ ہے جو مخالف کو اعلیٰ سطحی فیصلے تبدیل کرنے پر مجبور کر دے۔ حال ہی میں اینڈرویز نے ایسی ''علمی جنگ آزمائی'' کی بات بھی کی ہے' جس میں ہر فریق دشمن کی سرگرمیوں کو خفیہ اطلاعات اور معلومات کے بہاؤ کی بنیاد پر تبدیل کرنے کی کوشش کرے گا۔

اس بات کا زیادہ رسمی اظہار لفاظی سے پُر ایک دوسری دستاویز سے بھی کیا جا سکتا ہے' جو امریکہ کے جائنٹ چیف آف سٹاف کی طرف سے 6 مئی 1993ء کو جاری کی گئی۔ یہ ''میمورنڈم' آف پالیسی نمبر 30'' کمان اور کنٹرول کو ایسے سسٹم کا نام دیتا ہے جس کی رو سے مجاز کمانڈر' اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے ہدایات دیتے ہیں۔

یہ دستاویز کمان اور کنٹرول کی قسم کی جنگ کی تعریف یوں کرتی ہے کہ اس میں فوجی کارروائیوں کے تحفظ کی ایک صورت دیکھنے میں آتی ہے...... یہ فوجی فریب دہی' جعلسازی'

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نفسیاتی کارروائیوں' الیکٹرانک جنگ آزمائیوں اور جسمانی تباہ کاریوں کا مجموعہ ہوتی ہے' جس کی پشت پر خفیہ جاسوسی معلومات کا ذخیرہ ہوتا ہے' اور یہ متاثر کرنے' دوسروں کو کمتر قرار دیتے اور مخالفوں کی کمان کنٹرول صلاحیتوں کو ختم کرنے' جبکہ حلیفوں کی کمان کنٹرول کرنے' ایسے ہی اقدامات کے خلاف تحفظ کرنے میں- معلومات کی فراہمی کا فریضہ انجام دیتی ہے-'' اس دستاویزی رپورٹ کا دعویٰ ہے کہ اس پر اگر درست طور سے عمل کیا جائے تو یہ کمانڈر کو روایتی تصادم کے آغاز سے قبل ہی حریف پر کاری ضرب لگانے کا موقعہ فراہم کرے گی-

یہ میمورنڈم' انفرمیشن جنگ آزمائی کے سرکاری تخمینوں میں توسیع کا ذریعہ فراہم کرتا ہے اور وہ یوں کہ اس کا زیادہ زور خفیہ جاسوسی اطلاعات پر ہے- نیز یہ ایسی نفسیاتی کارروائیوں کو بھی اپنی سرگرمیوں کا حصہ بنانے پر زور دیتا ہے' جو جذباتی مقاصد' داخلی توجیہات اور بالآخر دوسروں کے رویوں کو متاثر کرنے پر زور دیتا ہو-

پینٹا گان کی پالیسی پر مبنی' سرکاری دستاویز ہونے کی وجہ سے یہ تحریر' ضرورتاً زبان کے حفاظتی باڑھ کے حصار میں ہے اور یہ قانونی موشگافیوں اور خصوصی ہدایات اور فرائض کی نشاندہی کرتی نظر آتی ہے- لیکن یہ بات بہرحال طے ہے کہ دفاعی برادری میں جاری علمی جنگ آزمائی کی بحث کا دائرہ ان مسودوں سے کہیں آگے ہے- یوں اس موضوع پر سانتا مونیکا' کیلے خورنیا کے اینڈ کارپوریشن کے دو عالموں ڈیوڈ رون فیلڈ اور جان اوکوئیلا کی تحقیقات کہیں وسیع نظریاتی بنیاد کی فراہمی کا اہتمام کرتی ہے- اپنی ابتدائی تحقیقات جسے وہ ''ریشے کی جنگ'' کا نام دیتے ہیں' وہ وسیع تر سٹرٹیجک مسائل کو زیر بحث لاتے ہیں- داڑھی منڈا اور گفتگو میں حد درجہ نرم رو' آر کوئیلا خلیج کی جنگ کے پورے عرصے میں' جنرل شواز کوپ کی مرکزی کمان کا مشیر رہ چکا ہے- باریش روون فیلڈ' کچھ زیادہ ہی نرم رو قسم کا سماجی سائنس دان ہے' جس نے کمپیوٹر انقلاب کے سیاسی اور فوجی اثرات کا بطور خاص مطالعہ کیا ہے-

ریشے کی جنگ یا فائبر وار ان دونوں کے نزدیک یہ ہے کہ اس میں دشمن کے بارے میں سب کچھ جاننے کی کوشش کی جائے' جبکہ اپنے متعلق اسے کچھ معلوم نہ ہونے دیا جائے- اس کا مطلب معلومات اور علم کے توازن کو اپنے حق میں کرنا ہے- خاص طور پر ایسے حالات

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں جب فوجی توازن اپنے حق میں نہ ہو' بالکل اس طرح جس طرح شہری معیشت میں' اس کا مطلب علم کا استعمال ہے' تا کہ محنت اور سرمائے کے کم سے کم استعمال سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔

اصطلاحات کی بک بک' انفریمیشن کا نظریہ' ریشے کی جنگ' کنٹرول کمان اور ایسے ہی بہت سے دوسرے معاملات سے' جنہیں ہم یہیں چھوڑتے ہیں' ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بحث ابھی ابتدائی سٹیج سے آگے نہیں بڑھی' اس سمت میں کسی نے ابھی تک صحیح قدم نہیں بڑھایا جو ترقی کی آخری منزل تک لے جاتی ہے۔ یعنی ''علمی حکمت عملی'' کے فوجی تصور کو واضح اور منظّم شکل دینے کی کوشش۔

کچھ چیزیں بہرحال بڑی واضح ہیں' کسی بھی فوج کے لئے' جس طرح کسی کمپنی یا کارپوریشن کے لئے۔علم کی حد تک کم از کم چار کلیدی اقدامات ضروری ہیں۔ اسے معلومات کے حصول' علم کے تجزیئے' تقسیم اور تحفظ پر توجہ مرکوز کرنا ہوگی' جبکہ دشمن تک ان کی رسائی مشکل اور حلیفوں تک انہیں پہنچانا ضروری ہوگا۔ اگر ہم ان چاروں اقدامات کا جائزہ تیار کر لیں اور ان کے اجزاء کو الگ الگ کر سکیں تو پھر ہم یقیناً علمی حکمت عملی کا ایک مکمل فریم ورک تیار کر لیں گے۔ جو اگر سب نہیں تو آنے والے کل کی فوجی فتوحات کی اکثریت کی کنجی ثابت ہوگا۔

وادی سلی کون کا راز:

کسی چیز کے حصول کا معاملہ ____ علم پیدا کرنے اور خریدنے کی فوجی مجبوری' غور طلب بات ہے۔

دوسروں کی طرح فوج میں معلومات' متعدد اور مختلف طریقوں سے حاصل کی جاتی ہے۔ میڈیا سے' تحقیقاتی اور ترقیاتی اداروں سے خفیہ جاسوسی ذرائع سے' تہذیبی سرگرمیوں اور دیگر ذرائع سے۔

ان کے حصول کی منظّم حکمت عملی ترتیب دینے' ان کی فہرست تیار کرنے اور یہ تعین کرنے پر توجہ دینا لازم ہوگا کہ ان میں سے کس کی کارکردگی کو بہتر بنانا ضروری ہے۔

مثال کے طور پر امریکہ کو جنگی معاملات کی حد تک ٹیکنالوجی کے شعبے میں واضح برتری

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حاصل ہے جو اچھے طریقے اختیار کرنے اور اس حقیقت کی مرہون منت ہے کہ امریکی محکمہ دفاع یہ برتری قائم رکھنے یا اس کے ٹھیکے پر دینے کے لئے دفاع کے شعبے آر اینڈ ڈی پر سالانہ چالیس ارب ڈالر خرچ کرتا ہے۔

دوسری لہر کے زمانے میں امریکہ میں فوجی ٹیکنالوجی نے روشنی کی رفتار سے ترقی کی اور شہری اقتصادیات میں نئی نئی اختراعات کے ڈھیر لگا دیئے۔ آج اسے شاید اس سے الٹ کردار ادا کرنا پڑے' کیونکہ تیسری لہر کے دور کی فنی کرامات' معیشت کے شعبے میں تیزی سے نمایاں ہو رہی ہیں اور یہاں سے دفاعی صنعتوں کا رخ اختیار کر رہی ہیں۔ یہ صورت حال آر اینڈ ڈی کی ترجیحات کے تعین کے لئے نئے سرے سے جائزہ لینے اور فوجی اور شہری سائنس اور ٹیکنالوجی کے درمیان رشتوں کے ڈھانچوں میں تبدیلی کی ضرورت پر زور دیتی ہے۔ قیمتی معلومات کے حصول کا ایک متبادل راستہ' بہرحال جاسوسی ذرائع اور خفیہ سرگرمیاں ہیں۔ علم کی بنیاد پر لڑی جانے والی جنگوں کے لئے خفیہ جاسوسی معلومات غالباً مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس شعبے میں اتنا بڑا اور ایسا زبردست انقلاب آ رہا ہے کہ اس پر یہاں موجود گنجائش کے مقابلے میں کہیں زیادہ تفصیل سے بات چیت کرنے کی ضرورت ہے۔ (باب 17 میں دیکھئے جاسوس کا مستقبل)

آخر میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ معلومات کے حصول میں ایسی چیزیں بھی آ جاتی ہیں جیسے کہ ذہین لوگوں کے حصول کی منظم کوششیں' دوسری جنگ عظیم کے دوران میں' سائنسی دماغی قوت کے حصول کے لئے زبردست مقابلہ جاری رہا۔ نازیوں نے نسلی امتیازات کی بنیاد پر' بعض بہترین دماغوں کو خود ہی ملک سے نکال کر اپنی فوجی صلاحیتوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا' ان میں سے اکثر جو یہودی النسل تھے' یورپ آ گئے اور اتحادیوں نے انہیں مین ہٹن میں تحقیقاتی کام پر لگا دیا۔ پہلا ایٹم بم انہوں نے ہی تیار کیا۔ دوسرے کچھ جلاوطن جرمن۔ سائنس دانوں نے دیگر شعبوں میں مغربی حکمت عملیوں کے مطالعہ سے لے کر پولیٹیکل سائنس اور نفسیاتی تجزیوں تک کے شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اتحادیوں نے ایک موقعہ پر جرمنی کے ایٹمی سائنس دانوں کے اغواء کی کوشش بھی کی تاکہ ہٹلر کو اپنا ایٹم بم بنانے کی صلاحیت سے محروم کیا جا سکے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جوں جوں کرۂ ارض پر انفرمیشن ٹیکنالوجی اور حصول معلومات کی ضرورت بڑھتی جائے گی' ذہین لوگوں کے حصول کی کارروائیاں بڑھتی اور ان کے مثبت اور منفی اثرات ظاہر ہوتے رہیں گے- ٹام پیٹرز نامی جیسے معروف انتظامی نظریہ ساز کا بیان ہے کہ ''وادی سلی کون (کیلے فورنیا' امریکہ میں کمپیوٹر کی صنعت کا مرکزی علاقہ) کا عظیم راز' تیسری دنیا سے انسانی سرمائے کی چوری ہے- اب شاید اس وادی کے اصل باشندے یہاں سے بھاگ رہے ہیں' اور ہندوستان اور تائیوانی جو سافٹ ویئر میں مہارت رکھتے ہیں' ان کی جگہ لے رہے ہیں-

معلوم ہوتا ہے کہ علمی حکمت عملی پر مبنی فوج تشکیل دینے والے' ایسی طویل المدت پالیسیاں تشکیل دینے کی کوشش کریں گے' جن کی مدد سے وہ' نشان زدہ ممالک سے خصوصی قسم کی دماغی صلاحیت کو اپنی طرف کھینچ کر کام میں لانے کا بندوبست کریں گے- متبادل کے طور پر علمی حکمت عملی کے بل بوتے پر ایسے منصوبے بھی تیار کیئے جائیں گے جن پر عمل کرنے سے کلیدی سائنس دان یا انجینئر کی خدمات کسی حریف کو میسر نہ آ سکیں- اس ضمن میں روسی سائنسدانوں کے ایران یا شمالی کوریا منتقل ہونے کی کوشش میں رکاوٹ ڈالنے کے واقعات اسی پالیسی کا نتیجہ ہیں اور یہ امر یقینی ہے کہ یہ کھیل آئندہ بھی کھیلا جاتا رہے گا-

یہ بھی طے ہے کہ علمی حکمت عملیوں کے ماہر ''علم کے حصول'' پر کل اتنی ہی توجہ دیں گے جتنی آج اسلحے کے حصول پر دی جا رہی ہے-

سافٹ ویئر سپاہی:

ترقی یافتہ کمپنیوں کی طرح ترقی یافتہ افواج کو بھی معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کرنے اور اسے ''پراسس'' کرنے کی ضرورت پڑے گی- جیسا کہ ہم جانتے ہیں' اس مقصد کے حصول کے لئے انفرمیشن ٹیکنالوجی یا آئی ٹی میں زبردست سرمایہ کاری کی ضرورت ہوگی-

فوجی انفرمیشن ٹیکنالوجی میں ہر سائز اور ہر قسم کے کمپیوٹروں' ان کی اقسام' تقسیم' صلاحیت' استعمال کرنے کی استعداد اور ان میں موجود لچک بشمول ریڈار' فضائی دماغی نظام' مصنوعی سیاروں اور مواصلاتی نیٹ ورکس سے ان کے رابطوں ہی سے ان کی کارکردگی اور جن شعبوں سے ان کا تعلق ہے' ان میں انہیں امتیازی حیثیت ملنے کے مواقع سامنے آئیں گے-

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

امریکہ میں اس میدان میں بہت سا کام اینڈریوز پال سٹراس مان اور پینٹا گان میں ان کے نائب دی چارلس اے ہاکنسن جونیئر اور سنتھا کینڈل نے کیا' جنھوں نے اس سسٹم کو حقیقت پسندانہ اور بہتر قسم کی شکل دینے میں نمایاں کام کیا- ہائنس جو انجینئر ہے' فوجی جاسوسی کے شعبے سے اس مقام تک پہنچا ہے- کینڈل جو ڈیفنس انفرمیشن سسٹم کی ڈپٹی اسسٹنٹ سیکرٹری ہے' حساب اور فوجی کارروائیوں میں تحقیقاتی کام انجام دینے میں مہارت رکھتی ہے-محکمہ دفاع میں اس نے1970ء میں شمولیت اختیار کی تھی-

اصل میں حقیقی اسلحے یا اوزاروں کے مقابلے میں' جن کی دیکھ بھال ہاکنسن اور کینڈل کر رہے ہیں' کہیں زیادہ اہم اس ساز و سامان کی مسلسل بدلتی ہوئی فہرست ہے جس پر اس کا انحصار ہے-

خلیج کی جنگ میں ٹیلی ویژن کیمرے ڈرامائی مناظر دکھانے کے لئے ٹوٹے پڑ رہے تھے اور ان کی آنکھیں ایف 14 ' بحری جہازوں کے عرشوں سے اڑانے والے ٹام کیٹ لڑاکا طیاروں' صحرا کی فضاؤں میں محو پرواز اپاچی ہیلی کاپٹروں' صحرائی ریت کو روندتے ہوئے ایم آئی اے ٹینکوں اور ایسے اہداف کی نشاندہی کرتی ہوئی' ٹامی ہاک میزائلوں پر جمی ہوئی تھیں- لوہے کے یہ ٹکڑے راتوں رات ''سٹار'' بن گئے تھے' لیکن اصل سٹار یقیناً کمپیوٹر کے نہ دکھائی دینے والے وہ پروگرام تھے جنہیں پراسس کرنے اور جن کا تجزیہ کرنے کے بعد ان میں موجود مواد کو بانٹا جا رہا تھا- اگرچہ اس کو تیار کرنے اور اس کی حفاظت کرنے والا کوئی شخص بھی کیمرے کے سامنے نہیں آیا- یہ امریکہ کے کمپیوٹر پروگرام تیار کرنے والے سپاہی تھے اور ان کی اکثریت کا تعلق شہری آبادی سے تھا-

کمپیوٹر پروگرامنگ کی وجہ سے دنیا کا فوجی توازن تبدیل ہو رہا ہے- آج کے زمانے کا اسلحہ ''پلیٹ فارم'' نام کی کسی شے پر رکھ کر وہیں سے استعمال میں لایا جا سکتا ہے اور یہ شے یعنی ''پلیٹ فارم'' کوئی بھی چیز ہوسکتی ہے- اس میں میزائل' طیارے' بحری جہاز اور ٹرک تک سبھی کچھ شامل ہے اور فوج اب جو کچھ سیکھ رہی ہے وہ یہ ہے کہ اگر ہتھیاروں کو بجائے خود سمارٹ اور کمپیوٹر پروگراموں سے مزین کر دیا جائے تو غریب چھوٹی اقوام کو بھی ایسے سستے اور فنی لحاظ سے کمتر درجے کے ''پلیٹ فارم'' میسر آ جائیں گے' جہاں سے اعلیٰ فنی صلاحیتوں کی مدد سے سمارٹ ہتھیاروں کو داغا جا سکے گا- ''سٹوپڈ'' یا کم عقل بموں کی ذہانت میں' ان

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی تیاری کے وقت ایسے اجزاء کا پہلے ہی سے اضافہ کیا جا سکتا ہے- جن کی بنیاد کمپیوٹر پروگراموں پر رکھی گئی ہو-''

دوسری لہر کے زمانے میں' فوجی جاسوس' حریفوں کے ''مشین ٹول'' ایسے کارخانوں پر زیادہ توجہ دیتے تھے' جن میں اسلحہ تیار ہوتا تھا- آج جس ''مشین ٹول'' کی سب سے زیادہ اہمیت ہے وہ سافٹ ویئر تیار کرنے والے کمپیوٹروں کی تیاری کے کارخانے ہیں' کیونکہ موجود مواد کو پراسیس کر کے سب عملی اطلاعات اور علم کی سرحدوں تک پہنچانے کا یہی واحد ذریعہ ہیں' اسی لئے فوجی کمپیوٹر پروگرام تیار کرنے والے مراکز میں لچک اور تحفظ کی ضرورت انتہائی اہم ہے-

ایسی پالیسیاں جو عام طور سے اطلاعاتی ٹیکنالوجی' بالخصوص کمپیوٹر پروگراموں کی تیاری میں رہنمائی اور ترقی کے لئے اختیار کی جاتی ہیں' علمی حکمت عملی کا ایک قطعی جزو ہیں-

کیا چچا سام سن رہے ہیں؟

علم اگر مناسب طریقے سے بھی حاصل اور پراسیس کیا جا سکے تب بھی اگر یہ غلط ہاتھوں میں پڑ جائے یا غلط دماغوں میں جمع ہو جائے اور وہ بھی غلط وقت پر تو اس کو بے وقعت قرار دینا غلط نہ ہوگا- اس طرح فوج کو بھی اس کی تقسیم کے مختلف اور متعدد طریقوں کی ضرورت پیش آتی ہے-

لیفٹیننٹ جنرل جیمز ایس کیٹس کا کہنا ہے کہ خلیج کی جنگ کے 90دنوں میں سروسز یا ''خدمات'' نے برقی مواصلات کو مربوط کرنے کے سلسلے میں جو کرشمہ کر دکھایا' وہ یورپ کے گزشتہ 40برسوں کی ہماری کارکردگی کے مقابلے میں کہیں بہتر ہے- نیٹ ورکس میں بالخصوص ایسے نیٹ ورکس جن کا تعلق اعلیٰ سطح کے سٹرٹیجک معاملات سے ہوتا ہے' باہمی رابطہ انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے-

اس وقت بہت سے اہم اور پرعزم منصوبے زیر غور ہیں' مثال کے طور پر فوج کے ایک واحد عالمی رابطے کا نیٹ ورک قایم کرنے کا پروگرام بن رہا ہے' جس کی حدیں امریکی افواج کی حدوں سے آگے ہوں- یہ ایسا مثالی اور معلوماتی سسٹم ہوگا جس کو متعدد اقوام کی فوجیں بیک وقت استعمال کر سکیں گی- بالکل اسی طرح' جس طرح ان دنوں زیادہ سے زیادہ کاروبار

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یکجا کر کے ان کی سرگرمیوں کو عالمی سطح تک توسیع دینے کی کوشش کنسورشیم بنا کر یا کمپیوٹر سسٹم اور مواصلات کے نیٹ ورکس کو اتحادیوں کے ساتھ جوڑ کر' تجارتی میدان میں کوششیں جاری ہیں- یہی کام فوجیں بھی کہیں زیادہ بڑے پیمانے پر کر رہی ہیں- ایسے اتحادوں کا کاروباری اور فوجی ـــــ دونوں شعبوں میں سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ان میں باہمی ربط پیدا کرنا انتہائی دشوار مرحلہ ہوتا ہے-

حتیٰ کہ نیٹو کی رکن' یورپی اقوام' تعاون کی چار دہائیاں گزارنے کے بعد بھی جنگی انتظامیہ کے مواصلاتی سسٹم کے تحت' ایک دوسرے کو اہم معلومات بہم پہنچانے میں اس لئے ناکام رہتی ہیں کہ ان میں دوریاں ابھی باقی ہیں- نیٹو نے اگرچہ اس بارے میں مشترکہ معیار مقرر کر رکھے ہیں تاہم نہ تو برطانیہ کے ٹارمین سسٹم اور نہ ہی فرانس کے ریٹا ریڈیو سسٹم کو ابھی تک اس معیار تک پہنچنے کی توفیق ہوئی ہے- دوسرے ملکوں میں صورت حال اس سے بھی بری ہے- کویت پر حملے کے بعد فوج کو سعودی عرب' قطر عمان' بحرین اور عرب امارات کے امریکہ کے ساتھ فوجی مواصلاتی رابطوں کے قیام میں کئی ہفتے لگے-

رابطوں کے مجوزہ نئے نیٹ ورکس کے قیام کا مقصد اتحادیوں کے ساتھ مل کر مشترکہ اقدامات کو ماضی کے مقابلے میں زیادہ آسان بنانا ہے- امریکی فوج کی مواصلاتی الیکٹرانکس کمان واقع مون ساؤتھ' نیو جرسی کے ایک ڈپٹی ڈائریکٹر میری رس کیوتیج کے بیان کے مطابق ہم ایک ایسا اصلی نظام تشکیل کر رہے ہیں جس کی مدد سے کسی بھی ملک کے پاس موجود تمام ضروری ساز و سامان ہماری نظر میں رہے گا-

مواصلاتی نیٹ ورکس سے متعلق اس کی سٹرٹیجک اہمیت کے بارے میں زبان سے کچھ نہ بھی کہا جائے تو بھی اس کو پیش نظر ضرور رکھا جاتا ہے- ایک مشترکہ مواصلاتی نظام کی تیاری کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس میں امریکہ کا یہ نکتہ نظر پوری طرح کارفرما ہے کہ مستقبل میں وہ تنہا عالمی ''تھانیدار'' کی حیثیت میں لڑائیوں میں حصہ لینے کی بجائے اتحادیوں کے ساتھ مل کر میدان جنگ میں اترنے کی پالیسی پر کاربند ہوگا-

یہ مجوزہ نظام ایسے مستقبل کا نقشہ سامنے لاتا ہے جو عارضی اور وقتی قسم کے اتحاد کا آئینہ دار ہوگا- سرد جنگ کے خاتمے کے بعد پیدا ہونے والی ہر لحظہ بدلتی ہوئی صورت حال کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تقاضوں کے عین مطابق اس کا انحصار عارضی انتظامات پر ہوگا- یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ اسے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کا متبادل بھی قرار دیا جا سکتا ہے-

مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس نظام کو بنیادی طور پر امریکہ ہی آخری شکل دے کر سامنے لاتا ہے تو کیا اس کے لئے یہ ممکن ہوگا کہ وہ اس نیٹ ورک سے ظاہر ہونے والے تمام پیغامات کو پڑھنے کی صلاحیت بھی پیدا کر سکے- (کہا جاتا ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے' کیونکہ انفرادی طور پر قومیں اس سے استفادے کے لئے اپنے اپنے ''کوڈ'' مقرر کر سکتی ہیں- تاہم اس بارے میں شبہات پوری طرح دور نہیں ہوئے-)

لندن میں مقیم ایک اطلاعاتی سائنس دان سٹو ائرٹ سلیڈ جو موز کاسٹ انٹرنیشنل کا تجزیہ نگار ہے' کمان' کنٹرول اور کمیونیکیشن کے نئے سسٹم کے بارے میں زیادہ گہرے سیاسی اثرات کی طرف اشارہ کرتا ہے' وہ کہتا ہے: ''دنیا کی ہر فوج' تہذیبی اور سیاسی (ٹیکنالوجی کی بات چھوڑیئے) لحاظ سے ایسے نظام سے کام لینے کی استعداد نہیں رکھتی' ان سبھی نظاموں کا انحصار صرف ایک چیز پر ہے اور وہ ہے اطلاعات کے تبادلے کی صلاحیت' مواد کے ادلے بدلے کی ہمت اور نیٹ ورک کے ہر طرف اطلاعات کی فراہمی کا انتظام' تاکہ لوگ اپنی حربی خوبیوں کو یکجا کر کے اس مواد کو یکساں طریقے سے بروئے کار لاسکیں- جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ سیاسی طور پر درست ہتھیاروں کا سسٹم ہے اور بس

''جو معاشرے مواصلات کے آزادانہ بہاؤ' نظریات اور مواد کو منجمد کر دیتے ہیں' وہ ایسے کسی سسٹم سے ہرگز استفادہ نہیں کریں گے......مثلاً عراق کا نظام ایک درخت کی حیثیت رکھتا ہے- اس پر سب سے اوپر صدام حسین بیٹھا ہے- اس سسٹم کو اگر آپ کسی مقام سے بھی توڑیں' یہ تباہ کن ثابت ہوگا- بالخصوص اگر ڈویژن کمانڈر کو جسے درخت کی بالائی شاخوں سے علیٰحدہ کر لیا گیا ہو اور وہ یہ جانتا ہو کہ اس کارنامے کے لئے اس کا انعام 357 (گولی) ہے جو اس کی گردن کے عقب سے داخل ہوگی-

ترقی یافتہ نیٹ ورکس ہر سطح پر ابلاغ کی اجازت دیتے ہیں- اس کا مطلب یہ ہوا کہ کپتان سے کپتان اور کرنل دوسرے کرنل سے اعلیٰ سطحی اجازت کے بغیر بات کر سکتے ہیں-

لیکن یہی وہ صورت حال ہے جو آمرانہ اختیارات رکھنے والے کسی صدر یا وزیراعظم کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتی-

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سلیڈ کہتا ہے: ''چین سمیت کچھ ممالک ایسے ہیں جو اس نظام کو سیاسی طور پر خطرناک تصور کریں گے' پھر مثال کے طور پر افریقہ میں بھی ایسے ممالک موجود ہیں جہاں اگر آپ بٹالین کمانڈروں کو بغیر ان کے سر پر کوئی نگہبان مقرر کئے' ایک دوسرے سے بات چیت کرنے کی اجازت دے دیں گے تو چھ ماہ کے اندر اندر ان میں سے ایک ملک کا صدر اور دوسرا وزیر دفاع بن چکا ہوگا۔''

یہی وجہ ہے کہ بقول اس کے ابھی مواصلاتی نیٹ ورک کے لئے ضروری اقدام کی موجودگی لازم ہے۔

سیکھ کر بولنا اور پھر سیکھنا:

یہ بات کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو' بہرحال یہ حقیقت ہے کہ مواصلات کو' افواج کے علم کی تقسیم کے نظام کا واحد ذریعہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ تیسری لہر کے زمانے کی فوجیں ہر سطح پر تربیت اور تعلیم پر بہت زور دیتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ علم کی تقسیم میں صحیح آدمی کو صحیح تربیت سے روشناس کرنے کے لئے' کسی موثر سسٹم کا قیام ضروری ہے۔

جس طرح کہ کاروباری دنیا میں ہے' فوج کے ہر شعبے میں بھی سیکھے ہوئے کو بھولنا اور پھر سے سیکھنے کے عمل سے گزرنا لازم ہے۔

فوج کے مختلف شعبوں کے مقتدر حلقوں میں' تربیتی اداروں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ اس کی تمام برانچوں میں ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کی تربیت میں تیز رفتاری لانے کے لئے بروئے کار لایا جا رہا ہے۔ ان میں کمپیوٹر کی بنیاد پر جعل سازی کا اہتمام بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر خلیج کی جنگ کی کلیدی اہمیت کی ایک لڑائی کی حقیقتیں' ریڈیو کے مطابق' اس میں دونوں طرز کے ٹینکوں کی نقل و حرکت کمپیوٹر میں محفوظ کر لی گئی ہے' جس سے ٹینکوں کے عملے کو ایسی ہی لڑائیاں' بناوٹی صورت حال میں از سر نو لڑنے کی مشق کرائی جا سکتی ہے۔ اس دن کے بارے میں سوچئے جب کمپیوٹروں کے ذریعے تربیت دینے کے طریقے اور ٹیکنالوجی اتنی اہمیت اختیار کر لیں گے' کہ فوجیں ان کو ایک دوسرے سے چرانے کی کوشش کرنے لگیں گی۔ تیسری لہر کے زمانے کے جرنیل' اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ جو فوج تربیت دینے کا سب سے بہتر انتظام کرتی ہے' تیزی سے سیکھنے کی استعداد رکھتی ہے اور جس

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کا علم سب سے زیادہ ہے' اسے دوسرے پر ایسی برتری حاصل ہے جو بہت سی خامیوں کی پردہ پوشی کر سکتی ہے- بلاشبہ علم ہی' دوسرے تمام ذرائع کا بہترین متبادل ہے-

اسی طرح سمجھدار اور سمارٹ جرنیل یہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ جنگیں میدان جنگ میں بھی جیتی جا سکتی ہیں- ٹیلی ویژن سکرین پر جو فوجیں اشیاء تقسیم کرتی ہیں ان میں گمراہ کن معلومات' ڈس انفرمیشن' پروپیگنڈہ' سچائی (جب اس کی تقسیم فائدہ مند ہو) اور میڈیا کا طاقتور تصور......علم اور اس کے ساتھ ہی اس کی نفی بھی-''

اکیسویں صدی میں علمی جنگ آزمائی کے میدان میں سیاسی طور پر میڈیا اور پروپیگنڈہ اس قدر دھما کہ خیز کرار ادا کرنے والے ہیں کہ ہم اس کے لئے ایک الگ باب مختص کر رہے ہیں- (''سپن'' کے عنوان سے باب 8 دیکھئے-) اس لئے میڈیا پالیسی' مواصلاتی اور تعلیمی پالیسیوں کے ساتھ باہم مل کر کسی بھی مجموعی حکمت عملی کی تقسیم کا بنیادی جزو ہوگی-

کٹا ہوا ہاتھ:

لیکن ایک چوتھے اور فائنل جزو کے بغیر' کوئی بھی حکمت عملی مکمل قرار نہیں دی جا سکتی......اور یہ جزو ہے' دشمن کے حملے کے خلاف اپنے علمی اثاثے کا تحفظ- علم کی تلوار چونکہ دوہری کاٹ کرتی ہے' یہ جارحیت کے لئے استعمال میں لائی جا سکتی ہے- یہ کسی مخالف کو اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی برباد کر سکتی ہے' لیکن یہ اس ہاتھ کو بھی کاٹ سکتی ہے جو اسے پکڑے ہوئے کنٹرول کر رہا ہے- اس وقت وہ ہاتھ جس نے بہتر طور پر اسے گرفت میں لے رکھا ہے' امریکی ہے-

یہ صاف ظاہر ہے کہ علم کے زیاں کا دنیا کی کسی قوم کو اتنا اندیشہ نہیں ہے- (جتنا کہ امریکہ کو ہے) اور دنیا کی کسی بھی قوم کے پاس کھونے کے لئے اس سے زیادہ علم کا ذخیرہ موجود ہی نہیں ہے-

اس بات پر ڈیلف کار ہنے والا 31 سالہ نیل منرو جس نے 1984ء میں جنگی مطالبات میں ماسٹر کی ڈگری بغل میں دبائے ہوئے امریکہ میں قدم رکھا تھا' بار بار اصرار کر رہا ہے' آج وہ اطلاعاتی جنگ کی سوچ رکھنے والوں میں اہم ترین باخبر ماہر کی حیثیت میں جانا پہچانا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جاتا ہے اور اس کی معلومات الیکٹرانک دور کی جنگ آزمائیوں سے لے کر پینٹا گان میں آج کی بدلتی ہوئی ہر قسم کی تبدیلیوں کا احاطہ کرتی ہیں۔

وہ ''دی کوئیک اینڈ دی ڈیڈ'' نامی کتاب کا مصنف بھی ہے جو الیکٹرانک دور کی جنگوں کے متعلق حرف آخر سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ''ڈیفنس نیوز'' نامی مجلّے کا سٹاف رائٹر بھی ہے' جس کے مدیروں کا دعویٰ ہے کہ 1315- امریکی جرنیل اور ایڈمرل اس کے قارئین میں شامل ہیں۔ دنیا کے دوسرے ملکوں کی فوجوں کے 2919اعلیٰ حکام ان کے علاوہ ہیں۔ اس رسالے کا مطالعہ دفاعی ساز و سامان تیار کرنے والی کمپنیوں کے سربراہ' سیاستدان' وزراء صاحبان اور اس کے دعوے کے مطابق بعض سربراہان مملکت بھی کرتے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ اطلاعاتی جنگ کے نظریات کے بارے میں وہ اپنی سوچ کا اظہار کرتا ہے یا پروگرامنگ اور خفیہ جاسوسی کارروائیوں کا احاطہ کرتا ہے تو اس کی رپورٹیں فوراً ہی ان اہم لوگوں کی میزوں پر پہنچ جاتی ہے جو فیصلے کرنے کے اختیارات سے لیس ہیں۔

منرو جب اطلاعاتی جنگ آزمائیوں کی بات کرتا ہے تو جوش خطابت میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اس کی زبان لڑکھڑانے لگتی ہے اور اپنی گفتگو کے دوران وہ فوجی تاریخ کے بارے میں عالمانہ حوالے بھی دیتا جاتا ہے وہ اس دانشمندانہ قوت کا مظہر دکھائی دیتا ہے جو علمی حکمت عملی کی منزل کی طرف رواں ہے لیکن ان کے ساتھ ہی منرو' ایک وارننگ بھی دیتا ہے جس کی گونج اطلاعاتی جنگ سے متعلق حلقوں میں برابر سنائی دے رہی ہے۔

اطلاعات اور علم کی برتری سے جنگیں ضرور جیتی جا سکتی ہیں لیکن یہ برتری بڑی نازک قسم کی ہے۔ منرو کہتا ہے:

''ماضی میں جب آپ کے پاس 5ہزار ٹینک ہوتے اور دشمن کی ملکیت ایک ہزار ٹینکوں تک محدود ہوتی تو آپ کو ایک کے مقابلے میں 5 کی برتری یقیناً حاصل ہوتی' مگر آج اس قسم کی برتری ایک لمحے میں یا ایک جھوٹ کے ذریعے یا آپ کی ان لوگوں کے مقابلے میں جو آپ کی برتری ختم کرنا چاہتے ہیں' نالائقی کی وجہ سے فوراً ہی ختم ہو سکتی ہے۔

اس نزاکت یا کمزوری کی وجہ یہ ہے کہ علم ایک ذریعے کے طور پر تمام دیگر ذرائع سے مختلف ہے۔ اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ فریقین اسے بیک وقت استعمال میں لا سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی تھوڑی سی مقدار بھی' غیر متناسب نتائج کا باعث ہو سکتی ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صحیح معلومات کا معمولی سا جزو مناسب استعمال سے زبردست قسم کا سٹرٹیجک اور فوجی لحاظ سے اہم فائدہ پہنچا سکتا ہے- اس طرح کسی وقت نہایت معمولی قسم کی انفارمیشن کے حصول میں ناکامی یا چھوٹی سی بے خبری زبردست تباہی پر منتج ہوسکتی ہے-

خلیج کی جنگ میں فوجی فتح کے بعد' امریکہ کی توجہ زیادہ تر ان طریقوں پر مرکوز ہے جن کے ذریعے امریکی افواج نے صدام حسین کے اطلاعات اور مواصلاتی اثاثوں کو تباہ کر کے اسے ''اندھا'' کر دیا تھا- اس وقت سے خود امریکہ کے دفاعی حلقے ایسے طریقے اختیار کئے جانے کے خطرے پر مضطرب ہیں جن پر عمل کر کے حریف' خود امریکہ کو اندھا کر سکتے ہیں-

انفو دہشت:

9 جنوری 1991ء کو بغداد پر اتحادیوں کے حملے کے دوران' امریکی بحریہ نے ٹام ہاک کروز میزائل استعمال کئے- ڈیفنس نیوز کی اطلاع کے مطابق یہ میزائل ایک نئے' غیر ایٹمی' برقی مقناطیسیت کے حامل خفیہ ہتھیار کو استعمال کرنے کے لئے کام میں لائے گئے تھے- جن کا مقصد عراق کے برقی سسٹم کو تباہ یا منتشر کرنا تھا- یہ ہتھیار کسی قسم کا جسمانی نقصان نہیں پہنچاتا' لیکن دشمن کے ریڈار' الیکٹرانک نیٹ ورکس اور کمپیوٹروں کے ضروری اجزاء کو بھون کر رکھ دیتا ہے-

6 فروری 1993ء کو مین ہٹن کے عالمی تجارتی ٹاور میں ایک بم پھٹنے سے چھ افراد ہلاک اور ایک ہزار سے زیادہ لوگ زخمی ہو گئے اور نیویارک کے تجارتی مرکز کے قریب واقع متعدد تجارتی مراکز کی سرگرمیاں معطل ہو کر رہ گئیں- ذرا سوچیئے اگر صدام حسین کا کوئی ایٹمی ماہر اس کے لئے برقی مقناطیسیت پر مبنی کوئی ایٹمی ہتھیار اسے لا کر دے دیتا اور خلیج کے تصادم کے زمانے میں کوئی ''انفو دہشت گرد'' وال سٹریٹ ڈسٹرکٹ میں اسے عالمی تجارتی ٹاور میں رکھ دیتا تو کیا حشر ہوتا- ایک خوفناک مالی بحران......بشمول بنکوں کے تبادلے کے انتظامات' سٹاک اور بانڈز کی مارکیٹیں' مصنوعات کی تجارت کا نظام' کریڈٹ کارڈوں کا نیٹ ورک' ٹیلی فون اور ڈیٹا مواد کی ترسیل' کوٹرون مشینیں اور عام تجارتی سرگرمیاں سب کچھ برباد ہو جاتا یا کم از کم اس سارے کام میں زبردست قسم کی رخنہ اندازی ہو جاتی اور پوری دنیا ایک مالی صدمے سے دوچار ہو جاتی- اس قسم کے اعلیٰ ہتھیاروں سے ایسا کام لینے کی ہمت

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

افزائی کوئی بھی نہیں کرے گا-

انٹر بیکٹ کے مواصلاتی مشیر' ون شارطو کا کہنا ہے کہ 10 کروڑ کمپیوٹروں کے ناقابل فہم طریقے سے' بہت ہی پیچیدہ طریقوں' زمینی اور فضائی رابطوں پر قائم مواصلاتی نظام...... حکومتی اور غیر سرکاری دونوں ہی آج اتنے غیر محفوظ ہیں کہ انہیں مدافعت کے ناقابل قرار دینا بھی غلط نہ ہوگا اور یہ سوچنا بھی درست ہوگا کہ اس شعبے میں ایک برقی پرل ہاربر کے وقوع پذیر ہونے کا انتظار ہے-

امریکہ کی جنرل اکاؤنٹس آفیسر کی کانگریس کو پیش کی جانے والی ایک رپورٹ میں بھی اس بارے میں سخت تشویش ظاہر کی گئی ہے- اس میں کہا گیا ہے کہ سرمایہ کی ترسیل سے متعلق ایک نیٹ ورک ''فیڈوائر'' جس نے صرف1998ء کے ایک سال میں253ٹریلین ڈالر تک سرمایہ ٹرانسفر کرنے کا فریضہ انجام دیا اب سیکورٹی نظام کی کمزوریوں کا شکار ہے اور تحفظ کے متعدد انتظامات کا ضرورت مند' پال سٹراس مان جیسا آدمی بھی جو عام طور سے جوش میں نہیں آتا اور نہ ہی سنسنی خیزی میں یقین رکھتا ہے ''انفو دہشت گرد بریگیڈ'' کے خلاف خبردار کرتا ہے-

بوز ایلن اور ہملٹن نامی ایک مشاورتی فرم نے نیویارک میں مواصلات کے بارے میں ایک تحقیقاتی مطالعے کا اہتمام کیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ بڑے بڑے سرمایہ کار ادارے مواصلاتی تحفظ کے بغیر کاروبار کر رہے ہیں- فرینک فرٹ' پیرس' ٹوکیو یا لندن میں کام آنے والے ان کے ہم عصروں کی حالت بھی ان سے بہتر نہیں ہے-

فوجی نظام بھی جو اگرچہ نسبتاً زیادہ محفوظ ہیں' ناقابل رسائی ہرگز نہیں ہیں- 4دسمبر 1992ء کو پینٹاگان نے ہر خطے کے کمانڈر انچیف کو ایک خفیہ پیغام بھیجا تھا جس میں ان کو اپنی برقی تنصیبات اور کمپیوٹروں کی حفاظت پر فوری طور سے توجہ دینے کی ہدایت کی گئی تھی- یہ محض ریڈار اور ہتھیاروں کا سسٹم ہی نہیں ہے جو خطرے کی زد میں رہتا ہے' بلکہ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں' کمپیوٹروں کے ڈیٹا مراکز کے لئے بھی جن میں فوجی نقل وحرکت کے منصوبوں یا سازوسامان کی فہرستیں اور ان کے ذخیرہ کئے جانے کے مقامات کی نشان دہی کی ہوئی ہوتی ہے- تحفظ کا اہتمام لازمی ضرورت ہے- ڈاکٹر آنڈویز کے بیان کے مطابق: ''اس وقت ہماری انفرمیشن سیکیورٹی کا انتظام سخت ناقص ہے- ہماری مشتبہ سرگرمیوں کی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سیکیورٹی بھی سخت خراب ہے اور مواصلاتی سیکیورٹی کی حالت بھی ایسی ہی ہے۔ اس سخت قسم کی تشویش کی تصدیق گویا اس طرح ہوتی ہے کہ جون 1993ء میں ایک برقی راہزن' کمپیوٹروں تک خفیہ رسائی حاصل کر کے امریکی وزیر خارجہ وارن کرسٹوفر کے عملہ کی طرف سے عالمی رہنماؤں کے نام پیغامات میں دخل اندازی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ پیغامات انہیں بغداد میں عراق کے محکمہ جاسوسی کے ہیڈکوارٹرز پر میزائل کے حملوں سے آگاہ کرنے اور خبردار کرنے کے لئے بھیجے جا رہے تھے۔

سرکاری اور تجارتی اداروں کے کمپیوٹروں تک' غیر قانونی رسائی حاصل کرنے والوں کے بارے میں اخبارات میں اتنی کہانیاں چھپ چکی ہیں کہ انہیں اب یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے' لیکن غلط فہمیاں بہرحال اب بھی موجود ہیں۔ جبکہ ''ہیکروں'' (کمپیوٹروں تک غیر قانون رسائی حاصل کرنے والے) کو کمپیوٹروں کے نظام میں دخیل ہو کر' ان کے سسٹم کو تباہ کرنے کا الزام دیا جاتا ہے۔ حقیقتاً ان کی اکثریت اتنی محتاط ہوتی ہے کہ وہ ان میں موجود امواد کو نقصان نہیں پہنچاتے' نہ ہی کوئی غیر قانونی حرکت کرتے ہیں۔ جو لوگ واقعی اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں ''ہیکر'' انہیں ''کریکرز'' کا نام دیتے ہیں۔

اسے کسی بھی اصطلاح کا نام دے دیں' بہرحال اب حیدر آباد کے کسی جنونی ہندو یا مدارس کے کسی جنونی مسلمان یا ڈینوو کے کسی خبطی فرد کے لئے عوام' ممالک اور ذرا سی کوشش کے ساتھ دس ہزار میل کے فاصلے پر بیٹھیں ہوئی افواج کو زبردست قسم کے نقصان سے دوچار کرنا ممکن ہو چکا ہے۔ نیشنل ریسرچ کونسل کی رپورٹ ''کمپیوٹر کا بحران'' میں اس حقیقت پر تشویش کا اظہار کیا جا چکا ہے۔ ''بورڈ پر کنٹرول کی وجہ سے کل کا دہشت پسند' بموں سے ہونے والے نقصان کے مقابلے میں کہیں زیادہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

کمپیوٹر وائرس کے بارے میں' جو اس میں موجود مواد کو تباہ اور رازوں اور سرمائے کا صفایا کر سکتا ہے' بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کے ذریعے کمپیوٹروں میں غلط پیغامات کا اندراج' ریکارڈ کی تبدیلی' معینہ معلومات کی تلاش کر کے انہیں دشمنوں تک پہنچانا ممکن ہو چکا ہے اور اگر اس کی رسائی صحیح نیٹ ورک تک ہو جائے تو اس ذریعے سے فوجوں کو مسلح یا غیر مسلح کرنے یا ہتھیاروں کے اہداف میں تبدیلی لانا بھی غیر ممکن نہیں رہا ہے۔ ابتدائی وائرس پبلک نیٹ ورکس تک محدود تھے اور انہیں بلا امتیاز مشین سے مشین تک پھیلا دیا جاتا تھا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کمپیوٹروں پر نگاہ رکھنے والے اب نام نہاد ''کروزی وائرس'' کے بارے میں زیادہ فکر مند ہیں- یہ ایک سمارٹ ہتھیار ہے جسے خاص طور سے نشانہ بنایا جاتا ہے- اس کا مقصد بلاامتیاز نقصان پہنچانا نہیں ہے بلکہ یہ خصوصی ''پاس ورڈز'' یا اہم انفرمیشن کے حصول کے لئے کام میں لایا جاتا ہے یا اس سے کسی سخت ڈسک یعنی معلومات ریکارڈز کے ذخیرے کی تباہی کا کام لیا جاتا ہے- یہ ایک ایسے پروگرام کی حیثیت رکھتا ہے کہ اسے ایک باشعور کروز میزائل کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے-

ایک دفعہ اسے جب بہت سے کمپیوٹروں کے نیٹ ورکس سے متعارف کروایا جاتا ہے تو یہ وائرس بڑے معصومانہ انداز میں اِدھر اُدھر گھومتا رہتا ہے- اس وقت تک کے لئے جب تک اس کا استعمال کرنے والا سامنے نہیں آتا اور بالآخر وہ آ کر اس کمپیوٹر کی نشاندہی کرتا ہے جو اصل ہدف ہے- اس کے بعد یہ وائرس ادھر کا رخ کرتا ہے اور ایک دفعہ اس کے اندر تک رسائی حاصل کرنے کے بعد تباہی کا پورا ملبہ اس پر گرا دیتا ہے-

''مائنڈ چلڈرن'' میں ہنس موروبیک ایک مدافعتی وائرس کا ذکر کرتا ہے' جس کا نام اس نے ''وائرس پری ڈیٹر'' تجویز کیا ہے اور جو کسی نیٹ ورک میں اس طرح پھیل جاتا ہے جیسے انسانی جسم میں خون اور جو وائرس کا ویسے ہی خاتمہ کرتا ہے جس طرح انسانی جسم سے خون کے ذریعے اثرات کو دور کیا جاتا ہے' لیکن وہ خبردار کرتا ہے کہ اس کے بعد شکار کئے جانے والے وائرس میں ایسی تبدیلی لانا بھی ضروری ہے کہ یہ کسی خصوصی پری ڈیٹر کی پہچان میں نہ آ سکے- اگرچہ خطرہ پھر بھی باقی رہتا ہے- اب تک ایک ایسا پروگرام بھی سامنے آیا ہے جو اصولی طور پر نہ صرف ہزاروں کمپیوٹروں پر اپنے طور پر اپنے جیسے نقش ثانی تیار کر کے ان میں داخل ہو سکتا ہے اور جو پہلے سے تباہ شدہ پروگرام کی ہدایات کے مطابق' اس عمل کے دوران' اپنے میں تبدیلی بھی لا سکتا ہے- بلکہ جو جراثیمی اوزاروں کی طرح وقتی ضرورت کے تحت' تغیر وتبدل کے مراحل سے گزرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں- اپنے لئے مزید مہلت حاصل کر سکتے ہیں- یوں یہ ایک ایسے ارتقائی وائرس میں تبدیل ہو جاتے ہیں' جنہیں بڑے بڑے وائرس کش ماہر بھی مشکل ہی سے ڈھونڈ سکیں گے- یہ خودمختاری کے راستے پر رواں دواں خصوصی زندگی کی ایک مثال ہے-

یہ درست ہے کہ تیسری لہر کے دور کی ترقی یافتہ جمہوریتوں میں اب عدم مرکزیت کا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چلن عام ہے اور پہلے کے مقابلے میں وہ سب بہت سی فالتو چیزوں سے بے نیاز ہیں اور اس وجہ سے وہ سماجی اور اقتصادی معاملات میں پیش آنے والے صدمات سے نبٹ بھی رہی ہیں' لیکن ان کی کچھ مجبوریاں بھی ہیں- مثال کے طور پر کمپیوٹر جیسے جیسے ترقی یافتہ اور کم جسامت کے ہوں گے ان کو ناکارہ بنانے کے لئے اتنی ہی کم برقی مقناطیسیت درکار ہوگی- علاوہ ازیں تیسری لہر کے زمانے کے معاشرے زیادہ کھلے ڈھلے ہیں' ان کی کارکنوں کی قوت زیادہ حرکت پذیر' ان کا سیاسی اور سماجی نظام زیادہ غیر مزاحم اور ان کی سہل انگاری ان گروپوں اور قوموں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہے جو ان کے درپے آزار ہیں- اگر کچھ اور نہیں تو محض انہی وجوہ کی بناء پر کسی بھی قابل ذکر فوج کو علمی حکمت عملی کے ذریعے' علم کے حصول' اس کی چھان بین' تربیت اور تقسیم کے مسائل پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ سیکیورٹی کو درپیش ایسے مسائل پر بھی توجہ مبذول کرنے کی ضرورت ہے-

مختصراً کسی بھی فوج کی مکمل علمی حکمت عملی کو' اس کے چار پہلوؤں سے معاملہ کرنا ہوگا- حصول علم' اس کی ترتیب' تقسیم اور تحفظ- حقیقتاً ان میں سے ہر ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے-علم کے ان سبھی پہلوؤں کو تحفظ فراہم کرنے کی ضرورت ہے- ترتیب کے لئے انفرمیشن سسٹم کا' علم کے ان تمام پہلوؤں سے واسطہ رہتا ہے-کمپیوٹروں سے مواصلات کو علیٰحدہ کرنا ممکن نہیں ہے- فوج کے علمی نظام کے تحفظ کے لئے دشمن کی خفیہ جاسوسی کارروائیوں کا توڑ کرنے کے طریقوں کا علم ضروری ہے- ان سب کارروائیوں کو مربوط کیسے کیا جا سکے گا- اس پر علمی حکمت عملی کے ماہرین آنے والے طویل زمانے تک غور وخوض کرتے رہیں گے-

اس سے بھی آگے...... اور اس کتاب کے دائرے سے بھی آگے- زندگی کی ایک اور بڑی حقیقت سامنے ہے- فوج کے علم کے ان چاروں پہلوؤں میں سے ہر ایک کی شہری مثال بھی موجود ہے- تیسری لہر کے زمانے کی فوج کی طاقت کا آخری انحصار اس شہری نظام پر ہے جس کی خدمت پر یہ مامور ہے اور جو خود معاشرے کی اپنی علمی حکمت عملی پر انحصار کرنے کے لئے مجبور ہے- تیسری لہر کے زمانے کے اس سہ رخی عالمی نظام کی اکیسویں صدی میں بقاء کے لئے ان اثاثوں میں مسلسل اضافے اور ان کا تحفظ لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے-

اس لئے جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں' وہ الیکٹرانک عہد میں فوج کے' لڑائی کے ابتدائی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تصور اور کمان اور کنٹرول کی موجودہ تعریف، حتیٰ کہ انفرمیشن کے زمانے کی عمومی جنگوں سے آگے کا سفر ہے۔

آنے والے عشروں میں بہترین فوجی دماغوں کو، علمی جنگ آزمائیوں کے اجراء کا تعین کرنے، ان کے باہمی پیچیدہ رشتے قائم کرنے اور ایسے "علمی ماڈل" تعمیر کرنے کا کام سونپا جائے گا، جن سے سٹرٹیجک امکانات ظاہر ہوسکیں۔ یہ وہ رحم مادر ہوگا جس سے علمی حکمت عملیاں جنم لیں گی۔

تیسری لہر کے زمانے کی جنگی قسم کو ترقی دینے کے لئے جنگی حکمت عملیوں کے ڈیزائن کی تیاری اگلا مرحلہ ہے، جیسا کہ ہم دیکھیں گے، کل کے امن کی قسم کا تعین ہو سکے گا۔ بہرحال کسی مناسب حکمت عملی تک پہنچنے کے لئے، ہر ملک اور ہر فوجی قوت کو اپنے منفرد چیلنجوں کا سامنا ہوگا۔ امریکہ کے لئے جس کے پاس دنیا کی سب سے ترقی یافتہ فوج ہے، دوسری لہر کے زمانے کے اپنے بعض اہم ترین قومی اداروں کے، جن کا تعلق "نیشنل سیکیورٹی" سے ہے، ڈھانچوں میں انقلابی تبدیلیاں لانے کے بارے میں سوچ بچار کرنا ضروری ہوگا۔

جاسوس کا مستقبل

ہم تامکو میں، میٹرو ہوٹل سے 45 منٹ کے فاصلے پر واقع ایک معمولی سی عمارت کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ ہم نے اپنے بوٹوں کے تلووں سے برف جھاڑی اور عمارت میں داخل ہو گئے۔ نیم روشن لابی کے ایک رخ پر رہائشیوں کی ڈاک کے ڈبے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ میں ٹھونسے کاغذ باہر تک لٹکتے نظر آ رہے تھے۔ ہم چھوٹی سی لفٹ میں اوپر پہنچے تو ہمارا استقبال بڑی گرمجوشی سے کیا گیا۔ جلد ہی ہم اولیگ کیلوگین کے کمرے میں بڑے آرام سے بیٹھے تھے۔ کیلوگین گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا جو اپنی عمر کی پچاس سے کچھ زیادہ بہاریں دیکھ چکا تھا۔ ہم نے محسوس کیا کہ وہ شستہ انگریزی بولنے پر قادر ہے۔مسکراتے ہوئے اس نے ہمیں اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا، جس پر اس کے نام کے آگے "ماہر" لکھا ہوا تھا، اگرچہ یہ وضاحت موجود نہیں تھی کہ اس کی مہارت کس قسم کی ہے۔

اولیگ کیلوگین سرد جنگ کے گرم ترین دنوں میں واشنگٹن میں سوویت یونین کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جاسوس اعلیٰ کے مرتبے پر متعین رہ چکا تھا- ان دونوں سے لے کر جب اس نے امریکی بحریہ کے افسر جان انتھونی وائسرے واشنگٹن میں سوویت یونین کے جاسوس اعلیٰ کے مرتبے پر متعین رہ چکا تھا - ان دنوں سے لے کر جب اس نے امریکی بحریہ کے افسر جان انتھونی واکرسے، خفیہ امریکی ''کوڈز'' کے بارے میں معلومات حاصل کیں، اس وقت تک جب سولہویں سٹریٹ میں وہ سوویت یونین کے سفارت خانے میں بیٹھا نیشنل سیکیورٹی ایجنسی سے چرائی ہوئی دستاویزات کے مطالعے میں مشغول تھا یا پھر اس کے بعد جب وہ صدی کے سب سے بڑے جاسوس کم فلبی کے ساتھ وارد ہوا تھا- اب تک کافی وقت گزر چکا تھا، ایک زمانے کا، کے جی بی کا یہ نوجوان جرنیل ان دنوں سی این این کے پروگراموں میں، امریکہ کی خفیہ ایجنسیوں، سی آئی اے اور ایف بی آئی کے حکام سے اکثر بات چیت کرتا اور اپنے کیریئر پر غور کرتا ہوا نظر آتا ہے-

گھنٹوں پر محیط، اس ملاقات میں ہم اس سے اس امکان پر باتیں کرتے رہے (جسے وہ قبول کرنے کو تیار نہیں تھا) کہ شاید مختلف ملکوں میں کام کرنے والے کچھ سوویت جاسوسوں یا جاسوسی نیٹ ورکس نے اپنی وفاداریاں تبدیل کر لی ہوں اور اب وہ دوسروں کے لئے کام کر رہے ہوں- اس نے گورباچوف کے زوال کے لئے کی جانے والی سازش کے بارے میں، ہمیں اپنے ذاتی تجزیوں اور اندازوں سے آگاہ کیا اور مستقبل کی دنیا کے پرامن رہنے کے بارے میں اپنی توقعات کا مثبت انداز میں ذکر کیا-

کیلوگین، جاسوسی کے ان طریقوں کا کھلا نقاد ہے، جن پر سرد جنگ کے زمانے میں عمل کیا جاتا رہا- آج اس میدان میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس پر اس کی تنقید اس سے بھی زیادہ سخت ہے- روسی حکومت کے ''اکیڈمی فار سٹیٹ سیکورٹی'' کے قیام کے فیصلے کو وہ بالخصوص درست نہیں سمجھتا- اس کا کہنا ہے کہ اس میں نئی نسل کو سکھانے پڑھانے کا جو بھی پروگرام بنایا جا رہا ہے، وہ بالکل وہی پرانے اور آزمودہ طریقے ہیں جو کے جی بی کے زمانے سے رائج چلے آ رہے ہیں- اس کے کچھ پرانے رفقاء اس پر، اس ایجنسی کو تنقید کا کھلا نشانہ بنانے پر سخت ناراض بھی ہیں، جس کا وہ کبھی سربراہ رہا ہے، لیکن کولیگن کی اپنی رائے ہے اور وہ بلاشبہ عالمی جاسوسی صنعت میں تبدیلیوں کی زندہ علامت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے-

قومی تحفظ کے تمام اداروں میں سے کسی کو بھی ترتیب نو یا نیا تصور دینے کی اتنی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ضرورت نہیں ہے، جتنی کہ ان اداروں کو، جن کا تعلق غیر ملکی جاسوسی سرگرمیوں سے ہے۔ جاسوسی یا خفیہ معلومات جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، کسی بھی سوچ کی حکمت عملی کے اہم ترین جزو کی حیثیت رکھتی ہے۔ تیسری لہر کے زمانے کی جنگی قسم کی جس طرح صورت گری ہو رہی ہے، اسی طرح یا تو جاسوسی کا عمل بھی تیسری لہر کے تقاضوں میں ڈھل جاتا ہے یعنی وہ معاشرے میں معلومات، مواصلات اور علم کا نیا کردار قبول کر لیتا ہے یا پھر یہ سارا عمل ہی مہنگا، غیر ضروری اور خطرناک حد تک گمراہ کن صورت اختیار کر جاتا ہے۔

واشنگٹن میں ان دنوں امریکہ کے خفیہ اداروں میں غیر معمولی کمی بلکہ ان کے کلی خاتمے کی آواز کا شور ہر طرف بلند ہو رہا ہے، لیکن یہ شور و غل بھی، دفاعی اخراجات میں کمی کے مطالبوں جیسا ہی ہے، جس میں دفاعی اخراجات میں زبردست کمی کے نعرے، کسی عالمی حکمت عملی یا جاسوسی کے کسی نئے تصور کو تشکیل دینے کی بجائے، قلیل المدت سیاسی فوائد کے پیش نظر بلند کئے جا رہے ہیں۔

مثلاً ذمہ دار اور معتبر اخبار نیویارک ٹائمز، ایسے تمام مصنوعی سیاروں کو بند کرنے کا مطالبہ کرتا ہے، جو ٹیلی فون کالوں اور میزائلوں کے پیغامات ریکارڈ کر کے متعلقہ اداروں تک پہنچاتے ہیں۔ اخبار حکومتی پالیسی میں اس تبدیلی کی تعریف بھی کرتا ہے جس کی وجہ سے روسی فوج کی جاسوسی اور اس کا تجزیہ کرنے کے لئے سی آئی اے نے اپنے جاسوسوں کی تعداد 125 سے کم کر کے 9 کر دی ہے۔ اخبار کا خیال ہے کہ ایران کی نگرانی تو شاید ضروری ہے مگر باقی کی دنیا کا بندوبست پہلے سے موجود ہے، جو مناسب بھی ہے۔

اس قسم کے غیر ضروری اعتماد کا اظہار نامناسب ہے۔ خاص طور سے جبکہ سابق سوویت فوج کے پاس اہم اور پیچیدہ ایٹمی ہتھیار ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں اور جبکہ ہر ملک دھماکہ سے پھٹنے کے قریب ہے اور اس کی فوج کے بدمعاش عناصر ابھی تک مستقبل کے تعین کے سلسلے میں انقلابی کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ایسی دنیا میں جہاں میزائلوں اور ہتھیاروں کی پیداوار مسلسل بڑھ اور پھیل رہی ہو، کانوں میں انگلیاں ڈالے بیٹھے رہنا ہرگز عقلمندی نہیں ہے۔ عالمی عدم استحکام کو بڑھانے کے لئے اکیلا ایران ہی ایسا ملک نہیں جس پر نظر رکھنا ضروری ہو، باقی کی دنیا بھی اتنی محفوظ نہیں ہے، جتنی نیویارک ٹائمز کے صفحات میں دکھائی دیتی ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ بات 1970ء کے عشرے سے سب کو معلوم تھی کہ شمالی کوریا کا کمیونسٹ ڈکٹیٹر کم ال سنگ' اپنے بیٹے کو اپنی جگہ لینے کے لئے تیار کر رہا ہے' لیکن اس بیٹے کے بارے میں اس کے سوا کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ درآمدی کاروں اور سویڈن کی بازاری عورتوں کا شوقین ہے- 1993ء میں ٹائمز نے رپورٹ کیا کہ سی آئی اے کی معلومات کے مطابق اس کے دو بچے ہیں- یقیناً یہ اہم انکشاف تھا' کسی بھی ایسی حکومت کے بارے میں جہاں وراثت کا سلسلہ رائج ہو' اتنی بنیادی حقیقت تک پہنچنے کے لئے' مغربی جاسوسی اداروں نے اتنا طویل عرصہ ضائع کیا- اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایران کے سوا باقی دنیا کے بارے میں ''باخبری'' کی کیا حیثیت ہے-

جی ایم کا مسئلہ:

غیر ملکی جاسوسی' امریکہ کے لئے تیس ارب ڈالر سالانہ کا نسخہ ہے- اس کے اہم اداروں میں سی آئی اے' دفاعی جاسوسی ایجنسی' نیشنل سیکیورٹی ایجنسی اور این آر او وغیرہ شامل ہیں اور یہ سب کلاسیکی طور پر دوسری لہر کے دور کی یادگار ہیں- یہ جسامت میں حد سے بڑھے ہوئے' نوکر شاہی کے نادر نمونے' مرکزیت کے شاہکار اور خفیہ اور پر اسرار قسم کے ادارے ہیں- روسی کے جی بی اور روسی فوج کے جاسوسی ادارے بھی ایسے ہی ہیں' بلکہ ان سے بھی کچھ بڑھ کر-

ایسے ادارے' آج کے زمانے میں جاسوسی کے شعبے میں اتنے ہی فرسودہ ہو چکے ہیں' جتنے کہ معیشت کے میدان میں' بالکل جنرل موٹرز یا آئی بی ایم جیسے صنعتی اداروں کی طرح- دنیا کے اہم ترین جاسوسی مصنوعات ساز بھی' شناخت کے بحران میں مبتلا ہیں اور سخت اضطراب کے عالم میں یہ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ غلطی کہاں ہوئی اور یہ کہ وہ واقعی کس کاروبار میں ہیں؟ اور تجارتی ڈائنا سور کی طرح وہ بھی اپنے بنیادی مقاصد اور مارکیٹ کے بارے میں سوال پوچھنے پر مجبور ہیں-

تیزی سے بدلتی ہوئی تجارتی دنیا میں' خوش قسمتی سے مینجمنٹ کے نظریہ سازوں کی طرح انقلابیوں کی ایک نسل اس شعبے میں ابھر رہی ہے جو جاسوسی سے نجات حاصل کرنے کی بجائے اس کو تیسری لہر کے زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔''قومی تحفظ'' کے جس نظریے کی حفاظت کا یہ ادارے دعویٰ کر رہے ہیں' اس کا دائرہ وسیع کر کے اب اس میں نہ صرف فوج بلکہ معیشت' سفارت حتیٰ کہ ماحولیاتی اجزاء بھی شامل کئے جا رہے ہیں۔ امریکہ کی قومی سیکیورٹی کونسل کے ایک سابق رکن جان ایل پیٹرسن کا کہنا ہے کہ مشکل کو دھماکہ خیز حد تک پہنچانے سے قبل ہی امریکہ کو اپنی جاسوسی کی طاقت دنیا کے ایسے مسائل جیسے بھوک' تباہی اور فضائی آلودگی وغیرہ کے حل کرنے کے لئے صرف کرنی چاہیے کیونکہ یہی وہ مسائل ہیں جو اقوام عالم کی آبادیوں کو متشددانہ تصادم پر مجبور کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے جاسوسی سرگرمیوں کی کم نہیں زیادہ ضرورت ہوگی مگر یہ دوسرے طریقے کی جاسوسی ہوگی۔ اس میں بھی تجارت کے ساتھ اس کی مطابقت بڑی حیرت انگیز ہے۔ پیٹرسن کہتا ہے کہ اس طرح جوں جوں سیکیورٹی مارکیٹ آگے بڑھتی ہے اور وسعت اختیار کرتی ہے' اس کے نئے ٹکڑوں کے لئے نئی پیداوار کی ضرورت بڑھتی رہے گی۔

سی آئی اے کا ایک اہم تجزیہ کار اور مینجر اینڈریو شیپرڈ' بالکل ایک کاروباری ماہر کی طرح بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جاسوسی کے ماہروں کو اپنی پیدوار محدود کرنی چاہیے۔ معمول کی جاسوسی کارروائیوں کی کتر بیونت کر کے انہیں خصوصی مہارتوں کی ضرورت کے مطابق ڈھالنا ضروری ہے۔ ہر اہم صارف کی ضرورت کے مطابق مال تیار کر کے مختلف طریقوں سے اس کو پیش کرنے کی صلاحیت ہم میں ہونی چاہیے اور مکمل صورت میں فروخت کے مقام پر مال ڈلیور کرنا بھی ہم پر لازم ہے۔

اس طرح تیسری لہر کے دور میں انتظامی نوعیت کی سوچ بچار رکھنے والے جاسوسی کے شعبے سے متعلق کچھ ترقی پسند قسم کے مفکرین' گاہکوں کی بات سننے' انتظامی ایجنٹوں کے اخراجات کم کرنے' عدم مرکزیت اختیار کرنے' اخراجات گھٹانے اور نوکر شاہی سے نجات حاصل کرنے کی تلقین بھی کر رہے ہیں۔

سینفورڈ میں ہوور انسی ٹیوشن کے انجیلوکوڈ وِلا کی تجویز یہ ہے کہ ''ہر حکومت کو صرف ایسے راز جمع کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے پر توجہ دینے کی ضرورت ہے جن کی اسے ضرورت ہے۔'' اس کا خیال ہے کہ سی آئی اے کا کردار کلیرنس ہاؤس تک محدود کر دینا چاہیئے' کوڈ وِلاؔ امریکی حکومت کو دنیا بھر میں اپنے سفارت خانے میں مقرر ہزاروں جاسوسوں اور ان کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہمزادوں کو ریٹائر کرنے کا مشورہ دیتا ہے' کیونکہ یہ لوگ جنہیں بظاہر سفارت کار قرار دیا جاتا ہے' مگر جن کا کام خفیہ ذرائع سے ایسی معلومات حاصل کرنا ہوتا ہے جو کسی بھی باخبر تاجر' صحافی اور دفتر خارجہ کے کسی اہل کار سے با آسانی حاصل ہوسکتی ہیں- ایسے دس فیصدی جاسوس جو سفارت کاروں کے روپ میں یہ کام کر رہے ہیں اور جو واقعی مفید ثابت ہوسکتی ہیں' انہیں دفاع اور خزانے جیسے اہم اور خصوصی محکموں میں ذمہ داریاں سونپی جاسکتی ہیں-

جن ملکوں میں جاسوسی کارروائیاں زیادہ ضروری ہیں' ان میں ایسے جز وقتی مخبروں سے جو تجارتی یا پیشہ ورانہ حلقوں میں سرگرم ہوں' زیادہ کام لینے کی ضرورت ہے- اگر مخفی کارروائیاں...... غیر ملکی خفیہ کارروائیاں جن کی سپانسر شپ سے بہرحال انکار کر دینا چاہیے' ضروری ہوں تو وہ جاسوسی ایجنسیوں کی بجائے فوج یا دوسرے باقاعدہ اداروں کے سپرد ہونی چاہئیں-

کوڈ ولا کا خیال ہے کہ جاسوسی معلومات کے حصول کے فنی ذرائع' بشمول سٹلائٹ سسٹم کے' برقی ویکیوم کلینر کی طرح بلا امتیاز کام کر رہے ہیں' جو گندم کے ساتھ بھوسہ زیادہ اٹھا رہے ہیں' تو ان میں بھی فوج کے ہتھیاروں کی طرح اہداف کو نشانہ بنانے میں قطعیت کی ضرورت ہے-

یہ ''گندم'' بھی جس کا حصول متذکرہ طریقہ استعمال کرنے والوں کا مقصد ہے' بدل رہی ہے- حتیٰ کہ خود فوج میں بھی یہی صورت حال ہے- اس کی مثال جنوری1993ء میں پینٹا گان کے اعلیٰ حکام میں تقسیم کی جانے والی ایک اہم دستاویز ہے' جس میں یہ الزام لگایا گیا تھا کہ فوج کے شعبہ جاسوسی سے تعلق رکھنے والے اور سینیئر تجزیہ کار 11ارب میں کھلے میدانوں میں لڑی جانے والی جنگوں کے خیال ہی کو چپائے جا رہے ہیں- وہ زیادہ زور جنگ کے فوجی پہلو پر دیتے ہیں اور سیاسی حکمت عملی کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں کر رہے- ''تجزیہ کرنے والے'' یہ دستاویز کہتی ہے: ''تیسری دنیا کے بارے میں جو ہماری مخالفت میں سامنے آسکتی ہے' موجود ڈیٹا کے متعلق کچھ محسوس نہیں کرتے- نہ ہی وہ فوجی لحاظ سے ان غیر اہم مخالفوں (جیسے کہ بوسینا کی سرب افواج) پر کوئی توجہ دیتے ہیں جو ہمارے لئے اعصاب شکن مسائل پیدا کر سکتے ہیں-

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نئی منڈیاں:

سی آئی اے کے ایک سابق تجزیہ کار بروس ڈی برک وٹنر اور اسی ایجنسی کے صدارتی کوآرڈی نیٹر ایلین ری گڈ مین کے بیان کے مطابق ''جاسوسی کی خفیہ ایجنسیوں کو جیٹ طیارے تلاش کرنے اور دوران پرواز ان سے خارج ہونے والے مادوں اور اشاروں کا تجزیہ کرنے کی بجائے ان چھوٹے اور پرانے طیاروں کا پیچھا کرنے اور ان کا حسب نسب جاننے پر زیادہ توجہ دینی چاہیے' جو منشیات کی ترسیل میں استعمال ہوتے ہیں- اسی طرح نقل و حرکت کرتی ہوئی ٹینکوں کی بٹالینوں کا پتہ لگانے کی بجائے' دہشت پسندی کے بارے میں متعلقہ ملک کے رویے پر توجہ دینا زیادہ ضروری ہے-

دہشت پسندی کے مقابلے کے لئے' بالخصوص بڑی صاف اور واضح معلومات درکار ہوتی ہیں اور ان تک رسائی کے لئے نئی کمپیوٹر تکنیک کا علم ہونا بھی ضروری ہے- فرانس کی خفیہ ایجنسی کے سابق سربراہ کاؤنٹ ڈی مارنچس کے یہ الفاظ صداقت پر مبنی نظر آتے ہیں کہ ''قطعیت کے ساتھ' ذاتی طور پر حاصل ہونے والی خفیہ معلومات' قطعیت کی رہنمائی میں جمع شدہ اسلحہ باورد سے کہیں زیادہ لائق اعتماد ہوتی ہیں-''

مارچ 1993ء میں اے آئی پی اے ایس جی (ایڈوانس انفرمیشن پراسیسنگ اینڈ انالائزنگ سیٹرنگ گروپ) کی ایک میٹنگ میں آلٹا اپنے لیٹکس کے کرسٹو فرویسٹ اور رابرٹ بیک مین نے نئی سافٹ ویئر کو گوناگوں ڈیٹا مراکز کے ذریعے دہشت پسند گرمیوں کی تلاش کے لئے خفیہ رشتوں کی تلاش کو حکام کے لئے سودمند قرار دیا ہے- اس کے استعمال سے دہشت گردی کے خلاف برسرعمل کوئی گروپ' مثال کے طور پر کمپیوٹر سے ان تمام مقامات کی تفصیل لے سکتا ہے جہاں چار چھ یا اس سے زیادہ مخصوص قسم کے لوگ اکثر آتے ہوں- اس میں نکتہ یہ ہے کہ اس کا استعمال کنندہ ان قابل اعتراض اجتماعات کے بارے میں معلومات بھی حاصل کر سکتا ہے اور انہیں بے نقاب بھی کر سکتا ہے- جن کے بارے میں کسی دوسرے طریقے سے جاننا شاید ممکن نہ ہو-''

وجہ صاف ظاہر ہے' جب گاڑیاں ٹیلی فون اور مخصوص جگہیں کسی مخصوص گروپ کے مرکز کی حیثیت اختیار کرتی نظر آتی ہیں تو یہ سوال پوچھنا لازم ہو جاتا ہے کہ ''یہ ہجوم یہاں کیوں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جمع ہے؟ اور اس اجتماع کے پیچھے کون ہے؟'' کہا جاتا ہے کہ کمپیوٹر پروگرام جسے نیٹ میپ کا نام دیا گیا ہے' ایسے گروہوں کی نشاندہی بھی کرسکتا ہے جو ابھی تکمیل یا تشکیل کے مراحل میں ہیں-

یہ سوچا جا سکتا ہے کہ ایسے ڈیٹا کو بنکوں سے حاصل ہونے والی معلومات کے ساتھ ملا کر' کریڈٹ کارڈوں' خریداروں کی فہرستوں اور دوہرے ذرائع جیسے کمپیوٹر پروگراموں کی مدد سے ایسے گروپوں یا افراد کی نشاندہی ہوسکتی ہے جو دہشت گردی کی تعریف میں فٹ بیٹھتے ہوں- (اسے پیش کرتے وقت اس امکان کی طرف توجہ نہیں دی گئی کہ یہی پروگرام دوسرے غیر متشدد' سیاسی مخالفوں' مذہبی گروپوں اور شہری حقوق کی جدوجہد کرنے والے گروپوں کی نشاندہی میں حکومت کی مدد بھی کرسکتا ہے-)

اسی کانفرنس میں اینالیٹک سائنس کارپوریشن (ٹی اے ایس سی) کے مارک ہیلی اور ڈینس مرفی نے ایک ایسے کمپیوٹر پروگرام کی تیاری کی تجویز پیش کی جس سے دنیا بھر میں اسلحہ کی خرید وفروخت کا پتہ لگانے میں مدد مل سکتی ہے- ان کی تجویز کے مطابق اس سسٹم کے تحت خریداروں اور فروخت کرنے والوں کے متعلق معلومات' خریدے ہوئے اسلحے کی تفصیل' تاریخوں اور مقدار کے بارے میں ڈیٹا جمع کیا جائے گا- جنگ آزمائی کے اس غیر محسوس دور میں ''علمی پہلوؤں'' کا مانیٹر کرنا بھی اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنا کہ دشمن کی فوجوں' ان کے مذہبی خیالات' تہذیب' تعلیمی سطح' تربیت' ان کی معلومات کے ذرائع' میڈیا جس سے وہ فارغ اوقات میں لطف اندوز ہوتے ہیں اور اسی طرح کے معاملات کے متعلق جاننا جن کا تعلق علم کی قوت سے ہے- مختصر یہ کہ تیسری لہر کے زمانے کی افواج کا علم کے میدان کا شناور ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ماضی میں جغرافیئے اور میدان جنگ کی خصوصیات سے آگاہ ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے-

انسانی پہلو:

ایٹمی ہتھیاروں اور میزائلوں کی ترقی کے شعبوں میں' سوویت یونین کی پیش رفت کو مانیٹر کرنے کیلئے سٹلائیٹ کے وسیع اور انتہائی خودکار نظام کی تشکیل نے اس کے انسانی پہلو' یعنی ذرائع سے حصولِ معلومات کے طریقوں کو نظر انداز کرنے کی بنیاد فراہم کی- اس کا نتیجہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ ہوا کہ مخالف کے عزائم کی بجائے اس کی صلاحیتوں کو جانچنے پر زیادہ زور دیا جاتا رہا-

یہ درست ہے کہ بعض اوقات ''صلاحیتوں'' کی ترقی اور رفتار سے بھی- جن میں ٹینک' میزائل' طیارے' فوجی ڈویژن اور دوسرا مادی ساز و سامان شامل ہے- دشمن کے عزائم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بہترین سٹلائٹ بھی' دہشت گرد کے دماغ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا- نہ ہی ان سے صدام حسین کے عزائم کے بارے میں کوئی اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے- مصنوعی سیاروں اور نگرانی کی دوسری فنی صلاحیتوں کے ذریعے' امریکہ کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ صدام' کویت کی سرحد کے قریب فوجیں جمع کر رہا ہے' لیکن امریکہ نے جسے بغداد کے اندرونی حلقوں میں جاسوسوں کی کمی کا سامنا تھا' اس ضمن میں ملنے والی وارننگوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور ان کے متعلق غلطی سے یہ فیصلہ کیا کہ فوجوں کی نقل و حرکت محض 'بلف'' ہے- صدام حسین کے قریبی حلقوں میں' جسمانی طور پر ایک بھی جاسوس موجود ہوتا تو وہ اس کے ارادوں کو بھانپ لیتا اور یوں تاریخ کچھ اور ہوتی-

تیسری لہر کے جاسوسی نظام کی طرف بڑھنے کا مطلب عام قیاس کے برعکس' انسانی جاسوسوں پر زیادہ انحصار کرنا ہے- پہلی لہر کے زمانے میں' جاسوسی کا یہی واحد ذریعہ میسر تھا-

معیار کا بحران:

دوسری لہر کے زمانے میں ٹیکنالوجی کے ذریعے ''ڈیٹا'' کی بڑے پیمانے پر فراہمی نے ''تجزیے کے تعطل'' کی صورت حال پیدا کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے- موجودہ مصنوعی سیاروں' اوزاروں اور آلات نے اتنا بھوسہ جمع کر دیا ہے کہ اس میں ملی ہوئی گندم کی تلاش ایک امر محال ہے- انتہائی نستعلیق قسم کا کمپیوٹر پروگرام' ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو کی چھان بین کرنے کے بعد' خفیہ تحریر کی کلید تک رسائی حاصل کرنے میں مدد دے سکتا ہے- یہ مختلف اقسام اور مختلف سطح کی برقی سرگرمیوں کو مانیٹر بھی کرتا ہے- میزائلوں کو اڑانے کے عمل کا جائزہ لیتا ہے- ایٹمی سہولتوں کی تصویریں اتارتا ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کرتا ہے' لیکن تجزیہ کرنے والے اس کی کارکردگی کا ساتھ دینے اور اسے ایک مفید اور برمحل خفیہ جاسوسی کارروائی میں بدلنے کی صلاحیت سے محروم رہے ہیں-

نتیجۃً معیار کی جگہ مقدار پر زور دینے تک محدود رہا' بالکل اسی طرح جنرل موٹرز اور

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

متعدد دوسری تجارتی کمپنیوں کو ایسے مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے جو عالمی مقابلے کی فضا میں اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہیں- انفرمیشن کی حد بندیوں میں جکڑنے کی وجہ سے' اعلیٰ معیار کی تجارتی ''پروڈکٹس'' بھی اکثر اوقات' صحیح وقت پر' صحیح آدمی تک پہنچنے میں ناکام رہتی ہیں- پرانے نظام میں انٹیلی جنس کی ان لوگوں تک بروقت ترسیل کا جنہیں اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی تھی' کوئی اہتمام سرے سے موجود ہی نہیں تھا-

ان تمام وجوہ کی بناء پر جاسوسی پیداوار کی قدر و قیمت اس کے ''خریداروں'' کی نظر میں گر گئی- اس لئے اس پر کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہیئے کہ اس کو استعمال میں لانے والے امریکی صدر سے لے کر نیچے کے عملے تک' ان کلاسیکی تحریروں کو نظر انداز کرتے نظر آتے ہیں' جو ان کی میزوں پر ڈھیروں میں جمع ہوتی رہتی ہیں یا خفیہ بریفنگ میں آج تک پہنچائی جاتی ہیں- بلاشبہ رازداری بجائے خود...... بشمول اس میں موجود مفروضوں کے...... اپنے پر از سر نو غور کرنے کی دعوت دیتی ہے-

وزیر دفاع کے دفتر کا ایک ذمہ دار افسر کہتا ہے:

''رازداری کا زبردست مسلک موجود ہے اور حقیقت یہ ہے کہ رازداری کے معاملے نے بجائے خود اسے لٹمس ٹسٹ کی شکل دے دی ہے' جس میں ایسڈ اور الکلی سے مادے کے رنگ بدل دیئے جاتے ہیں' یعنی رویہ یہ تھا کہ اگر کوئی انفرمیشن خفیہ نہیں ہے تو اسے اہم یا صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا-

امریکی حکومت نے 1992ء میں 63 لاکھ ایسی کلاسیفائیڈ دستاویزات تیار کیں' جن میں سے ہر ایک پر ''صرف سرکاری استعمال کے لئے'' کا فقرہ درج تھا- دوسرے درجے پر زیادہ رازداری والی دستاویزات پر ''خفیہ'' کی مہر نصب ہوتی ہے' اس کے اوپر کی درجہ بندی والے کاغذات پر ''راز'' اور کچھ پر ''نیٹو کے راز'' کا ٹھپہ لگا ہوتا ہے اور یہ وہ راز ہوتے ہیں جن میں ''نیٹو'' کے دوسرے رکن ممالک کو شریک کیا جا سکتا ہے- باقی کے دوسرے کاغذات میں ان کو حصہ دار نہیں بنایا جا سکتا- اس کے بعد ''ٹاپ سیکرٹ'' اور ''نیٹو ٹاپ سیکرٹ'' وغیرہ کی مہروں والی دستاویزات ہوتی ہیں' لیکن ابھی تک ہم نے چوٹی تک پہنچنے کا آدھا راستہ ہی طے کیا ہے اور رازداری کی بلندیوں سے کافی نیچے بھٹک رہے ہیں- ٹاپ سیکرٹ سے اوپر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایس سی آئی یا حساس، مخصوص انفرمیشن وغیرہ کے عنوانات کے تحت بھی دستاویزات دیکھنے کو ملتی ہیں، جن تک رسائی بہت ہی کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ اس انتہائی بلندی تک پہنچنے سے پہلے ہم اس انفرمیشن کو صرف ان لوگوں میں تقسیم کرنے کے قابل ہوئے جن کی فہرستیں تیار رکھی ہیں اور جو خصوصی ''کوڈ'' کے الفاظ سے مسلح ہیں۔

یہ سسٹم کہیں بہت سادہ اور معمولی نہ لگے اس لئے اس کے اردگرد کچھ اور حصار تعمیر کر لئے گئے ہیں اور وہ ہیں ''نوفورن'' مطلب یہ کہ یہ کاغذات غیر ملکیوں تک نہیں پہنچنے چاہئیں۔ اس طرح ''نوکنٹریکٹ'' کے ٹھپے والے کاغذات کو ٹھیکے داروں سے دور رکھنے کی ہدایت ہے۔ پھر ''ڈبل'' کا ٹھپہ ہے جس کا مطلب وارننگ کا نوٹس ہے جس میں خفیہ ذرائع اور طریقے شامل ہیں۔ اس کے بعد ''اورکون'' کی مہر ہے جو انتشار کو مزید پھیلنے کے روکنے اور کنٹرول کرنے کے ذرائع کی نشاندہی کرتی ہے۔

یہ پورا اعلیٰ سطحی اور مہنگا ترین نظام اس وقت تنقید کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ رازداری فوجی قوت میں کب اضافہ کرتی ہے اور حقیقت میں یہ کب سیکیورٹی کی کمزوری کا باعث ہوتی ہے؟ صدر ریگن کے سائنسی مشیر جی اے کے ورتھ کے الفاظ میں: ''انفرمیشن کے تحفظ کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ اس کی درجہ بندی اس کے لئے گھاٹے کا سودا بن جاتی ہے۔'' رازداری کے بارے میں پیدا ہونے والے نئے شبہات آج کی تیسری لہر کے زمانے کی تبدیلیوں اور ان سے پیدا ہونے والے چیلنجوں کا براہ راست نتیجہ ہیں۔

مقابلے میں نئی دکان

تیسری لہر نے جو کچھ کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے اکناف عالم میں پھیلی ہوئی معلومات کا دائرہ (مع غلط معلومات کے) دھماکہ خیز طریقے سے وسیع کر دیا ہے۔ کمپیوٹر کے انقلاب، مصنوعی سیاروں کی بڑھتی ہوئی تعداد، کاپی کرنے کی مشینوں میں روزافزوں اضافہ، وی سی آر، الیکٹرانک نیٹ ورکس، ڈیٹا مراکز کی بڑھتی ہوئی تعداد، فیکس، کیبل ٹیلی ویژن کا عروج، سٹلائٹ کے ذریعے براہ راست نشریاتی رابطے اور معلومات کی ترسیل سے متعلق متعدد دوسرے عوامل نے ٹیکنالوجی کے ربط ضبط اور اس کے ذریعے ان کی تقسیم سے اس نے معلومات، اعداد وشمار اور علم کے بہت سے دریا بہا دیئے ہیں جواب تصورات، علامتوں، اعداد

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وشمارٗ الفاظ اور آوازوں کے وسعت پذیر اور ہر دم پھیلتے ہوئے بحر بیکراں کا حصہ بن رہے ہیں۔ تیسری لہر نے کنایتاً معلومات کی ایک نئی کائنات تخلیق کرنے کا کارنامہ سرانجام دے دیا ہے۔

اس وجہ سے اس صورت حال نے جاسوسی کی دکان کے ستاھ ملی ہوئی عمارت میں مقابلے کی نئی دکان کھول دی ہے......تیسری لہر کے کمپیوٹر کا ذریعہ رکھنے والی دکان جو انفرمیشن کی بہمرسانی کے کام کو دوسری لہر کے جاسوسی کے کارخانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیز رفتاری سے سستے نرخوں پر ممکن بنا رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ حکومتوں اور فوجوں کو درکار ہر قسم کی معلومات تو فراہم نہیں کر سکتی پھر بھی یہ بہت کچھ دے سکتی ہے۔

اس کے جواب میں تیسری لہر کے زمانے میں دھماکہ خیزی اور مواصلاتی ذرائع سے وہ سب کچھ حاصل کرنا آسان ہوگیا ہے اور اس کا حصول کھلے ذرائع سے ممکن بھی؛ جس کی فیصلہ کن اختیارات رکھنے والے لوگوں کو تلاش رہتی ہے۔ حتیٰ کہ فوجی جاسوسی کی خفیہ معلومات بھی برابر کی دکان سے کھلے بندوں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ان سب باتوں کو نظر انداز کرنا اور اپنے تجزیوں کو صرف بند ذرائع کا محتاج بنائے رکھنا نہ صرف مہنگا معاملہ ہے بلکہ اسے حماقت قرار دینا بھی غلط نہ ہوگا۔

ان سب معاملات کے بارے میں بحریہ کے سابق جاسوسی ماہر 41 سالہ سمارٹ رابرٹ ڈی سٹیل نے جتنی گہرائی اور خیال انگیزی سے غور وفکر کیا ہے شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ سٹیل نے 1976ء میں لیہمہ یونیورسٹی میں اپنی ماسٹرز ڈگری کے لئے ''انقلاب کی پیش گوئی'' کے عنوان سے اپنا تھیس مکمل کیا۔ جلد ہی اسے انقلاب کی حقیقی ماہیت جاننے کا بھی موقعہ مل گیا۔ طویل القامت، مائل بہ فربہی جسم اور خوشگوار آواز کا مالک سٹیل خانہ جنگی کے زمانے میں السلویڈور میں امریکی سفارت خانے میں خاصی نیک نامی سے خدمات انجام دے چکا ہے۔ اگرچہ اس کی بعد کی سرگرمیوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہاں پر وہ خفیہ جاسوسی کے کام پر بھی مامور رہا۔ بعدازاں وہ واشنگٹن واپس آ گیا اور اس نے اپنی ملازمت اور زندگی کا رخ تبدیل کر لیا۔ یوں وہ ایک ایسی ٹیم کا سربراہ بن گیا جس کا کام غیر ملکی پالیسیوں سے متعلق مسائل پر انفارمیشن ٹیکنالوجی کے نفاذ کی راہ ہموار کرنا تھا۔

اس دوران میں اس نے بحریہ کے جنگی کالج سے گریجویشن کرنے کے علاوہ ہارورڈ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یونیورسٹی کے پبلک جاسوسی کی ترجیحاتی کمیٹی اور دوسری دفاعی تنظیموں کے رکن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ حال ہی میں وہ میرین کور کے جاسوسی کے اسی شعبے سے منسلک رہا ہے جس کا تعلق مصنوعی جاسوسی سرگرمیوں اور علمی پالیسی سے متعلق وسیع تر سوالات سے ہے۔

سٹیل نیویارک ٹائمز کے اداریہ نویس کے اس دعوے سے ہرگز متفق نہیں ہے کہ دنیا (ایران کے علاوہ) امریکی خفیہ سرگرمیوں کے صحیح حصار میں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حقیقت میں امریکہ کو اس میدان میں لسانی ماہروں' مختلف علاقوں سے متعلقہ مہارت رکھنے والے افراد جو خطے کے زمینی حقائق سے آگاہ ہوں اور اس حد تک تجربہ کار بھی ہوں کہ مخدوش حالات میں جاسوسی بھی کر سکیں' کی شدید کمی کا سامنا ہے۔ سٹیل کی سمجھ کے مطابق کسی بھی امریکی میں اتنا صبر نہیں ہے کہ وہ ان ذرائع کی ترقی کے لئے درکار وقت کا انتظار کر سکے۔

امریکی تاجروں کی نئی نسل کی طرح وہ تنظیمی خامیوں کا بھی شاکی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ امریکی جاسوس ادارے عام طور سے فوری نتائج پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اپنے خفیہ غیر ملکی اثاثوں کی طویل المدت منصوبہ بندی پر توجہ نہیں دیتے۔ سٹیل آج کی دنیا کی طرف سے متوقع طور پر پیش آنے والے خطرات پر سنجیدگی سے توجہ دیتا ہے۔ اس کو یقین ہے کہ امریکہ اس حقیقت کا مقابلہ کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہے جس کے مطابق یہ کرہ ارض اس وقت نظریاتی ' مذہبی اور تہذیبی جنگجوؤں کی زد میں ہے جو اس پر آزادانہ گھوم پھر رہے ہیں اور یہ امکان ہمہ وقت موجود نظر آتا ہے کہ کمپیوٹر کریکرز'' اس صورت حال میں کولمبیا یا ایران جیسے ممالک میں دخل اندازی کے ذریعے اپنی یہ مہارت مجرموں اور جنونیوں کو پیش کر دیں۔

لہٰذا وہ امریکی جاسوسی اداروں کو ختم کرنے کے حق میں نہیں ہے' نہ ہی وہ اس عظیم الجثہ ڈائناسور کو نئی ڈائناسور کی شکل دینے کے حق میں ہے۔ اس کے برعکس وہ اس شعبے کی ترتیب نو کی بات کرتا ہے تاکہ اس کے نتیجے میں جو کچھ بھی سامنے آئے وہ حجم میں کم سے کم تو ہو لیکن دیکھنے میں ڈائناسور نہ لگے۔

اس کا یقین ہے کہ امریکہ کی جاسوسی برادری کا بڑا حصہ حقیقتاً اس بجٹ کی کٹوتی کے بلیک ہول میں غائب ہو جائے گا۔ باقی کے حصے کی نج کاری ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر انفرمیشن کے موضوع سے متعلقہ امریکہ کی غیر ملکی نشریاتی سروس جسے سینکڑوں غیر ملکی ریڈیو اور

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ٹیلی ویژن دکھانے والے سنتے ہیں اور اپنے سیاسی، سفارتی اور فوجی مقاصد کے لئے اپنے نشریاتی ذرائع سے آگے بھی پہنچاتے ہیں۔ اسے نجی شعبے کی تحویل میں دینے کی ضرورت ہے۔ سٹیل کہتا ہے کہ ریڈیو اور ٹی وی کے پروگرام سننے اور دیکھنے کے لئے آپ کو سرکاری جاسوسوں کی ضرورت نہیں ہے۔

موجودہ جاسوسی سرگرمیوں کے تیسرے حصے......تجزیے......کو عدم مرکزیت کی نذر کرنے کی ضرورت ہے۔ مرکزی ایجنسیوں کے بڑے بڑے جناتی مراکز ہیں۔ تجزیاتی سرگرمیاں جاری رکھنے کی بجائے یہ کام تجارت، خزانہ اور زراعت سے متعلق سرکاری محکموں کی داخلی ذمہ داری ہونی چاہیئے۔ واضح رہے کہ ڈوولا بھی یہی رائے ظاہر کر چکا ہے اور دوسرے متعلقہ افراد اور شعبے بھی ایسی ہی تجاویز پیش کر چکے ہیں۔

لیکن ان تمام تجاویز میں سے کسی ایک کو بھی سٹیل کی انفرادی مہم کے مرکزی مطالبے کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اس کے سامنے ایک بڑی وہیل مچھلی کے شکار کا عظیم مقصد ہے اور یہ ہے راز داری کا عفریت، واشنگٹن میں راز داری کا واحد اور سب سے طاقتور مخالف سٹیل ہی ہوسکتا ہے۔

''اگر کوئی دہشت پسند گروپ سامنے موجود ہے اور اس کا کوئی ایسا پروگرام بھی نظر آ رہا ہے جو تباہی پھیلا سکتا ہے اور آپ اس گروہ میں اپنا کوئی آدمی داخل کرنے میں کامیاب بھی ہو چکے ہیں تو بہر حال آپ کو اس آدمی کی شناخت میں راز داری رکھنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح کچھ اور راز خفیہ رہنے ہی چاہئیں لیکن ان راز داریوں کی خفیہ قیمت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اکثر اوقات ان سے حاصل ہونے والے فوائد ان کے سامنے گرو نظر آتے ہیں؛'' سٹیل کا بیان ہے:

مثال کے طور پر فوجیں اپنی خامیوں کو عام نہیں کرتیں تا کہ دشمن ان کی کمزوریوں سے فائدہ نہ اٹھا سکے لیکن وہی پابندی جو دشمن کو اندھیرے میں رکھنے کا باعث ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو بھی اس خامی سے بے خبر رکھنے کی وجہ بن جاتی ہے جو اسے دور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یوں خامیاں اگر ظاہر بھی ہوتی ہیں تو دیر سے کیونکہ راز داری کے مقاصد کے پیش نظر انفرمیشن کو ڈبے میں بند کر دیا گیا ہے اور کسی بھی ایجنسی کے مختلف گروہ ایسے مسائل کے مختلف حل تجویز کرتے ہیں اور اس ضمن میں جن معلومات کو وہ ترقی دیتے ہیں انہیں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شامل کرنے، پھیلانے اور استعمال میں لانے میں سخت مشکلات پیش آتی ہیں...... سٹیل کے تجزیے کے مطابق، "اس سے بھی دشوار مرحلہ یہ ہے کہ ایسے تجزیے بیرونی دنیا سے بالکل کٹے ہوئے ہوتے ہیں اور زندگی کی حقیقتوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔"

سٹیل جب میرین کور کے جاسوسی کے شعبے سے ایک سینئر شہری عہدیدار کی حیثیت سے منسلک تھا تو اس نے ایک کام تو یہ کیا کہ اس کے کام کے جو مراکز ورک سٹیشن تھے وہ اس نے تجزیہ کاروں کی تحویل میں دے دیئے۔ کمپیوٹروں نے انہیں فوراً ہی اعلیٰ سطحی خفیہ مواد مہیا کر دیا۔ لیکن میرین نے نزدیک ہی اپنا بھی ایک شیشے کا گھر تعمیر کر دیا اور اس میں ایک پی سی مشین نصب کر دی۔ اس کے ذریعے تجزیہ کرنے والا انٹرنیٹ سے رابطہ کر سکتا تھا اور یوں دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہزاروں ڈیٹا مراکز تک اس کی رسائی ممکن ہوگئی اور یہ سارے مرکز ملکی عوام کے لئے موجود غیر خفیہ قسم کی معلومات سے پر تھے۔ یہ جان کر تجزیہ کرنے والے حیرت زدہ رہ گئے کہ انہیں جو معلومات درکار تھیں ان کا غالب حصہ خفیہ مواد میں موجود ہی نہیں تھا۔ رازداری کے تقاضوں کی وجہ سے ان کے ورک سٹیشن پبلک نیٹ ورکس کی حیثیت حاصل نہیں کر سکے تھے۔ اس کے نتیجے میں ان کی اہمیت چھوٹے پی سی کی رہ گئی جو باہر کی دنیا سے منسلک تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ جو معلومات انہیں درکار ہیں ان کا بہت سا حصہ کھلے مواد میں آسانی سے دستیاب تھا۔

سٹیل کھلے ذرائع سے خفیہ معلومات کے حصول کے بارے میں اس قدر سنجیدہ ہوگیا کہ اس نے بحریہ سے اپنے طور پر اور اپنے خرچ سے کھلے ذرائع کے پہلے کھلے سمپوزیم کے قیام کی اجازت مانگی...... جس کے بعد اس نے نومبر 1992ء میں ورجینیا میں ایک کانفرنس منعقد کی۔ اس اجتماع کے مقررین میں دفاع کی خفیہ ایجنسی کے چیف آف سٹاف، صدر امریکہ کے ایک سابق سائنسی مشیر، مرکزی خفیہ ایجنسی کے ایک ڈپٹی ائریکٹر کے علاوہ انفریمشن انڈسٹری کے متفرق شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل تھے۔ حتیٰ کہ ممبروں یا مبصروں کی شکل میں کمپیوٹر سے سازباز کرنے والی "ہیکر" برادری کے افراد بھی کانفرنس کے شرکا میں شامل تھے۔ گیت نگار جون پیری بارسو اور "ورچوئیل ریالٹی" اور "ورچوئیل کمیونٹی" کے مصنف ہاورڈ این گولڈ بھی حاضر تھے۔

یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کھلے ذرائع اور فوج اور خفیہ جاسوسی برادری کی مدد کے بغیر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جاسوسی کے تصور کو تقویت دینے کے لئے منقعد کیا جانے والا کنونشن اتنا اہم واقعہ بن سکتا تھا۔ کھلے ذرائع میں حتمی یقین بلکہ ایمان رکھنے والوں کے بغیر ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ سٹیل کا تصور تو اس سے بھی بہت آگے تک پھیلا ہوا تھا۔

کھلے ذرائع کے پہلے سمپوزیم میں اس نے کہا: ''ذرا سوچئے! شہریوں کا توسیع شدہ ایک تجزیاتی نیٹ ورکس اس کے مقابلے میں نجی شعبے میں یہی کام کرنے والے اور سرکاری تجزیہ کار......ان میں سے ہر ایک کی دوسرے تک رسائی اور فائلوں کا ممکن تبادلہ' باہمی دلچسپی کے موضوعات پر تیزی (کمپیوٹر) سے معلومات کے حصول کی سہولت اور ان سب آراء کو جلدی سے یکجا کرنے کا معاملہ۔ داخلی ذرائع اور ملٹی میڈیا' ڈیٹا کا حصول جس کی افادیت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اسے فوری طور سے عام کرنے کی سہولتیں موجود ہیں۔ یہ سب کچھ ہاتھ میں ہو تو بات کہاں سے کہاں تک پہنچ سکتی ہے۔'' اس نے اس بات پر ضرور زور دیتے ہوئے کہا: ''یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچنے کی میرے خیال میں ہم سب کو ضرورت ہے۔'' وہ جاسوسی کے لئے معاشرے میں موجود تمام تقسیم شدہ علم کو ضروری قرار دیتا ہے۔

لیکن اس کی تخیلی پرواز یہیں تک محدود نہیں ہے۔ سٹیل اس سے بھی زیادہ کا خواہش مند ہے' وہ قومی جاسوس کو قومی مقابلہ آرائی کے ساتھ ملانا چاہتا ہے......وہ جاسوسی کو ایک تسلسل میں یا توسیعی قومی ترتیب کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے جس میں ہمارا رسمی تعلیمی پراسس' ہماری غیر رسمی تہذیبی قدریں' ہماری انفرمیشن ٹیکنالوجی کی ٹھوس مہارت' انفرمیشن کے تبادلے پر غیر رسمی' سماجی اور پیشہ ورانہ نیٹ ورکس اور ہمارے حکومتی نظام کی جھلکیاں بھی کچھ شامل ہوں۔ قصہ مختصر یہ کہ وہ جاسوسی کے شعبے کو اندازوں پر مشتمل ایسے ذریعے کی صورت میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ جو صرف اوپری سطح کے مٹھی بھر افراد کے لئے کارآمد ہو بلکہ وہ اسے معاشرے کے علمی نظام کا فعال حصہ بنانے کا آرزومند ہے۔

سٹیل کی تخیلی اڑان بہت سے لوگوں کے دل میں ارتعاش پیدا کرے گی۔ بہت سے دوسرے ان خیالات کو سننے کے بعد کانپنا اور لہرآنا شروع کر دیں گے۔ اس میں ایسے شگاف ہیں اور اس نوع کے گڑھے کھدے ہوئے ہیں کہ تنقید کرنے والے انہیں کو پکڑ کر بیٹھ جائیں گے۔ اس کا سیدھا صاف طریقہ بہت سے لوگوں کو اپ سیٹ بھی کر سکتا ہے اور اس کے خواب' متعدد خوابوں کی طرح شاید ہی تعبیر کے حامل ہوں لیکن اس نے جاسوسی کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کام کو ایک نئے فریم ورک میں لا کر رکھ دیا ہے کہ اس سے قبل کسی نے اس پیمانے پر اس بارے میں بات تک نہیں کی۔ اس کی مہم ایک ایسی طاقت کی نشاندہی کرتی ہے جو جاسوسی کو تیسری لہر کے زمانے کی حقیقتوں سے آشنا کرنا چاہتی ہے۔

مستقبل میں جنگ اور تدارک جنگ کے بارے میں جاسوسی اور اس کے متعلق یہ فیصلے کئے بغیر کہ یہ علمی حکمت عملی میں کیسے فٹ بیٹھی ہے' پریشانی کا اظہار بلاشبہ سعی لاحاصل ہے۔ جاسوسی کے ڈھانچے کی تعمیرنو اور اس کا نیا تصور......بشمول فوجی جاسوسی کے......عملی حکمت عملیوں کی طرف بڑھتا ہوا ایک قدم ہے جس کی ضرورت جنگ یا کل کی جنگوں کے بارے میں سوچنے اور غور وفکر کرنے سے ہے۔

توڑنے مروڑنے والے

مستقبل میں ہونے والی لڑائیوں سے متعلق سوچنے والے لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ ان میں سے بعض میڈیا کے میدان میں لڑی جائیں گی۔ یہ امر واضح ہے کہ امریکہ کے لئے ایک جامع علمی حکمت عملی کی تشکیل اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک وہ اپنے جاسوسی کے نظام کو صحیح خطوط پر استوار نہیں کر لیتا اور جب تک وہ یہ مرحلہ طے نہیں کرتا' اسے میڈیا کے میدان میں زیادہ بڑے اور الجھے ہوئے مسائل کا سامنا رہے گا۔ یوں تو بقول ڈیفنس جنرل کے نیل منرو کے محکمہ دفاع کو میڈیا کے ساتھ ربط ضبط بڑھانے کے سلسلے میں بڑے محدود اختیارات حاصل ہیں۔ اس لئے اس شعبے میں امریکی فوج کی راہ میں ٹھوس اینٹوں کی ایک دیوار کھڑی ہے۔ امریکی آئین اور اسی طرح اس کی تہذیبی اور سیاسی روایات احتسابی کارروائیوں کی ایک حد مقرر کرتی ہیں اور یاد رکھئے کہ پروپیگنڈہ بیشتر امریکیوں کے نزدیک ایک گندہ لفظ ہے۔

اس لئے ایسی صورت میں جب فوج کو یہ معلوم ہے کہ جنگی خبروں کو مناسب شکل دینے یا اپنے مطلب کے مطابق ڈھالنے کا معاملہ اتنا ہی اہم ہے جتنا اہم دشمن کے ٹینک کو تباہ کرنا ہے' خاکی وردی میں ملبوس' خبروں کی توڑ پھوڑ کرنے والوں سے کوئی بھی محبت نہیں کرتا۔ بالخصوص امریکی پریس تو اس سے دور رہنے ہی میں عافیت سمجھتا ہے۔

خلیج کی جنگ کے بعد امریکی ذرائع ابلاغ اور پینٹا گان کے درمیان خبروں سے متعلق

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

موخرالذکر کی رپورٹروں کو زمینی جنگ سے دور رکھنے کی پالیسی کی وجہ سے سخت قسم کا تنازعہ کھڑا ہو گیا تھا' لیکن آنے والے زمانے میں اس نوع کی کشیدگی کے کہیں زیادہ بڑھنے کے امکانات ہیں' علمی حکمت عملیاں ترتیب دینے والے یہ حقائق فراموش نہیں کر سکتے۔

جرمنی کا تمغہ

مؤرخ فلپ ٹیلر لکھتا ہے کہ: ''پروپیگنڈہ کے فن نے قدیم یونانیوں کے عہد میں نشوونما پائی۔'' لیکن بلوغت کی منزل تک صنعتی انقلاب کے زمانے میں یہ اس وقت پہنچا جب ذرائع ابلاغ کو ترقی ملی۔ یوں دوسری لہر کے زمانے کی جنگی نوعیت یک طرفہ خبروں، بناوٹی تصویروں اور روسیوں کے بقول ''ساسکی ادوکا'' (دھوکہ دہی) اور ڈس انفرمیشن وغیرہ کو وسیع پیمانے پر میڈیا کے ذریعے پھیلانے کی محتاج بنی رہی۔ کل جب تیسری لہر کے زمانے کی جنگی قسم ترقی کرے گی تو یہ امر یقینی ہے کہ پروپیگنڈہ اور اسے پھیلانے والا میڈیا دونوں ہی کو انقلاب کے عمل میں سے گزرنا پڑے گا۔

یہ جاننے کے لئے کہ خبروں کو اپنی ضرورت کے مطابق کیسے ڈھالا جاتا ہے، ہمیں مغربی پروپیگنڈے کے کھیل کی مختلف سطحوں کا ادراک کرنا ہوگا۔ مثال کے طور پر حکمت عملی کی سطح پر شاطرانہ پروپیگنڈہ' اتحاد بنانے یا توڑنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران جرمنی اور برطانیہ دونوں نے امریکی مدد حاصل کرنے کی کوششیں کیں۔ اس میدان میں برطانوی علمی جنگجو جرمنوں سے کہیں آگے تھے اور انہوں نے ہر علامتی واقعہ کی مدد سے جرمنوں کو کامیابی کے ساتھ امریکیوں کا مخالف بنا کر پیش کیا۔ جب ایک جرمن یوبوٹ نے امریکی بحری جہاز کی غرقابی کا جشن منانے کے لئے کانسی کا ایک تمغہ تیار کیا، برطانیہ نے اس کی نقلیں تیار کرائیں اور تقسیم کرنے کے لئے لاکھوں کی تعداد میں امریکہ بھجوا دیں۔ ساتھ ہی جرمن پروپیگنڈہ پر مشتمل ایک اشتہار بھی بھیج دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر امریکہ اس جنگ میں برطانیہ کی مدد پر آ گیا جس سے جرمنی کی شکست کا آغاز ہوا۔ جنگ میں امریکہ کی شمولیت کے لئے اسباب میں یقیناً اس کے مالی اور دیگر مفادات کا بھی دخل ہوگا اور وہ محض مخصوص برطانوی پروپیگنڈے اور چال بازیوں کی وجہ ہی سے میدان میں نہیں کود پڑا تھا لیکن اس فیصلے میں بہرحال اس پروپیگنڈے سے امریکی رائے عامہ کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

متاثر ہونے اور یوں امریکی انتظامیہ کو اس فیصلے پر پہنچنے میں مدد دینے کے امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

حالیہ زمانے میں اس کی مثال خلیج کی جنگ کے دوران میں ملتی ہے جب صدر بش (سینئر) نے اس جنگ میں اقوام متحدہ کی موثر حمایت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ یہ ثابت کرنے کی مہم کامیابی سے چلائی کہ امریکہ یہ جنگ اپنے مفادات کے لئے نہیں لڑ رہا بلکہ محض عالمی ادارے کا ساتھ دے رہا ہے۔ اس حکمت عملی کا مقصد عراق کو سفارتی طور پر تنہا کرنا بھی تھا جس میں امریکہ کامیاب رہا۔

پروپیگنڈہ سے عالمی سطح پر بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً صدام حسین کی حکومت جارحانہ حد تک سیکولر تھی، اسلامی ہرگز نہیں تھی۔ لیکن اس کی وزارت اطلاعات بڑے تسلسل کے ساتھ اسلامی کارڈ کھیلتی رہی جس میں عراق کو مذہب کے محافظ اور سعودی عرب کو اسلام کے غدار کے طور پر پیش کیا جاتا رہا۔

آخرکار جوڑ توڑ اور حکمت عملی کے طور پر امریکہ کے جنگی نفسیاتی ماہرین نے کویت میں موجود عراقی سپاہیوں کے لئے تقریباً تین کروڑ اشتہارات فضا سے پھینکے جن میں 33 کے قریب میں مختلف نوع کے پیغامات ان تک پہنچانے کا اہتمام کیا گیا تھا اور ہتھیار ڈالنے کی ترغیب کے ساتھ قیدیوں کی حیثیت میں ان سے بہتر سلوک کے وعدے وعید بھی کئے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اپنے ہتھیار چھوڑنے کا مشورہ دیا گیا تھا اور آنے والے شدید حملوں کی دھمکی بھی۔

خبروں کو مرضی کے مطابق ڈھالنے والے شاطروں کو معلوم ہے کہ حکمت عملی، آپریشنل صلاحیتوں یا شاطرانہ کاروایئوں میں سے کس کو روبہ عمل لا کر کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ پھر وہ اس کے مطابق قدم آگے بڑھاتے ہیں۔

ذہن بدلنے والے چھ اوزار

خاکی وردی میں ملبوس جنگی خبروں کو مرضی کے مطابق ڈھالنے والے سالہا سال تک اور بار بار چھ اوزاروں سے کام لیتے رہے۔ یہ ان شکنجوں کی طرح کے ہیں جنہیں ذہنی تبدیلیاں عمل میں لانے کے لئے تیار کیا گیا ہو۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان میں سے ایک جس سے بہت کام لیا جاتا ہے، کسی پر ظلم کرنے کا الزام عائد کرنا ہے۔ خلیج کی جنگ میں جب کویت کی ایک پندرہ سالہ لڑکی نے کانگرس کے سامنے اس امر کی شہادت دی کہ کویت میں عراقی فوجی بچوں کو قتل کر رہے ہیں اور ''ان کیو بیٹرز'' عراق لے جانے کے لئے چرا رہے ہیں تو اس بیان نے بہت سے لوگوں کے دلوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ لیکن دنیا کو یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا گیا کہ یہ لڑکی واشنگٹن میں مقیم کویت کے سفیر کی بیٹی اور وہاں کے شاہی خاندان کی رکن بھی ہے۔ نہ ہی لوگوں کو یہ بتایا گیا کہ اس کی شہادت کا اہتمام عوامی رابطوں کے لئے کام کرنے والی ایک تجارتی کمپنی کے ذریعے کویت کی حکومت کے ایماء پر ہوا ہے۔

بہرحال پروپیگنڈہ ہمیشہ غلط بھی نہیں ہوتا۔ کویت میں عراقی مظالم کی وسیع داستانیں اس وقت درست ثابت ہوئیں جب عراقی فوجوں کی واپسی کے بعد اخباری رپورٹر وہاں پہنچے، لیکن ظلم کی داستانیں سچی اور جھوٹی دونوں جنگی پروپیگنڈے کا موثر ہتھیار رہی ہیں۔ جنگی پروپیگنڈے کی تاریخ پر مشتمل ایک نفیس کتاب ''میونیشن آف دی مائنڈ'' میں ٹیلر لکھتا ہے، ''اتحادیوں کے پروپیگنڈے بازوں نے ایرانی مدد کے عفریتوں کی یاد تازہ کر دی اور یوں یہ سپاہیوں کے مظالم بیان کرتے ہوئے عورتوں کے ساتھ ان کی زیادتیوں، بچوں کی شکلیں مسخ کرنیکے واقعات اور گرجا گھروں کو لوٹنے اور مسمار کرنے کی داستانیں بیان کرتے رہے۔''

نصف صدی بعد ویت نام میں ظلم کی داستانیں بہت اہمیت اختیار کر گئیں۔ اس عرصے میں امریکی سپاہیوں کی طرف سے مائی لائی کے قتل عام کی داستانوں نے امریکی رائے عامہ کے بہت بڑے حلقے کو متاثر کیا اور جنگ مخالف جذبات بھڑکائے گئے۔ سرب ارو بوسنیا کے تصادم میں بھی ظلم کی سچی جھوٹی داستانوں سے فضا معمور رہی۔

دوسرا عام اوزار جس سے جنگوں میں کام لیا جاتا ہے وہ تصادم یا جنگ میں مضمر خطرات کا مبالغہ آمیز تذکرہ ہے۔ سپاہیوں اور شہریوں کو بتایا جاتا ہے کہ ہر وہ چیز جو انہیں عزیز ہے، خطرے میں ہے۔ خلیج کے تصادم کی تصویر کشی کرتے ہوئے صدر بش نے اسے دنیا کے لئے بہتر نظام کے قیام کی ضرورت بتایا۔ خطرے میں صرف کویت کی آزادی، تیل کی عالمی بہم رسانی یا صدام کی ممکنہ ایٹمی صلاحیتوں کے خاتمے کی کوششیں ہی نہیں تھیں بلکہ پوری عالمی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تہذیب کو درپیش خطرات کی دہائی دی جاتی رہی۔ جہاں تک صدام کا تعلق ہے یہ جنگ ایران، عراق تصادم کے دوران کویت کواس کی طرف سے اربوں ڈالر کے قرضے واپس نہ کرنے کی وجہ سے برپا نہیں ہوئی تھی بلکہ صدام کے بیان کے مطابق یہ جنگ ''عرب قوم پرستی'' کے مستقبل کے تحفظ کی خاطر لڑی جا رہی تھی۔

جنگی خبروں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے والے معالجوں کے بیگ میں ذہن بدلنے والا تیسرا آلہ مخالف کو شیطان یا غیر انسانی صفات کا حامل ثابت کرنا ہوتا ہے۔ صدام حسین کے لئے اس کے دشمن اس کے ہمسایہ ایران اور امریکہ میں سے امریکہ شیطان اعظم ہے اور بش وائٹ ہاؤس کا شیطان ہے۔ اس کے مقابلے میں بش کے لئے صدام ہٹلر تھا۔ بغداد ریڈیو امریکی پائلٹوں کو ''چوہے'' اور غارتگری پھیلانے والے وقتی درندوں کے خطاب سے نوازتا رہا۔ فضائی حملے کو ایک امریکی کرنیل نے کمپنی میں رات کے وقت داخل ہونے کی کیفیت سے مشابہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ آپ کو دیکھتے ہی کچن میں موجود کاکروچ وہاں سے بھاگنے لگتے ہیں اور آپ انہیں مارنا شروع کر دیتے ہیں۔ عراقیوں پر ہمارے یہ فضائی حملے ایسے ہی ہیں۔ ان اوزاروں میں سے چوتھا آلہ، انسانوں کی علیحدہ خانوں میں تقسیم ہے، ''جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارے خلاف ہے۔''

پانچواں اوزار رضائے الٰہی کا ہے، اگر صدام اپنے عمل کو اسلام کے پردے میں لپیٹ کر انجام دینے کی بات کرتا ہے تو صدر بش بھی اللہ کی مدد طلب کرتا ہے۔ مراکش کی سماجی کارکن فاطمہ مہرالنساء کی نشان دہی کے مطابق ''خدا امریکہ کی حفاظت کرے'' جیسے جادوئی الفاظ جو امریکی پروپیگنڈے کے جزو بن چکے ہیں، جب یہ مسلم دنیا کے گلی محلوں میں لوگوں کے کانوں تک پہنچتے ہیں تو ان کا ان پر عجیب وغریب اور ناقابل بیان اثر پڑتا ہے۔ شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے عام لوگ جو امریکہ کو مادہ پرستی اور کفر کا قلعہ سمجھتے ہیں اس وقت سخت حیرت زدہ تھے جب بش نے خدا سے مدد مانگی۔ کیا امریکی واقعی خدا کو مانتے ہیں؟ ان لوگوں کا خلجان کچھ اور بھی بڑھ گیا جب خدا کو جمہوریت کی نعرہ بازی کے ساتھ نتھی کرنے کی کوشش کی گئی، کیا جمہوریت بھی کوئی مذہب ہے؟

آخری اور شاید سب سے طاقتور ذہنی شکنجہ ردّ پروپیگنڈہ ......یعنی ایسا پروپیگنڈہ ہے جو فریق مخالف کے پروپیگنڈے کو مسترد کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ خلیج کی جنگ میں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اتحادیوں کے ترجمانوں نے مسلسل اور صحیح طریقے سے نشان دہی کی کہ صدام حسین کا عراق کے پریس پر مکمل کنٹرول ہے اور اس لئے سچائی تک عراقی عوام کی رسائی کو ناممکن بنا دیا گیا ہے اور یہ کہ عراق کی فضا جھوٹ سے پُر ہے۔ رڈ پروپیگنڈہ اس لئے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں کسی ایک کہانی کے بطلان کی بجائے دشمن کی طرف سے آنے والی ہر شئے کو مشتبہ بنا دیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد جھوٹ کی پرچون فروشی کی بجائے اس کی ہول سیل تجارت ہے۔

فوجی پروپیگنڈہ ٹیکنیک کی اس فہرست سے جو حقیقت کھل کر واضح ہوتی ہے وہ اس کا دوسری لہر کے زمانے کا کردار ہے۔ ذہنی شکنجوں کے ان سب نمونوں میں سے ہر ایک کو ذرائع ابلاغ کے ذریعے وسیع پیمانے پر پھیلانے اور وسیع معاشرے میں جذبات کو انتشار کی گرفت میں لانے کے نکتہ نظر ہی سے ترتیب دیا گیا ہے۔

نیونازی اور مخصوص اثرات

جنگی خبروں کو مرض کی شکل دینے والوں کے ''کلاسیکل اوزاروں'' سے ان ملکوں میں شاید بدستور کام لیا جاتا رہے گا جن میں دوسری لہر کے زمانے کے میڈیا کا دور دورہ ہے اور جو مرکزیت کی گرفت میں ہیں۔ یہی ہتھیار تیسری لہر کے معاشرے، دوسری لہر کے معاشروں کے خلاف بروئے کار لا سکتے ہیں لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تیسری لہر کے معاشروں میں ذرائع ابلاغ کا انقلاب سارے قواعد کو ازسرنو تحریر کرنے میں مصروف ہے۔

تیسری لہر کی معیشتیں ابتداً ایسے چینلوں کو وسیع پیمانے پر ترقی دینے کے لئے مجبور ہوتی ہیں جن کے ذریعے انفرمیشن اور ڈس انفرمیشن دونوں پھیلائی جا سکیں۔ موبائل ٹیلی فون، ذاتی کمپیوٹر، فوٹو کاپی کی مشینیں، فیکس، ویڈیو کیمرے اور ڈیجیٹل نیٹ ورکس یہ مواقع فراہم کرتے ہیں کہ ان کے ذریعے سے آوازوں کے وسیع ذخیروں، اعداد و شمار اور نقشہ جات وغیرہ کا تبادلہ گونا گوں ناکارہ اور عدم مرکزیت کے تحت کام کرنے والے چینلوں کے ذریعے کیا جا سکے اور یہ ساری ایسی چیزیں ہیں جو اکثر حکومتوں اور فوجوں کو بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں۔

کمپیوٹر کی بنیاد پر تیار کئے جانے والے ہزاروں ''بلیٹین بورڈ'' بھی ان دنوں سامنے آ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہے ہیں جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے کروڑوں افراد کے درمیان رابطے کا کام دے رہے ہیں اور انہیں جنس سے لے کر سٹاک مارکیٹ تک کے امکانات آگے بڑھانے میں گفتگو کرنے کا موقعہ مہیا کرتے ہیں۔ ایسے بہت سے سسٹم بہت بڑی تعداد میں قومی سرحدوں کونظرانداز کرتے ہوئے برابر ابھر رہے ہیں اور ایسے گروہوں کی تشکیل میں مدد دے رہے ہیں جو فلکیات ، موسیقی اور ماحولیات سے لے کر نیونازی فوجوں کی سرگرمیوں سے ملتی جلتی کاروائیوں اور دہشت پسندی تک ہر چیز کا احاطہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے پر حاوی ہونے اور انٹرنیٹ ورکس جن پر ان نظاموں کا انحصار ہے، انہیں اب ختم کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ پھیلتے ہوئے نئے میڈیا کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سخت مرکزیت کے شکار اس پروپیگنڈے کو جو اوپر سے نیچے تک وار کرتا ہے ختم کر کے اب زیادہ تر اس کا زور نیچے سے اوپر کی طرف ہو جائے گا۔

نیا میڈیا طاقت کو منتشر کرنے کے حق میں ہے۔ ایک واحد وڈیو ٹیپ جسے لاس اینجلس کے ایک غیر پیشہ ور پولیس اہل کار نے بنا رکھا تھا اور جس میں ایک کالے آدمی پر پولیس تشدد کی تفصیل دکھائی گئی تھی۔ اتنے بڑے فسادات کا موجب بنا جس کے نتیجے میں چھوٹی سی جنگ میں ہونے والے نقصانات کے برابر جانی نقصان ہوا۔ مقامی اور قومی حکومتوں کی طرف سے طاقت کے ناجائز استعمال کے رکارڈ تیار کرنے کیلئے وڈیو کیمروں کا استعمال برابر بڑھ رہا ہے اور ان کی تیار کردہ تفصیلات اگر ٹی وی پر نہیں تو وڈیو کیسٹوں کے ذریعے وسیع پیمانے پر نشر کی جاتی ہیں۔ نئے میڈیا نے مرکزی کنٹرول کو کمزور کر دیا ہے۔ اس میں مزید صنف پیدا ہو جائے گا جب اسے استعمال کرنے والے مرکزی حکام سے بات کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

ریڈیو پر گفتگو اور ٹی وی کے ذریعے ہوم شاپنگ سے اس پراسس کے بڑھتے ہوئے اثرات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ٹی وی سیٹ کی جگہ آخرکار ایسے (غالباً وائرلیس) یونٹ لے لیں گے جو کمپیوٹر، سکینر، فیکس، ٹیلی فون اور ایک ایسے اوزار کی کارکردگی کو ملا کر جو مختلف ذرائع سے حاصل ہونے والے پیغامات کو یکجا کرے گا۔ ایک نئے نیٹ ورک کی شکل میں سامنے آئے گا اور کی بورڈوں کی جگہ یہ ٹیلی کمپیوٹرز قدرتی زبان میں آپریٹ ہوں گے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ سبھی حقائق ایک ایسی دنیا کی طرف اشارہ کناں ہیں جس کے کروڑوں افراد کے پاس ہالی ووڈ کی طرح کے خصوصی اثرات پیدا کرنے کی قوت ہے۔ ایسی فریب کاری کا تاثر جو اصلاً حقیقت پر مبنی ہے اور ایسے ہی دوسرے ممکنہ اثرات ...... یہ ایسی طاقت ہے جو کچھ عرصہ قبل تک نہ تو حکومتوں کے پاس تھی اور نہ ہی نگارخانوں کے پاس۔ دنیا اب الیکٹرانک کے زمانے سے قبل کی قومیتوں میں بٹی نظر آئے گی۔ یہ حسب سابق اسی طرح پسماندہ اور ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ اقوام میں تقسیم ہوگی جیسے پہلے تھی۔ ان میں ایسے ممالک بھی ہوں گے جن کے پاس حسب ضرورت ٹی وی سیٹ بھی نہیں ہوں گے اور وہ ہر قسم کی قلت کا شکار ہوں گے۔

برقی اطلاعات کے عہد میں بعض اقوام اپنی روایتی ٹی وی نشریات پر گزارہ کر رہی ہوں گی جو عالمگیر سطح پر ٹیلی کاسٹ ہوتے ہیں اور نیٹ ورک کے ذریعے دستیاب ہیں اور ایسی اقوام بھی ہوں گی جو اس نوع کی نشریات کو بہت پیچھے چھوڑ کر کہیں آگے نکل چکی ہوں گی۔

میڈیا بطور سٹار

جب ہم خلیج کی جنگ پر نظر ڈالتے ہیں، یعنی اس جنگ پر جس میں پہلی بار تیسری لہر کے زمانے کی جگ آزمائی سے کام لیا گیا تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ میڈیا کوریج میں اس جنگ کو ایک طرح سے مرکزی نکتے کی حیثیت دینا شاید درست نہ ہو، کیونکہ اس نظارے میں میڈیا بجائے خود سٹار بن کر ابھرا ہے۔ ایک سابق میجر جنرل میری سمتھ کے بیان کے مطابق جو خود بھی سی این این کی ایک شخصیت کے طور پر معروف ہے۔ ''خلیج کی جنگ کے چھ ہفتے کے دوران لوگوں نے روزانہ اتنی بڑی تعداد میں اور اتنی طویل مدت تک ٹی وی دیکھا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔''

اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم، مگر کچھ اور تبدیلیاں اس سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ میڈیا دوسرے ذرائع کی آمیزش سے ایک دوسرے پر اثرانداز ہونے کا سامان بہم پہنچا رہا ہے۔ خود حوالگی کا نظام جس میں خیالات، انفرمیشن اور تصورات ایک سے دوسرے ذریعے کی طرف بہہ رہے ہوں۔ مثال کے طور پر ٹی وی کی جنگی خبروں کے ٹوٹے اخبار کے ایڈیٹروں کو جنگ کی خبریں ترتیب دینے کی راہ سجھاتے ہیں۔ فوج کے متعلق فلمیں جیسے کہ مثلاً ''اے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نیو گڈ مین'' مطبوعہ تبصروں اور ریڈیو ٹی وی انٹرویوز کی محرک بنتی ہیں۔ ٹی وی کے مزاحیہ پروگرام، کام میں مگن اخباری فوٹو گرافر، اخباری تصویریں جو کسی نہ کسی اخباری رسالے کے لئے اتاری گئی ہوں۔ بیشتر ٹی وی کے تراشوں کا حوالہ بن جاتی ہیں، کیونکہ اب زیادہ تر سبھی کا انحصار کمپیوٹر، فیکس مشینوں، مصنوعی سیاروں اور ٹیلی کام نیٹ ورکس پر ہے اور یہ سب ایک دوسرے میں ضم ہو کر ایک مربوط میڈیا سسٹم کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

اس ادھورے ناپختہ سسٹم میں ٹیلی ویژن (صرف موجودہ حالات میں) ہی نیوز ایجنڈا، بالخصوص جنگی سرگرمیوں کی کوریج کے میدان میں ترتیب دیتا ہے۔ اگرچہ امریکہ کے بعض ٹی وی نیوز ڈائریکٹر اب بھی کچھ خصوصی سیاسی اور سفارتی خبروں کو نشر کرنے کے فیصلے سے پہلے نیویارک ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ کی سرخیوں پر ضرور نظر ڈالتے ہوں گے مگر بہت سے دیگر معاملات میں مطبوعہ الفاظ کا اثر برابر کم ہوتا نظر آ رہا ہے۔

اگنیشور یمونیٹ نے ''لاموندے ڈپلومیٹک'' میں لکھا تھا کہ ''خلیج کی جنگ کے ساتھ ہی ٹیلی ویژن نے اقتدار پر قبضہ کر لیا ہے اور نیا سٹائل ترتیب دینے کے ساتھ ساتھ تحریری صحافت کو بھی نئی صورت شکل دے دی ہے۔ ٹی وی نے اپنے آپ کو دوسرے ذرائع ابلاغ پر نافذ کر دیا ہے۔ ایمونیٹ کہتا ہے، ''اس کی وجہ محض یہ نہیں کہ یہ نظارہ کرانے اور تماشہ دکھانے کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ اس کی وجہ دوسروں کے مقابلے میں تیز رفتاری ہے۔'' ہم تھوڑی ہی دیر بعد اس مسئلے کی طرف دوبارہ مڑیں گے۔ اس سے قبل بہر حال ہم یہ ضرور پوچھنا چاہیں گے کہ فوجی پروپیگنڈے کے ماہرین، تیسری لہر کے زمانے کے مواصلات کے ساتھ اپنے آپ کو کیسے منسلک کریں گے۔

قطعی پیغام

کچھ چیزیں بڑی صاف اور واضح ہیں۔ قطعیت کے ساتھ نشان دہی کیلئے انفرمیشن اتنی ہی اہم ہے جتنے کہ قطعیت کے ساتھ اہداف پر نشانہ لگانے والے ہتھیار اور نیا میڈیا اس امر کو غیر یقینی کی حد تک ممکن بنا دے گا۔ تیسری لہر کے معاشروں میں ناظرین کو ہدف بناتے ہوئے کل کا میڈیا ماہر، کل کی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کی طرح پیغامات کے اختصار پر توجہ دے گا۔ جس میں ناظرین کے مختلف گروپوں کے لئے اس پیغام کو مختلف اشکال میں ڈھال

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کر پیش کیا جائے گا......ایک شکل افریقی امریکیوں کے لئے ، دوسری ایشیائیوں کے لئے، پھر ایک اور ڈاکٹروں کیلئے اور پھر تنہا ماؤں کے لئے حسب ضرورت بلیٹن تیار ہوں گے۔

ظلم کی فرضی داستانیں بھی کسی نہ کسی دن اس طرح ترتیب دی جائیں گی جس میں ظلم کا شکار ہونے والوں کے حالات مختلف شکلوں میں حسب ضرورت پیش کئے جائیں گے تاکہ ناظرین کے ہر حلقے کی طرف سے اس پر ہمدردی یا نفرت کے ردّعمل کا اظہار ہو۔

اس قسم کی حد بندی بہرحال آخری مقصد، انفرادیت کے حصول کے راستے میں نصف قدم بڑھانے کے برابر ہے۔اس منزل پر پہنچنے کے بعد گروپ کی بجائے کسی ایک شخص پر زیادہ سے زیادہ اثرانداز ہونے پر توجہ ہوگی۔ آج کے براہ راست کاپی رائٹر کے تصور کو ترقی اور توسیع دے کر اور ہمہ جہتی حکومتی اور تجارتی ڈیٹا مراکز سے کام لے کر ایک فرد کے پروفائیل کی تکمیل کی جائے گی۔ فرد کے کریڈٹ کارڈ، ٹیکس فائلوں اور طبی رازوں سے حاصل ہونے والے اعداد و شمار سے مسلح ہو کر جنگی خبروں کو مرضی کے مطابق ڈھالنے والا ایک معالج آخرکار ایک فرد کو ہدف بنانے میں یقیناً کامیاب ہوگا اور تحریر، ٹیلی ویژن، ویڈیو گیمز، ڈیٹا مراکز اور ابلاغ کے دیگر ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات، مربوط اور موثر پیغامات کی صورت میں اس تک پہنچا دی جائیں گی۔

جنگ کے حق میں یا اس کے خلاف ہونے والا پروپیگنڈہ جو دنیا کے دوسرے سرے سے روانہ ہوتا ہے اور جس میں بعض اوقات اصل ذرائع مخفی رکھے جاتے ہیں، آئندہ بڑے شاطرانہ طریقے سے خبروں میں سمو دیا جائے گا۔ بالکل اس طرح جس طرح ان دنوں تفریحی اجزاء کو خبروں کا حصہ بنا دیا جاتا ہے۔معمولی تفریحی پروگراموں کو بھی اس طرح ترتیب دیا جائے گا کہ ان میں ہر فرد یا خاندان کی ضرورت کے مطابق پروپیگنڈے کا پہلو موجود ہو۔

بظاہر آج ناممکن اور مہنگا نظر آنے والا یہ نظام یقیناً قابل عمل ہو جائے گا جب تیسری لہر اور اس کا ٹیلی کمیونیکیشنز سسٹم پوری طرح ترقی کرے گا۔

بروقت رپورٹنگ

وسیع پیمانے پر کئے جانے والے کاموں کو محدود کرنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ وقت

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی اصل اہمیت کا مسئلہ بھی شدت اختیار کر سکتا ہے اور اس کی وجہ سے فوج اور میڈیا کے درمیان کشیدگی میں شدید اضافہ متوقع ہے۔

1815ء میں اور یان کی جنگ میں دو ہزار امریکی اور برطانوی فوجیوں نے ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار دیا کیونکہ برسیلز میں دو ہفتے قبل ہونے والے معاہدہ امن پر دستخط ہونے کی خبر ان تک بروقت نہیں پہنچ سکی تھی۔ خبریں اس زمانے میں چیونٹی کی چال چلتی تھیں۔

صنعتی دور میں یہ رفتار ضرور بڑھی، مگر اس وقت بھی یہ الیکٹرانک دور کے قبل کے زمانے کی رفتار ہی تھی۔ ذرائع ابلاغ کی وسعت پذیری کے زمانے میں ایک نئے پیشے کا ظہور ہوا......جنگی نامہ نگار......بہت سے جنگ جو صحافی اس پیشے سے منسلک رہے۔ ونسٹن چرچل جس نے بوئر کی جنگ میں برطانوی فوجوں کے ساتھ جنگ کی رپورٹنگ کی اور بعدازاں برطانیہ کا دوران جنگ کا عظیم وزیراعظم بھی بنا۔ رچرڈ ہارڈنگ ڈیوس نے ہسپانیہ اور امریکہ کی جنگ میں یہی خدمات انجام دیں۔ ارنسٹ ہمنگوے نے بھی ہسپانیہ کی خانہ جنگی کی رپورٹنگ میں بڑا نام کمایا۔ پھر دوسری جنگ عظیم میں ارنی پائل نے اپنے وقت میں اس شعبے میں زندہ روایت کی حیثیت اختیار کر لی لیکن ان سب لوگوں کی بھیجی ہوئی رپورٹیں جس وقت طبع ہوتی تھیں وہ جنگیں جن کی تفصیل ان میں ہوتی، ختم ہو چکی ہوتیں۔ میدان جنگ سے بھیجی جانے والی ان کی رپورٹیں بہرحال کسی اصل جنگ یا اس کے نتائج پر ہرگز اثرانداز نہیں ہو سکتی تھیں۔

لیکن آج کی لڑائی اور امن کے معاہدے وقوع پذیر ہونے سے قبل ہی خبر بن جاتے ہیں۔ جس وقت امریکی فوجی دستے صومالیہ پہنچے، ٹی وی کیمروں کی فوج ان کو خوش آمدید کہنے کے لئے ساحل پر پہنچ چکی تھی۔ مختلف ملکوں کے صدور اور وزرائے اعظم کو دنیا میں ہونے والی کاروائیوں سے آگاہی سفارتی ذرائع سے ہونے والی معلومات سے بہت پہلے ٹیلی ویژن کے ذریعے ہو جاتی ہے۔ اب قومی رہنما پیغامات اپنے سفیروں کے ذریعے ہی نہیں پہنچاتے بلکہ براہ راست سی این این کو روانہ کر دیتے ہیں۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ ان کے ہم پلّہ دوسرے ملک کے رہنما اور حریف سی این این ٹی وی پروگرام دیکھ رہے ہوں گے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور اپنے طور پر کیمرے ہی کے ذریعے ان کی بات کا جواب بھی دے دیں گے۔

تل ابیب پر عراق کے سکڈ میزائلوں کے حملے کے دوران میں، اسرائیل کی فوج اس حقیقت سے باخبر تھی کہ سی این این کے پروگرام بغداد میں بڑی توجہ سے مانیٹر کئے جاتے ہیں۔ اس کو یہ پریشانی تھی کہ میزائلوں کے اہداف کی سی این این جو تصویریں دکھا رہا ہے، ان سے عراقیوں کو زیادہ قطعیت کے ساتھ اہداف کا نشانہ بنانے میں مدد ملے گی۔ خبروں کی فراوانی ہی نے ان کی اہمیت بڑھا دی تھی۔

کرنل ایلن کمپین نے ''معلومات سچائی اور جنگ'' میں لکھا ہے: ''سٹلائٹ ٹیکنالوجی، اجتماعات کو سنسر شپ کا مسئلہ بنا دیتی ہے۔'' سٹلائٹ کے ذریعے تجارتی اور فوجی جاسوسی کی وجہ سے لڑنے والی فوجوں کیلئے میڈیا سے کچھ بھی چھپانا ممکن نہیں رہے گا اور ویڈیو سکرین پر ہر سمت سے جمی ہوئی نظریں جنگ کے علاقے سے پل پل بعد نشر ہونے والی خبریں جنگی حکمت عملی اور اس کی قوت محرکہ میں حقیقی تبدیلیوں کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ کمپین کہتا ہے: ''یہ صورت حال رپورٹروں کی غیر جانبدارانہ حیثیت تبدیل کر کے خواہ ان کی مرضی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو انہیں براہ راست جنگ میں شرکت پر مجبور کر سکتی ہے۔''

کمپین کا اصرار ہے کہ جمہوری ملکوں کے شہریوں کو یہ حق حاصل ہے اور یہ ان کی ضرورت بھی ہو سکتی ہے کہ انہیں اپنے آس پاس ہونے والے واقعات کا علم ہو لیکن وہ پوچھتا ہے کہ کیا انہیں یہ سب کچھ بروقت جاننے کی ضرورت ہے؟''

صحیح یا غلط وقت

نیا میڈیا حقیقت کو تبدیل نہیں کرتا بلکہ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ یہ حقیقت سے متعلق ہمارے شعور......اور یوں اس سارے پس منظر کو جس میں جنگ اور امن کے پروپیگنڈے کا مقابلہ ہوتا ہے، بدل کر رکھ دیتا ہے۔

صنعتی انقلاب سے پہلے کے زمانے میں کسان آبادی کی اکثریت ان پڑھ مقامی حالات میں گھری ہوئی اور تنگ نظر ہوتی تھی اور وہ وقت اور مقام سے دوری پر وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی تصور آفرینی کے لئے مسافروں، کہانیوں، مذہبی عقیدوں اور اوہام اور داستانوں پر انحصار کرنے پر مجبور تھی۔ دوسری لہر کے زمانے میں میڈیا کی وسیع کارکردگی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دورافتادہ مقام اور وقت کے تقاضوں کو لوگوں کے قریب تر لے آئی اور انہیں ''تم وہاں موجود ہو'' کا احساس دلا کر خبر کے صحیح مقاصد سے آگاہ بھی کیا۔ دنیا کی تصویر کشی اب زیادہ حقیقی روپ میں کی جانے لگی۔

اس کے مقابلے میں تیسری لہر کے زمانے کے میڈیا نے حقیقی واقعات کو غیر حقیقی شکل دینا شروع کر دی ہے۔ ٹیلی ویژن کے ابتدائی نقاد، سوپ آپرا کے اس متبادل، ڈبے میں بند قہقہوں اور جھوٹے جذبات میں ناظرین کے استغراق پر واویلا کرتے رہے۔ آنے والے دور میں ان کی یہ پریشانی بالکل معمولی نظر آئے گی کیونکہ نیا میڈیا سسٹم، کلیتاً ایک خیالی دنیا تخلیق کرنے جا رہا ہے جو حکومتوں، فوجوں اور دوسرے تمام لوگوں کو ایسے نظر آئے گی جیسے کہ یہ حقیقی ہو۔ اس کے جواب میں ان لوگوں کی حرکات، میڈیا کی مرضی کے مطابق ہوں گی جنہیں ایک خیالی برقی مرصّع نگینے میں اس طرح جڑ دیا جائے گا کہ وہ ہمارے رویوں کے تعین میں رہنمائی کا فریضہ انجام دے گا۔

حقیقت کو خیالی جامہ پہنانے کی یہ کوشش صرف وہیں نہیں ملتی جہاں سے یہ متعلق ہے یعنی مزاحیہ پروگراموں اور ڈراموں میں بلکہ اس کا اظہار خبروں کی پروگرامنگ میں بھی ویسے ہی ہوگا جہاں اس سے مہلک ترین نتائج برآمد ہوسکتے ہیں، اس خطرے کے بارے میں دنیا بھر میں بحث پہلے ہی سے جاری ہے۔

کیسا بلانکا میں مراکش کے اخبار ''لاتیتین'' نے حال ہی میں ایک فکر انگیز مقالہ شائع کیا ہے جس میں اس نے فرانس کے مفکر باؤ ڈولرڈ کا حوالہ دیتے ہوئے رقم کیا ہے کہ ''خلیج کی جنگ حقیقی واقعہ ہونے کی بجائے مکر اور فریب کا ایک عظیم الشان مظاہرہ تھی اور یہ ساری فریب کاری میڈیا کے ذریعے کی گئی۔'' اخبار اس پر صاد کرتا ہے کہ حقائق کے خیالی پیکر کو اس میں اس طرح اجاگر کیا گیا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح غیر حقیقی نظر آئیں۔

وڈیو پر وڈیو

اس غیر حقیقی کردار کو خلیج کی جنگمیں بظاہر ''ٹیلی ویژن پر ٹیلی ویژن'' یعنی ٹی وی کے ذریعے کئی گنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔ دیکھنے والوں نے وڈیو سکرین پر تصویری شکلیں بار بار دیکھیں جن میں اہداف اور ان کو نشانہ بنانے کے مناظر دکھائے گئے تھے۔ فوج کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نزدیک میڈیا کا تخیلاتی کردار اتنا اہم تھا کہ امریکی بحریہ کے کمانڈر کے بیان کے مطابق حقیقی جنگ میں مصروف بمبار جہازوں کے پائلٹ بعض اوقات اپنے کاک پٹ کو دوبارہ یوں ترتیب دیتے تھے کہ وہاں موجود ویڈیو کیمروں کی مدد سے ان کی تصویری سی این این پر واضح نظر آئے۔

یہ بھی پتہ چلا ہے کہ کچھ ہتھیار بھی ٹی وی کے لئے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ پسندیدہ تھے۔ یوں ایچ اے آر ایم میزائل زیرِ دشمن کے دفاعی علاقے میں چھوٹے چھوٹے چھرے (گولیاں) برساتا ہوا بار بار دکھایا جاتا رہا۔ لیکن اس سے ہونے والے نقصان کو بہتر طور سے ٹی وی پر دکھانا ممکن نہیں تھا۔ کیمرے کی ضرورت تو ''رن وے'' پر پڑے ہوئے بڑے بڑے بم کریٹ ہوتے ہیں۔

نئی ٹیکنالوجی فریب دہی کے لئے جعلی پروپیگنڈے کا راستہ بھی ہموار کرتی ہے جس کے ذریعے افراد اور واقعات جو شدید طور پر دھندلے مگر حقیقی ہوتے ہیں، آپس میں گڈ مڈ ہو جاتے ہیں۔

نئے میڈیا کے لئے ایک ایسی جنگ کو دکھا دینا بالکل ممکن ہے جو حقیقتاً لڑی ہی نہیں گئی۔ یا ملکوں کے سربراہوں کی چوٹی کانفرنس میں، ایک ملک کے سربراہ کی طرف سے امن کی بات چیت کو مسترد کرنے کی (جھوٹی) تصویر دکھا دینا بھی اب کوئی ناممکن بات نہیں رہی۔ ماضی میں جارحانہ کاروائیاں کرنے والی حکومتیں بعض اوقات اپنے فوجی اقدامات کو جائز ثابت کرنے کے لئے خود ہی اشتعال انگیز مظاہرے کراتی رہی ہیں۔ مستقبل میں ان کو جھوٹ موٹ ایسے مظاہرے کرانے اور دکھانے کی سہولت حاصل ہوگی۔ تیز رفتاری سے سامنے آتے ہوئے مستقبل کے زمانے میں سچائی ہی نہیں خود حقیقت کے بھی، جنگ کے ہاتھوں پٹنے کا خطرہ پیدا گیا ہے۔

اس سارے معاملے کا ایک روشن پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ لوگ بہت سے دوسرے مقاصد کے حصول کے لئے بھی فریب کاری کے اس استعمال سے شناسا ہو جائیں گے، یعنی گھر میں، کام کے دوران، کھیل کے میدان میں ہر جگہ وہ یہ جان جائیں گے کہ محض دیکھنے یا ''محسوس'' کرنے کا مطلب یقین کرنا نہیں ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا، پبلک میڈیا کی محتاج ہوتی جائے گی اور یوں شک و شبے میں کچھ زیادہ گرفتار بھی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آخری بات یہ ہے کہ ہمیں اپنی اس خام خیالی سے نجات حاصل کرنا ہوگی جو اب تک اس روایتی اندازے میں پھنسی ہوئی ہے کہ نیا میڈیا، دنیا کو دودھ کے دودھ اور پانی کے پانی کی شکل میں بدل دے گا اور وہ اس طرح کہ یہ اختلافات ختم کرکے محض چند ذرائع ......مثلاً سی این این کو اتنا طاقتور بنا دے گا کہ وہ مغربی اقدار کو جامد کرکے، امریکی پروپیگنڈے کو 5ارب لوگوں کے حلق سے نیچے اتارنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

لیکن ٹی وی کی خبر مارکیٹ میں سی این این کی موجودہ برتری محض عارضی ہے۔ اس لئے کہ اب اس کے مقابلے میں دوسرے نیٹ ورکس وجود میں آ رہے ہیں، ایک دوعشروں میں ایسے عالمی اداروں کی تعداد میں اتنا اضافہ ہو جائے گا کہ اس سے میڈیا کی رنگا رنگی اور بوقلمو نیت کا مقابلہ ممکن نہیں رہے گا۔ اس نئی صورت پذیری کی مثالیں تیسری لہر کے زمانے کے ممالک میں نظر آنا شروع ہو چکی ہیں۔

اس وقت دنیا بھر کے گھروں میں نصب چھوٹی چھوٹی سٹلائٹ ڈشیں جو نظر آ رہی ہیں، ایک دن اس قابل ہو جائیں گی کہ شام کو کہیں سے بلکہ ہر جگہ سے خبریں وصول کر سکیں۔ نائیجیریا یا نیدرلینڈ، یا فن لینڈ کہیں سے بھی، اور خودکار ترجمے کا نظام بھی ان کا مددگار ہوگا اور وہ یوں کہ ایک جرمن خاندان جو ترکی کا کوئی کھیل یا شو ملاحظہ کر رہا ہوگا، اس کے مکالمے خودکار طریقے سے ترجمہ ہوکر اس خاندان تک پہنچیں گے۔ یوکرائن کے قدامت پسند کیتھولک عیسائیوں کو ویٹیکن سٹلائٹ کے ذریعے پیغام پر پیغام ملتے رہیں گے کہ وہ اپنا عقیدہ ترک کرکے رومن کیتھولک مسلک اختیار کرلیں، قم میں بیٹھا آیت اللہ کرغیزستان سے کانگو یا کیلیفورنیا تک اپنا وعظ پہنچانے پر قادر ہوگا۔

مرکزی طور پر کنٹرول شدہ چند چینلوں کی بجائے جنہیں دیکھنے پر سبھی مجبور ہیں، بنی نوع انسان کی کثیر تعداد جلد ہی ایسے متنوع اقسام کے پروگراموں اور پیغامات تک رسائی حاصل کرلے گی جن کا سننا یا دیکھنا ان کے فوجی اور سیاسی حکمرانوں کے نزدیک ہرگز پسندیدہ نہیں ہوگا۔ یہ سوچا جا سکتا ہے کہ بہت سی قوموں کے، خبروں کو مرضی کے مطابق ڈھالنے والے ماہرین اور علمی جنگجو وقتی طور پر دہشت پسندوں اور مذہبی جنونیوں کا ذکر چھوڑتے ہوئے تخلیقی لحاظ سے یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اس نئے میڈیا کو کس شکل میں' برت کر فائدہ اٹھایا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جا سکتا ہے۔قواعد کے کنٹرول کی پالیسیاں یا میڈیا کی طاقت سے فائدہ اٹھانا......یا اظہار رائے کے حق کا دفاع کرنا کل کی حکمت عملی کا ایک کلیدی جزو ہوگا۔ان کے جواب میں علمی حکمت عملیاں یہ متعین کرنے کا ذریعہ ہوں گی کہ قومی، غیرقومی گروپ اوران کی افواج اکیسویں صدی کے دھندلے نظر آنے والے تصادمات کے کیسے عہدہ برآ ہوں گے۔

علمی حکمت عملی کی تعریف یا اس کے نفاذ کے معاملہ میں امریکی فوج کو آزادی حاصل نہیں ہے۔ پریس کی ازادی کی پہلی ترمیم کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ میں جنگی خبروں کو مصلحت کے تحت بدل کر شائع کرانے والوں کو ان ملکوں کے مقابلے میں جہاں میڈیا پر آمرانہ کنٹرول اب بھی ایک حقیقت ہے، زیادہ باریک بین اور مستعد ہونا پڑے گا۔

اس کے باوجود اور میڈیا کی پینٹا گان کے مقابلے میں کم حوصلگی اور اس طرح فوج کے مقابلے میں میڈیا کی کم ہمتی کے باوجود جنگی علوم سے آگاہی رکھنے والے بیشتر فوجیوں نے جن سے ہم نے بات چیت کی، ایک اہم ضرورت کی حد تک میڈیا سے اتفاق کیا۔ انہوں نے اس حقیقت پر اپنے پختہ یقین کا اظہار کیا کہ میڈیا پر آمرانہ کنٹرول بجائے خود نقصان دہ حکمت عملی ہے اور یہ کہ عام طور سے اس بارے میں امریکہ کی نسبتاً کھلی پالیسی کی روایت فوجی لحاظ سے بھی سودمند ثابت ہوتی رہی ہے۔

بہت سے لوگوں نے جن میں یونیفارم والے اور بغیر یونیفارم والے دونوں قسم کے لوگ شامل تھے۔اس بات کا اعادہ کیا کہ آمرانہ ریاستوں کو میڈیا کے کنٹرول سے جو بھی فوائد پہنچ سکتے ہیں، وہ کھلے معاشرے میں ہونے والی اختراعات ، کاروائی اور خیال آفرینی سے ہونے والے فائدوں کے مقابلے میں ہرگز کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کا کہنا ہے کہ علمی حکمت عملی اختیار کرنے کا مطلب آمرانہ کنٹرول کا نفاذ نہیں ہے۔ اس کا مطلب آزادی کے بنیادی فوائد اور برکات کو بہتر مقاصد کے لئے استعمال میں لانا ہے۔

مگر آپ جیتتے ہیں ، ہارتے ہیں یا برابر رہتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ چینلوں اور ٹیکنالوجیز کی شمولیت کے باوجود میڈیا کے جس کردار کے بارے میں آج تصور بھی نہیں کیا جا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سکتا، وہ تیسری لہر کے جنگجوؤں کیلئے جنگ اور تدارک جنگ دونوں قسم کے مقاصد کے حصول میں مستقبل میں علمی حکمت عملی کا ایک بنیادی جزو ہوگا۔

ان صفحات میں ہم نے ابھی تک جنگ کی ایک نئی قسم کے جنم لینے کا پتہ چلایا ہے جو دولت آفرینی کے ایک نئے طریقے کا عکس ہے، اس کا آغاز ہم نے پہلے زمینی فضائی جنگ کے نظریے میں تلاش کیا۔ اس نظریے کو محدود پیمانے پر خلیج کی جنگ پر نافذ ہوتے اور پھر اس میں ردوبدل ہوتے بھی ہم نے دیکھا۔ ہم نے ٹیکنالوجیز جیسے روبوٹ سازی اور غیرمہلک ہتھیاروں کی تیاری وغیرہ کی جنگ کی نئی اقسام میں شمولیت کے امکان کا جائزہ لیا۔ پھر ہم ''علمی حکمت عملی'' کی طرف آگے بڑھے جس کی ضرورت کل کی جنگوں میں فوجی رہنماؤں کو شکست سے بچنے یا فتح کے حصول کے لئے پیش آئے گی۔ دوسرے لفظوں میں ہم نے ایک ایسی تاریخی ترقی کی نشاندہی کی ہے جو اکیسویں صدی میں جنگ کی غالب قسم کی صورت اختیار کر لے گی۔

لیکن جس چیز کا ابھی ہم نے جائزہ نہیں لیا، وہ تیسری لہر کی جنگی اقسام کے بعد پیش آنے والے خطرات ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پانچواں حصہ

خطرہ

ہل کے پھالے سے تلوار تک

جنگ کی کسی نئی قسم کے متعارف ہونے کا ایک نتیجہ تو موجودہ فوجی توازن کے بگڑنے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایسی مثالیں ماضی میں بھی دیکھنے میں آئی ہیں۔ مثلاً 23 اگست 1793ء کو جنگی صفیں ترتیب دیئے، خون ریز انقلاب میں گھرے اور انفرادی فوجی دستوں کی وجہ سے تباہی کے دہانے پر پہنچتے ہوئے فرانس نے اچانک عام جبری بھرتی کا اعلان کردیا۔ اس اعلان کے الفاظ بھی بڑے ڈرامائی تھے۔

''آج اور اس وقت کے بعد سے......تمام فرانسیسی فوج کی خدمت پر مامور ہونے کے پابند ہیں۔ نوجوان لڑائی میں براہ راست شریک ہوں گے۔ شادی شدہ لوگ ہتھیاروں کی تیاری اور ٹرانسپورٹ کے شعبوں میں خدمات انجام دیں گے۔ خواتین خیمے بنائیں گی، کپڑے تیار کریں گی اور ہسپتالوں میں مریضوں کی دیکھ بھال کریں گی، بچے پرانے کپڑوں سے پٹیاں بنائیں گے اور بوڑھے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے پبلک مقامات پر آتے جاتے رہیں گے۔''

یوں طاقت کے اس استعمال نے جدید تاریخ میں وسیع پیمانے پر جنگ آزمائی کی بنیاد فراہم کی اور اس کی وجہ سے جلد ہی توپ خانے، حربی داؤ پیچ، مواصلات اور تنظیم کے شعبوں میں کئی اختراعات نے جنم لیا۔ یوں جنگ کے ایک نئے موثر اور طاقت ور ذریعے کو وسعت دی گئی۔ اس کے بعد بیس برسوں میں فرانس کی جبری بھرتی شدہ افواج جو اب نپولین کی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہنمائی میں مصروف تھیں، یورپ کو روندنے کے بعد دورافتادہ ماسکو کے دروازوں پر دستک دینا شروع کی۔14 ستمبر1812ء کو چمکتی ہوئی دھوپ میں نپولین نے بذات خود اس شہر کے دمکتے ہوئے سنہری گنبدوں کو دیکھا۔

اس وقت نپولین کو برطانیہ کی بحری برتری کا ضرور سامنا تھا، مگر اس کے علاوہ براعظم یورپ کی سرزمین پر اس وقت صرف اس کی فوجی قوت قابل ذکر قرار دی جاسکتی تھی۔ یورپ مختلف قسم کے ڈھانچوں پر مشتمل خطے کی بجائے ایک وحدت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری لہر کے زمانے کی مروجہ جنگی اقسام ابھی ابتدائی مراحل میں تھیں۔ اس لئے نپولین کو وہاں تک پہنچنے کے باوجود فتح حاصل نہ ہوسکی کیونکہ روس کی طرف یلغار کی مہم آرائی کے نتیجے میں نپولین کی سپلائی لائنوں پر ناقابل برداشت بوجھ پڑ گیا تھا۔ سپین کے گروہوں کا مقابلہ بھی اس کیلئے ممکن نہ رہا لیکن اس کا انداز اتنا موثر اور اس حد تک کارگر نظر اتا تھا کہ اس کے بعد ابتدا میں یوریشیا اور پھر دوسری یورپی اقوام نے فرانسیسی جنگی اختراعات سے کام لینے اور انہی کو ترقی دینے کی کوشش کی۔

تاریخی تمثیلات عام طور سے ہمیشہ ہی مشتبہ ہوتی ہیں تاہم نپولین اور آج کی ہماری دنیا کے درمیان کی بعض مطابقتیں، ہمیں رک کر کچھ سوچنے پر مجبور ضرور کرتی ہیں۔ امریکہ نے بھی جنگ کی ایک نئ قسم متعارف کرا کے موجودہ فوجی توازن کو اسی طرح درہم برہم کر دیا ہے جس طرح نپولین نے کیا تھا، مگر اس دفعہ یہ تبدیلی کسی ایک براعظم پر نہیں بلکہ پورے کرہ ارض پر نمودار ہوئی ہے۔ اس کے تیسری لہر کے زمانے کے بڑھتے ہوئے فوجی اقدامات سے فوجی توازن اس حد تک بگڑا کہ یورپ میں متعین سوویت یونین کی فوجیں امریکی اور نیٹو کی افواج کے ساتھ اپنی برتری برقرار نہ رکھ سکیں۔ علم کے زور پر تیار کردہ مغربی فوجوں کی پشت پر تیزی سے ترقی کرتی ہوئی اور علم کے زور پر پھیلتی ہوئی معیشتوں کے ملاپ نے وہ صورت حال پیدا کر دی جو بالآخر کمیونزم کے انہدام پر منتج ہوئی۔ اس کے بعد امریکہ کرہ ارض کی واحد سپر پاور کے طور پر ابھرا اور نتیجہ ایک دفعہ پھر قوت کے وحدانی سسٹم کے طور پر سامنے آیا۔

تیسری لہر کے زمانے کی جنگی قسم کے حقیقی نفاذ نے خواہ وہ جزوی اور ترمیم شدہ شکل

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں ہی نافذ ہوا، سب کواس کے متاثر کن نتائج سے آ گاہی پر مجبور کر دیا اور پھر نپولین دور کی جنگوں کے بعد کے یوریشیا کی طرح آج کرہ ارض پر پھیلی ہوئی مختلف ملکوں کی افواج ممکنہ حدتک امریکہ کی نقالی کی کوششوں میں مصروف دکھائی دیتی ہیں۔

فرانس، جرمنی اور اٹلی سے روس اور چین تک اعلانات میں ایک ہی قسم کے الفاظ سنائی دیتے ہیں۔ تیز رفتاری سے فوجوں کی صف بندی پیشہ ورانہ رویہ......الیکٹرانک فضائی دفاع کا بہتر نظام......سی I 3 ......قطعیت، جبری بھرتی پر کم سے کم انحصار، مشترکہ کاروائیاں...... رکاوٹیں، فوجوں کی کم سے کم تعداد کا استعمال خصوصی کاروائیاں اور طاقت کا اظہار وغیرہ۔

جاپان، جنوبی کوریا، تائیوان اور بہت سی دوسری ایشیائی اقوام یہ بڑی تعداد میں فوج رکھنے کی بجائے بہتر ٹیکنالوجی کے حصول پر زور دیتے وقت خلیج کی جنگ کی مثال پیش کرتی ہیں۔ فرانسیسی فوج کے چیف آف سٹاف جنرل امیری ہونچل کا کہنا ہے کہ ''آئندہ دس برس میں زمینی افواج اپنا 17 فیصدی حصہ کھو بیٹھیں گی۔'' اس کے مقابلے میں ''الیکٹرانک جنگی اقسام پر انحصار میں ستر فیصدی اضافہ ہوسکتا ہے۔'' اس کو نافذ کرنے کی معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والی قومیں ہر جگہ علم پر مبنی طریقے جتنے بہتر طریقے سے بھی اختیار کرسکیں، قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ تیسری لہر کی جنگی قسم کی موجودہ حدود مستقل نوعیت کی ہوں۔ خلیج کے تصادم کے بعد روایتی خردمندی کی رو سے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں رہتا کہ جنگ کی یہ ترکیبیں ویت نام کے جنگلوں یا بوسنیا کی پہاڑیوں کے لئے ہرگز موزوں نہیں ہیں۔ ''ہم جنگل بوتے ہیں نہ پہاڑ تعمیر کرتے ہیں'' یہ فقرہ امریکی فوج کے اعلیٰ حکام اکثر تمسخر آمیز لہجے میں دہراتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔

پینٹا گان کے ایک افسر نے بلقان کے تنازعے کا حوالہ دیتے ہوئے ہمارے ساتھ خط و کتابت کے دوران لکھا کہ ''ہماری رہنمائی کا معیار یقیناً بہتر ہے لیکن یہ کسی گاؤں کو نشانہ بنانے والے انفرادی مارٹر کو روکنے کے لئے ہرگز کافی نہیں ہے۔ ہمارا اسلحہ بھی اچھا ہے مگر ان لوگوں اور دیہات کو نقصان پہنچائے بغیر جن کی حفاظت کے لئے ہم کوشاں ہیں اس پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ ایک مارٹر ٹیوب کی تباہی کے لئے جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے وہ حجم میں غیر ضروری طور پر بڑا ہے اور ہمارے پاس ایسے علم کے حصول کا بھی کوئی ذریعہ نہیں ہے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جس کی مدد سے ہم بلقان کی خشک اور بنجر چوٹیوں کے علاقے میں چند سو چھوٹے اور متحرک اہداف کی نگرانی کر سکیں۔

اس کے باوجود نئی جنگی اقسام سامنے آتی رہتی ہیں۔ ان کی ٹیکنالوجی کو بہتر بنانے کی کوششیں بھی جاری رہتی ہیں اور بالکل اسی طرح جس طرح نپولین کے زمانے کے بعد کی افواج کے ساتھ ہوا تھا، نئی جنگی اقسام کی ابتدائی خامیوں کو دور کرنے کے اقدامات بھی جاری رہتے ہیں۔

جیسا کہ آئندہ سامنے آنے والی بحث سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ تبدیلی کا یہ عمل کم شدت کے تصادمات کو نئی اور بہتر ٹیکنالوجی......مثلاً برقی آنکھ، فضائی مواصلاتی ذرائع، غیر مہلک اور روبوٹی قسم کے ہتھیاروں کی مدد سے جنگی صلاحیتوں کو مسدود رکھنے کیلئے ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ نئی تیسری لہر کے زمانے کی یہ جنگی قسم کسی وقت گوریلا جنگ بازوں اور چھوٹے پیمانے پر پہلی لہر کے زمانے کی جنگی اقسام سے کام لینے والے مخالف گروپوں کے لئے بھی اتنی ہی موثر ہو سکتی ہے جتنی کہ یہ عراقی قسم کی دوسری لہر کے زمانے کی افواج کے خلاف موثر ثابت ہو چکی ہے۔

تیسری لہر کے زمانے کی جنگی قسم کے ظہور نے حکومتوں کو اپنی فوجی طاقتوں کا از سر نو جائزہ لینے اور ان کو درپیش ممکنہ خطرات سے آگاہی حاصل کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ چین میں آج بھی تیس لاکھ مسلح افراد پر مشتمل فوج موجود ہے۔ (1980ء کی چالیس لاکھ تعداد میں کمی کے بعد)۔ اس کے ساڑھے چار ہزار لڑاکا طیارے، دنیا کی تیسری بڑی فضائی قوت کا درجہ رکھتے ہیں، لیکن چینی رہنماؤں کو یہ بخوبی معلوم ہے کہ داخلی سیکیورٹی کی یقین دہانی کے سوا ان کی یہ بڑی اور دوسری لہر کے زمانے کی جنگی فوج خسارے کا سودا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کے طیارے زیادہ تر فرسودہ ہو چکے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ کافی حد تک چاق و چوبند نہیں رہے۔ چینی اب اپنے ہمسایوں کے بارے میں بھی اندازے قائم کر رہے ہیں اور یہ بات ان پر آشکارا ہو چکی ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کی غیر موجودگی میں شمالی کوریا کی سوویت سٹائل کی دس لاکھ سے زائد فوج جتنی مضبوط نظر آ رہی ہے، اتنی مضبوط ہے نہیں بلکہ یہ کمزور فوج ہے جبکہ جنوبی کوریا کی چھ لاکھ تیس ہزار، امریکی سٹائل فوج اس سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے جتنی کہ بظاہر نظر آتی ہے۔ اس طرح جاپان کی دو لاکھ 6 ہزار افواج اپنی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اہلیت اورنئی خوبیوں کی وجہ سے اپنے حجم کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقت ور ہے۔

امن کا تحفظ کرنے والے ہمارے جیسے لوگوں کے لئے جو چیز سب سے زیادہ پریشانی کا باعث ہوسکتی ہے وہ ناپختہ فوجی قوت نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ آج طاقت کے سرچشموں میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں۔

یہی بات ہے جو سیاسی رہنماؤں اورفوجی منصوبہ سازوں کے لئے خدشوں اور وسوسوں کا باعث ہوسکتی ہے اور اس سارے معاملے میں زیادہ شدت، امریکہ کےفوجی مستقبل کے بارے میں غیریقینی صورت حال کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔

نپولین کی مثال اگر اور کچھ نہیں تو طاقت کی ناپائیداری کا احساس ضرور لاتی ہے۔ 18 جون1815ء کومشرق کی طرف اس کی پیش رفت کے تین سال کی مدت سے بھی کم حصے میں نپولین کی سلطنت واٹرلو کے مقام پر منہدم ہوگئی ۔فرانس کے سپر پاور ہونے کا لمحہ اچانک ختم ہوگیا۔ کیاامریکہ کے ساتھ یہی کچھ نہیں ہوسکتا؟ کیا امریکہ کے واحد سپر پاور ہونے کا یہ لمحہ بھی اپنی چکا چوند دکھانے کے بعد ماند پڑ جائے گا؟

حکمت عملی کے بغیر بجٹ

اس کا جواب کسی حد تک امریکہ کے اپنے اقدامات میں پوشیدہ ہے۔فوجی برتری قائم رکھنے کے لئے امریکہ کو اپنی اقتصادی برتری بھی یقیناً قائم رکھنی ہوگی۔ جاپانی اور ایشیائی معیشتوں کی ترقی کے باوجود، امریکہ کو اب بھی سائنس ،ٹیکنالوجی اور متعدد دوسرے شعبوں میں نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ اسے اپنی دوسری لہر کے زمانے کی صنعتوں کے بچے کھچے اثرات سے نکلنے اورسماجی ابتری اور بے چینی میں، جومعیشتی تبدیلیوں کے ہمراہ آتی ہے، کمی کرنے پرتوجہ دینے کی ضرورت ہے، اس کے ساتھ ہی اسے اپنی حکمت عملی کے امکانات پر بھی نئے طریقوں سےتوجہ دینا ہوگی۔

تمام متعلقہ لوگوں کے لئے جن میں دوست دشمن سبھی شامل ہیں، یہ بدنصیبی کی بات ہے کہ امریکی اشرافیہ، سیاسی بھی اور مذہبی بھی،صرف سرد جنگ کے خاتمے کی وجہ ہی سے حواس باختہ نہیں ہے بلکہ فوجی اتحاد میں رخنہ اندازیوں، ایشیا کی اقتصادی ترقی اورسب سے بڑھ کر علم کی بنیاد پر وجود میں آنے والی معیشت بھی جس کے عالمی تقاضے اس کی نظر میں واضح

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں ہیں، اس کی پریشانی کی باعث ہیں۔

نتیجہ طویل المدتی مفادات کے سلسلے میں امریکہ کے لئے واضح علامتوں کا فقدان ہے۔ مقاصد میں اس نوع کی خرابی دنیا کی بہترین فوجوں کیلئے بھی مستقبل میں شکست کا سبب بن سکتی ہے......یا اس سے بھی بدتر یہ صورت ہوسکتی ہے کہ بے چینی اور مہمل مقاصد اس کی تباہی کا ذریعہ بن جائیں۔ کانگرس میں بجٹ کم کرنے والے قصاب اور تیسری لہر کے زمانے کی ضرورتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے پینٹا گان کے فنڈز میں کٹوتی کے اقدامات پر زور دینے والے امریکہ کی فوقیت کا بہت تیزی سے خاتمہ کر سکتے ہیں۔

کسی ملک کو کتنے فوجی بجٹ کی ضرورت ہے، اس بارے میں جب تک اس ملک کے پاس واضح حکمت عملی اور اپنی ضرورتوں کا جائزہ لینے کا اہتمام نہ ہو، محض منطق کی دنیا اس کی مددگار نہیں ہوسکتی لیکن فوجی بجٹ کی تیاری کا یہ طریقہ ہرگز درست نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک سابق وزیردفاع ڈک چینی نے ہمیں بتایا، حقیقی دنیا میں حکمت عملی بجٹ سے متعین ہوتی ہے، حکمت عملی سے بجٹ متعین نہیں ہوتا۔

اس سے بھی بدتر صورت یہ ہے کہ جو بجٹ بظاہر رہنمائی کرتے ہیں ان میں بھی حقیقت پسندانہ طریقے اختیار نہیں کئے جاتے۔ اسلحہ اور افواج ہی ہر ملک کے سیاسی میدان میں آخری کرشمہ سازی کرتی ہیں کیونکہ انہی کے ذریعے ملازمتیں، منافع خوری اور مال بنانے کے سامان بہم ہوتے ہیں۔ سیاسی قوت اور باہمی مناقشات بجٹ ترتیب دنے کا عمل مکمل کرتے ہیں۔ اس میں منطق کا ہرگز عمل دخل نہیں ہوتا۔ اس لئے دفاعی بجٹ پر ہونے والی موجودہ بحث کو کسی حکمت عملی کے لئے سنجیدہ قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ سرکاری سرمائے کو مختلف مفادات کے لئے ہڑپ کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔

لیکن بجٹ کو نشانہ بنانے کے اس فریب نظر سے زیادہ خطرناک حکمت عملی کی میدان میں موجود سراسیمگی ہے......اور یہ صورت محض امریکہ کیلئے ہی خطرناک نہیں ہے بلکہ آج کے دور میں فوج اور معیشت کی غلط طور پر ہیئت تبدیل کرنے کے عمل کے لئے بھی خطرہ ہے یعنی اس وقت موجود دولت اور جنگ دونوں کو اس بارے میں خطرات کا سامنا ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

موت کے سوداگر

دوسری لہر کے پورے زمانے میں بڑی طاقتوں کی فوجی قوت کی پشت پر وسیع پیمانے کی دفاعی صنعت موجود رہی ہے، دوسری لہر کے زمانے کی بڑی بحری قوتوں کو وسیع بحری اڈوں کا سہارا حاصل رہا ہے۔ ٹینک ، طیارے، سب میرین، اسلحہ اور میزائل تیار کرنے کے لئے بڑی بڑی کمپنیاں میدان میں اترتی رہی ہیں۔

امن کا پرچار کرنے والے نسلاً بعد نسلاً اسلحہ سازی کو ہدف تنقید بناتے رہے ہیں۔ اس صنعت کے کرتا دھرتاؤں کو ''موت کے سوداگر'' کا خطاب دیا جاتا رہا ہے اور انہیں امن کے خلاف خفیہ سازشوں میں مصروف بتایا جاتا رہا ہے۔ دنیا کے اسلحہ سازوں کو بعض اوقات بجا طور سے جنگ کے شعلے بھڑکانے والے نہیں تو ان کو ہوا دینے والوں کے طور پر ضرور پیش کیا جاتا رہا ہے۔

''جنگ کے عمل سے منافع کا پہلو ختم کر دیا جائے۔'' یہ ایک معقول نعرہ بن گیا۔ 1933ء میں ''بلڈی ٹریفک'' اور اس کے بعد آنے والی توجیہی کتاب ''موت، منافع خوری کا ذریعہ'' نے جو 1944ء میں شائع ہوئی۔ کرپشن اور جنگ بازی کی ان کوششوں کو پوری طرح بے نقاب کیا جنہیں بعد میں ''فوجی صنعتی کمپلیکس کا نام دیا گیا۔

آج یہ صاف دکھائی دے سکتا ہے اور اس کمپلیکس پر تنقید کرنے والوں کی اس سے حوصلہ افزائی بھی ہونی چاہیے کہ دفاعی صنعت فضا کے راستے پر گامزن ہے۔ دفاعی صنعت سے متعلق محنت کشوں کی تعداد ہائی ٹیکنالوجی سے متعلق صنعتوں سے وابستہ لوگوں کے مقابلے میں کم ہو رہی ہے اگرچہ بعض چھوٹی اور غریب اقوام میں یہ عمل ابھی شروع نہیں ہوا)۔ امریکہ میں اخباری سرخیوں کے ذریعے روزانہ سائنس دانوں، انجینئروں، فنی ماہروں اور غیر ہنرمند دفاعی کارکنوں کی ملازمت سے سبکدوشی کا نمایاں ذکر ملتا ہے۔ مثال کے طور پر بمبار طیارے اور سب میرین بنانے والی کمپنی جنرل ڈائنا مکس نے بیس ماہ میں 17 ہزار کارکنوں کو فارغ کیا۔ امریکہ میں جہاں اس وقت فوجی ساز وسامان تیار کرنے والی بہت سی فیکٹریاں بند پڑی ہیں، دیوار برلن کے سقوط کے بعد دو برس سے بھی کم مدت میں تین لاکھ سے زیادہ دفاعی ملازمتیں ختم کر دی گئیں اور اس کے بعد بھی یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بڑی بڑی جناتی دفاعی کمپناں جو اپنی بقاء کی جدوجہد مس مصروف ہیں، اپنے اپنے اداروں کی تعمیرنو یا دوسری کمپنیوں میں ضم ہونے اور نئے کاروبار تلاش کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں، لیکن اس میں کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ اگر انہوں نے بجٹ کی موجودہ گولیوں کی بوچھاڑ سے بچ نکلنے کا انتظام کر بھی لیا، تب بھی دفاعی صنعت ایک طویل المدتی بیماری میں ضرور مبتلا رہے گی۔ بہت سی کمپنیاں اس وجہ سے ختم ہوجائیں گی لیکن اس طرح امن کے قیام کی صورت حال مزید خراب ہوسکتی ہے کیونکہ اب دنیا کو جنگ اور ہتھیاروں کی تہذیب کا سامنا ہے۔

تاریخ کی ایک بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ جن لوگوں نے دفاعی صنعت کا حجم کم کرنے کے لئے سخت محنت اور بے غرضی سے کام کیا اور جو یہ توقع کرتے رہے کہ فوجی مدوں پر صرف ہونے والی رقم بہتر مقاصد پر خرچ ہونے لگے گی، وہ خود ہی جنگ اور ہتھیاروں کی اس تہذیب میں تیز رفتاری کا باعث بن رہے ہیں اور اب یہ بات واضح طور سے سامنے آ رہی ہے کہ یہ صورت حال دنیا میں نئے، نہ پہچانے جانے والے خطروں کی چنگاریاں بھڑکانے کا باعث ہوگی۔

جنگ کی تہذیب

تہذیب سے یہاں ہماری مراد، تلوار کو ہل کے پھل کی شکل میں منقلب کرنے کا عمل ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کی بجائے یہ اس سے الگ معاملہ ہے۔ یعنی فوج سے متعلق کام کے، جس کی ذمہ داری فوج سے منسلک صنعتوں پر تھی، شہری صنعتوں سے متعلق ہونے کے عمل سے ہے۔

ایسی تبدیلیوں کی چند مثالوں پر بہت زیادہ توجہ دی گئی ہے جیسے مثال کے طور پر لاک ہیڈ ایٹ اینڈ ٹی کا وہ تجربہ جو اس نے محصول وصولی کے ناکوں کو خودکار، کارڈوں میں تبدیل کرنے کا کیا ہے یا پھر لارنس لیورنیشنل لیبارٹری کی ایسے کمپیوٹر بنانے کی طرف آنے کی کوشش ہے جن میں آب و ہوا کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کے لئے وہی ٹکنیک استعمال کی گئی ہے جو اس سے پہلے ایٹمی دھماکوں کے مطالعے کے لئے مخصوص تھی۔ تھامسن سی ایس ایف نامی دفاعی مالیاتی ادارے نے اپنے فوجی الیکٹرانک علم کا کچھ حصہ فرانسیسی ٹیلی کام یعنی فون

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کمپنی کو بہتر بنانے پر استعمال کیا ہے۔

لیکن مختلف ملکوں کا میڈیا اور سیاستدان بھی جہاں منقلب کرنے کے اس عمل کی برکتوں کی مدح سرائی کر رہے ہیں، وہیں اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ اس کے الٹ عمل نے شہری صنعتوں کو جنگی صلاحیتوں سے لیس کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔ یہی وہ تہذیب ہے جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ یہ تبدیلی یا ''منقلب'' ہونے کا حقیقی اور صحیح عمل ہے اور جو کچھ بھی اس کا نتیجہ سامنے آ رہا ہے وہ اس کے بالکل برعکس ہے جس کے لئے یہ تبدیلی لانے کا ڈول ڈالا گیا تھا۔ یہ نئی صورت ہل کے پھل کو تلوار میں بدل رہی ہے۔

یہ تہذیب دنیا کی بعض چھوٹی، غریب ترین اور بدترین حکومتوں والی اقوام کو بہت جلد بعض انتہائی ڈراؤنی فوجی صلاحیتوں سے بہرہ ور کرنے والی ہے۔ شر پسند سماجی تحریکوں کا ذکر فی الحال چھوڑ دیجئے۔

دورخی چیزیں

کسی بھی ملک کے فوجی صنعتی کمپلیکس کا مقصد ایسی اشیا پیدا کرنا ہے جنہیں ''ہتھیاروں'' کا نام دیا جاتا......اور جو ایسے خصوصی ڈیزائنوں کی مدد سے تیار ہوتے ہیں جن کے پیش نظر رائفلوں، گرنیڈوں سے لے کر ایٹمی ہتھیاروں کے ذریعے لوگوں کو مارنا یا ان کو مارنے کے عمل میں مدد پہنچانے کا عمل تھا۔ ایسی اشیاء میں کچھ ''دوہرے'' استعمال کی اشیاء بھی شامل تھیں جو اصل میں غیر فوجی اور شہری مقاصد کے لئے تیار کی جاتی تھیں مگر بعد میں فوجی مقاصد کے لئے بھی استعمال ہوئیں۔ ٹرک جو دودھ کے بیرل فارم سے شہری منڈیوں تک لانے میں استعمال ہوتے تھے اس کام کی بجائے میدان جنگ تک اسلحہ ڈھونے کے کام میں بھی لائے جا سکتے ہیں، لیکن خوراک اور تیل کے سوا دوسری لہر کی جنگیں' مصنوعات کی مدد سے ہرگز نہیں جیتی گئیں۔

بہرحال دیکھنا یہ ہے کہ اگر آج شہری ضرورتوں کی یہ پیداوار حقیقتاً ایک سپر کمپیوٹر ہو جس سے ایٹمی ہتھیاروں کی ڈیزائنگ کا کام بھی لیا جا سکتا ہو تو پھر کیا ہوگا؟ یا پھر اس باصلاحیت ٹیلی ویژن باکس کے بارے میں کیا خیال ہے جو لاکھوں امریکی گھرانوں کی زینت ہے اور جو اس ٹیکنالوجی سے بھی مزین ہے جو میزائلوں کی رہنمائی میں مفید ثابت ہو چکی ہے۔ بہت

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زیادہ حساس دھماکہ خیز مواد بھی ہے اور لیزر بھی، اس طرح شہری معیشت کے لئے تیار کی جانے والی متعدد دوسری اشیاء بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔

تیسری لہر کے زمانے کی دنیا میں ٹیکنالوجی اور پیداوار دونوں غیر وسیع منڈیوں کی مانگ پوری کرنے اور دوہرے مقاصد پر پوری اترنے والی اشیاء کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اپنا رخ تبدیل کرنے پر مجبور ہوجائیں گی اور جب ہم پیداوار اور ٹیکنالوجی سے آگے بڑھ کر، ان کے اجزاء اور سب ٹیکنالوجیز پر غور کرتے ہیں تو اس میں فوجی ضرورتوں کی طرف تبادلے کی تعداد آسمان کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ انہی وجوہ کی بناء پر ایک ایک دفاعی تجزیہ نگار کا یہ بیان قابل غور ہے کہ ''مستقبل کی افواج، شہری ٹیکنالوجی کے سمندر میں تیرتی نظر آتی ہیں۔''

اس کے مقابلے میں مصنوعات اور ٹیکنالوجی کے رخ بدلنے سے ہتھیاروں کا رخ بدلنے کا امکان کہیں زیادہ بڑھ جاتا ہے۔علم کی بنیاد پر اور اعلیٰ تکنیکی اسلحہ پر قائم معیشتیں بھی مارکیٹ کے ذرائع میں اضافے، سرمایہ کاری کے بہاؤ میں آزاد روی کے عمل دخل اور عوام، سازوسامان، سروسز اور خاص طور سے سرحدوں سے ماورا انفرمیشن کی تیز رفتار نقل وحرکت کی اس صورت حال پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دوہرے استعمال کی اشیاء آئندہ عالمی اجسام میں زیادہ آسانی سے رواں ہوں گی۔

مگر دوہرے استعمال کی اشیاء پر کلیتاً توجہ مبذول کرنے کا مطلب، زیادہ بڑے نکات کونظرانداز کرنے کے مترادف ہوگا۔ اس میں مصنوعات ہی نہیں سروسز بھی شمار کی جانی چاہئیں اور یہ صورت کرہ ارض پر ہی نہیں، فضائی وسعتوں پر بھی اسی طرح محیط ہوگی۔

جنگ کے لئے صارفین سروس

امریکی وزیر دفاع کے دفتر سے منسلک، مقابلے کی حکمت عملیوں کے ڈائریکٹر اور دفاعی مشیر ڈینٹل گور کی بات بھی سن لیجئے۔ وہ کہتا ہے: ''فضائی مواصلات تک رسائی، جاسوسی کے انتظامات اور نیویگیشن کی دنیا میں ایک عالمی انقلاب، یہ تمام ایسے عوامل ہیں جو فوج کی صلاحیتوں پر اثرانداز ہوتے ہیں۔'' جاسوسی یا نگرانی کے معاملے پر ہی غور کر لیجئے، گور کہتا ہے، ''مستقبل کا کوئی بھی صدام حسین، انفرمیشن کے بہتے دریا کا حصے دار بننے کے قابل ہو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جائے گا اور روس، فرانس، جاپان اور ممکنہ طور پر شاید خود امریکہ سے بھی درجن بھر یا اس سے بھی زیادہ مختلف قسم کی اشیاء یعنی برقی آنکھ قسم کے آلات کے حصول میں اسے کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوگا اور یہ سارا کام تجارتی بنیادوں پر ہوگا۔

اب بھی روس کا نویٹو سسٹم جسے کبھی الماز کے نام سے پکارا جاتا تھا، جاسوسی نگرانی کا کام کر رہا ہے۔ گور کہتا ہے،''صاف بات یہ ہے کہ شہری ٹیکنالوجی (جسے کوئی خریدار بھی حاصل کر سکتا ہے)،آج ہماری 1970ء کی فوجی ٹیکنالوجی کے مقابلے میں جس پر ہم بڑے نازاں تھے،کہیں زیادہ بہتر ہے۔''

اس لئے دنیا میں کہیں بھی موجود کوئی بھی حکومت......بشمول جنونی، جارحانہ، متشددانہ اور غیرذمہ دارانہ حکومتوں کے......جلد ہی آسمان میں دیکھنے کی آنکھیں خریدنے کی اہل ہو جائیں گی جن کی مدد سے وہ امریکی ٹینکوں، فوجوں اور میزائلوں کے تنصیبی مقامات کی نگرانی کر سکیں گی......فضا کی پروازوں کی ٹیکنالوجی میں بہتری کی وجہ سے اڑنے والی اشیاء کی پوزیشن کا ادراک آسانی سے ہو سکے گا اور وہ تقریباً ایک میٹر کے فاصلے پر سے نظر آ جائیں گی اگرچہ امریکی سٹلائٹ اب اعلیٰ ترین خوبیوں سے مالامال ہیں،مگر فضا میں امریکہ کی برتری، تمام عملی مقاصد کی حد تک ختم ہوتی نظر آتی ہے۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی......خلیج کی جنگ میں فضا نے بھی تیزرفتار مواصلات کا اہتمام کرنے میں مدد بہم پہنچائی لیکن آج موٹرولا ٹیلیفون کمپنی کرہ ارض کے چاروں طرف مصنوعی خلائی سیاروں کی زنجیر قائم کرنے کا پروگرام بنا رہی ہے۔ اریڈیم، نام کے تجارتی نظام کی مدد سے، اسے استعمال میں لانے والوں کو ایسا مواصلاتی سسٹم مہیا کیا جا سکتا ہے، جسے جام نہ کیا جا سکتا ہو۔

اس کے علاوہ الیکٹرانک نیٹ ورکس جیسے جیسے کرہ ارض پر پھل پھول رہے ہیں ایسا وقت صاف سامنے ہے جب جاسوسی کی بنیاد پر کام کرنے والے کسی مخالف کو سٹیلائٹ تک رسائی سے روکنا ممکن نہیں رہے گا۔ میدان جنگ سے متعلق' ہم انفریشن' زمین پر واقع تجارتی سٹیشنوں کی طرف نیچے کا رخ اختیار کر لے گی اور زیورچ' ہانگ کانگ اور ساؤ پالو میں واقع ڈیٹا مراکز سے ان شہری سٹیشنوں تک پہنچنے والی معلومات کو درمیانی رابطوں کے نیٹ ورکس کے ذریعے فوجوں کو مثلاً افغان' ایران' شمالی کوریا اور نراڑے کی فوجوں تک

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پہنچانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ دوسری چیزوں کے علاوہ اس نوع کی معلومات کی میزائلوں کا نشانہ بنانے' ان کو راستہ دکھانے (یا بدلنے) کے لئے بھی استعمال میں لایا جا سکے گا۔

اس کے بعد میزائلوں کا اپنا وجود بھی ہے۔ گور کہتا ہے: ''کل کے صدام حسین یقیناً اس قابل ہوں گے۔'' کہ وہ نسبتاً پرانی ٹیکنالوجی جیسے سکڈ میزائل حاصل کر سکیں گے اور......اس کو قطعیت کے ساتھ کسی ہدف پر داغ سکیں گے......اس کے لئے انہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کرنا ہوگا کہ جہازرانی کی راہ متعین کرنے والے ایک تجارتی جی پی ایس ریسیور' جیسے کہ خلیج کی جنگ میں استعمال ہونے والا سلگر......شاید وائرنگ میں تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد نصب کر دیا جائے اور بس اس کے بعد پانچ ہزار ڈالر کی رقم اور پانچ سال کی مدت میں' صدام حسین یا ایرانیوں یا کسی بھی دوسرے شخص کے لئے بدنام زمانہ' لڑکھڑاتے ہوئے متلون مزاج سکڈ میزائل کی بجائے جس سے تل ابیب یا ریاض کو نشانہ بنانا مشکل ہوتا' ایک پھرتیلے سکڈ میزائل کا حصول کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔

قصہ مختصر یہ کہ پرانے اور دوسری لہر کے زمانے کے ہتھیاروں میں تجارتی طور پر ملنے والے تیسری لہر کے' پھرتیلے ہتھیاروں کے اضافے سے' ان سب کو اتنی معمولی قیمت پر جسے کنگال اور غریب اقوام کی فوجیں بھی برداشت کر سکتی ہیں' چاق و چوبند اور جدید ہتھیاروں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ یوں آج کی بنی بنائی پھرتیلی فوجیں کل کی گھڑی ہوئی اور تیار شدہ افواج آمنے سامنے ہوں گی۔

یہ صحیح ہے کہ اس میدان میں امریکہ اور بعض دوسری فوجی طاقتوں کو اب تک دوسروں پر فوقیت حاصل ہے۔ ان کے فوجی بہتر تعلیم یافتہ اجتماعی صلاحیتوں کے مالک اور سسٹم کو مستحکم کرنے کی اہلیت سے بھی مالا مال ہیں' لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ خلیج کی جنگ کے زمانے کے عدم توازن کو ہمیشہ برقرار رکھنا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ کچھ عناصر کم از کم وہ جن کا تعلق تیسری لہر کے زمانے کے ہتھیاروں سے ہے' دنیا بھر میں نفوذ کر رہے ہیں اور نئی تہذیب کے پراسس کا حصہ بن کر آگے بڑھ رہے ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جنگ اور امن کی شادی:

امریکہ کی اہم دفاعی کمپنیوں نے ابھی حال ہی میں اپنا فوجی کاروبار دوسری شہری سرگرمیوں سے الگ کر لیا ہے۔ ٹیکساس انسٹرومنٹس ڈیفنس اینڈ الیکٹرانک گروپ کے صدر ہینک ہیز کا بیان ہے کہ: ''اگر ہمیں یہ تصور کرنا ہو کہ ہم کیا ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں (تو وہ یہ ہو گا) کہ دفاعی اور تجارتی سرگرمیوں کو ایک دوسرے میں ضم کر دیا جائے تا کہ دونوں کی پیداوار ایک ہی جگہ ممکن ہو سکے۔''

اس کی دوسری سطح پر' ٹیکنالوجیز میں بھی ارتباط برابر بڑھ رہا ہے۔ تبدیلی کی ایک طویل المدت سمت کا اشارہ واشنگٹن میں1990ء میں اس وقت ملا جب محکمہ دفاع اور محکمہ تجارت' جو سیاسی وجوہ کی بناء پر عام طور سے ایک دوسرے کے مخالف تصور کئے جاتے ہیں' دونوں ابھرتی ہوئی ٹیکنالوجی کی اپنی اپنی فہرست لے کر سامنے آ گئے۔ یہ غور کرنے کے لئے کہ اقتصادی ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لئے ان میں سے کون کون سی ٹیکنالوجیز زیادہ ضروری ہیں؟ کون سی ایسی ہیں جن کی فوج کو زیادہ ضرورت ہے' چند ایک کو چھوڑ کر دونوں محکموں کی یہ فہرستیں ایک دوسرے سے گہری مطابقت رکھتی تھیں۔

اسی طرح فرانسیسی حکومت بھی فضائی شعبے میں جاری کاوشوں کے سلسلے میں تجارتی اور فوجی شعبوں میں تعاون بڑھانے پر زور دے رہی ہے اور ڈیفنس نیوز کے مطابق ''اس نے ایسی کلیدی ٹیکنالوجی پر دسترس حاصل کر لی ہے کہ اب فضا میں فوجی اور شہری کوششوں کے درمیان کسی قسم کا امتیاز باقی نہیں رہا۔'' اس دوران امریکی فوج نے ایک وائٹ پیپر کے ذریعے تجویز کیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے' خصوصی فوجی خریداری کے سلسلے میں خاص قسم کا فوجی سامان آرڈر پر تیار کرانے کی بجائے یہ اب خریداری کے لئے تجارتی بنیادوں پر انحصار کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ ڈالر بچانے کی کوشش کرے گی۔

بظاہر جو کچھ واضح طور سے سامنے نظر آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ دفاعی سازوسامان تیار کرنے والی کمپنیاں بالآخر غائب ہو جائیں گی یا وہ غیر فوجی اور تجارتی اداروں کا حصہ بن جائیں گی۔ پرانا فوجی صنعتی کمپلیکس' نئے شہری فوجی کمپلیکس کی شکل اختیار کر لے گا۔

آنے والے زمانوں میں' ان دونوں شعبوں میں دکھائی دینے والی یک جائیت سے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تبدیلی کی موجودہ کوششوں پر نئی روشنی بھی پڑتی ہے۔ ہیوز ائر کرافٹ کمپنی کے چیئر مین مائیکل ارم سٹرانگ جو امریکہ کے اہم ترین اور بڑے دفاعی ادارے کا سربراہ ہے' بڑے فخر سے کہتا ہے:''ہم فوجی فضائی دفاع کو' شہری فضائی ٹریفک کنٹرول میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ وہ برقی آنکھ جو اب تک کیمیائی ہتھیاروں کی نگرانی پر مامور ہے' اب اسے نجاست یا ماحول کو گندہ کرنے والے اجزاء کی نشان دہی کے لئے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ ہمارے سگنلوں کے نظام سے ڈیجیٹل ٹیلیفون سسٹم کو ترقی دینے کی خدمات لی جا سکتی ہے۔ کروزی کنٹرول ریڈار' رات کی تاریکی میں زیر زمین نظر آنے والی سرخ شعاعوں سے خودکار حفاظتی نظام کو ترقی دی جا سکتی ہے۔ وہ یہ بتانا بھول گیا کہ اس کے مقابلے میں بھی یہی کچھ ہو سکتا ہے اور یہ محض ہیوز ائر کرانٹ کمپنی ہی کا مسئلہ نہیں ہوگا۔

ہوائزر کرافٹ کے لئے تجارتی منڈیاں ڈھونڈتے ہوئے محقق کیرول ڈی کیمپ بیل اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ مصنوعی جاسوسی پر نہیں اس ٹیکنالوجی کی مدد سے جو ابتدائی طور پر میزائلوں کی نشاندہی کا طریقہ ڈھونڈنے کیلئے وجود میں لائی گئی تھی، اب اسے کسی شخص کے طرز تحریر کو جانچنے کے لئے کام میں لایا جا سکتا ہے......اس سے امریکی محکمہ ڈاک فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ''اگر ہمارا یہ نظام بی I کو ایف 16 سے جو میلوں کے فاصلے پر ہے میّز کر سکتا ہے۔'' وہ بزنس ایک کو بتاتی ہے،''تو پھر یہ اے اور بی اور اے 6 اور اے 9 میں بھی تمیز کر سکتا ہے۔''

مگر اس میدان میں ہیوز کمپنی ہی تنہا نہیں ہے جو پیٹرن ڈیزائن کرنے کی پروگرامنگ کرتی ہے۔ اگر پاکستان بھی اپنی ڈاک سروس کے لئے طرز تحریر جانچنے کی یہ ٹیکنالوجی جاننے کے لئے میدان میں آتا ہے اور (اسے حاصل کر لیتا ہے) تو کیا یہ ٹیکنیک میزائل گائڈنگ کے لئے استعمال نہیں ہو سکتی؟

روس میں بارود اور خصوصی کیمسٹری کا چیف ڈائریکٹوریٹ اپنے اس کارنامے پر بہت نازاں ہے کہ سٹلائٹ کی جو برقی آنکھ امریکی میزائلوں کو ڈھونڈنے کے کام پر لگی ہوئی تھی اب وہ جنگل کی آگ ڈھونڈنے پر لگا دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روس یا کسی دوسری قوم نے جو ایسی آنکھ جنگل کی آگ کی نشان دہی کے لئے تیار کی ہوئی ہے، اسے میزائلوں کی تلاش کے لئے تبدیل کر دینا بھی ممکن ہے۔

یا پھر ''نقل مطابق اصل'' کی ٹیکنالوجی کو لے لیجئے۔ ''بیکسٹر ہیلتھ کیئر'' طبی ٹیکنالوجی کی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک فرم ہے جس نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ وہ نئے انٹراوینس انجکشنوں کے مائع کی تیاری کا سامان فرمائش کے مطابق ماڈلوں کی شکل میں کم سے کم وقت میں تیار کر دیتی ہے۔ بیکسٹر کی اس کوشش کا پرامن مقصد مارکیٹنگ کے اپنے لوگوں کی مدد کرنا اور وقت بچانا ہے لیکن اس ٹیکنالوجی کے محض انٹراوینس انجکشن سے متعلقہ سامان ہی تیار نہیں ہوتا (اور بھی بہت کچھ تیار ہوسکتا ہے)

دوسری لہر کے زمانے کی افواج کا انحصار اہم نظر آنے والے سامان پر ہوتا تھا یا پھر نقل وحرکت میں بھی قطاریں نظر آتی تھیں جو مثلاً ہیلی کاپٹروں کو پرزوں کی فراہمی کی ذمہ دار ہوتی تھیں۔ تیسری لہر کے زمانے کی افواج جو کمپیوٹر کی ترقی یافتہ کارکردگی یا تیزی سے نقل مطابق اصل تیار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں جلد ہی بہت سے ایسے پرزے موقعہ پر ہی تیار کرنے لگیں گی۔ نئی ٹیکنالوجی کی مدد سے دھات، کاغذ، پلاسٹک یا سرامکس سے متعلقہ ساخت میں مصنوعات کی تیاری، ان ہدایات کے عین مطابق ہوسکتی ہے جو ہزاروں میل دور واقع ڈیٹا مراکز سے وصول کی جا رہی ہوں۔ نیویارک ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق ''حقیقتاً اب فیکس کے ذریعے پرزے دور دراز کے ممالک تک ارسال کرنا ممکن ہو چکا ہے۔'' یہ اور اس نوع کی دوسری ٹیکنالوجیز فوجی قوت کو نمایاں کرنے کے عمل کی رفتار کو تیز اور سہل بنائیں گی اور یوں مستقل غیر ملکی فوجی اڈے اور ان کو مال مہیا کرنے کے لئے ڈپو قائم کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی۔

مانچسٹر، نیو ہمپشائر کی لائٹ مشین کارپوریشن کی منڈیوں میں تقریباً گیارہ ہزار ڈالر خرچ کر کے ایک خراد کے ذریعے ایلومینیم، فولاد، پیتل، پلاسٹک یا موم سے کسی بھی چیز کی نقل مطابق اصل تیار کرائی جا سکتی ہے اور اسے دور دراز سے ملنے والی ہدایات کے مطابق ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ علم کے زور پر تیار شدہ اشیاء، خدمات اور اجزائی ٹیکنالوجیز عالمی مارکیٹ پر اتنی تیزی سے اب آ رہی ہیں کہ تیزی سے بدلتے ہوئے امن اور جنگ کے اصولوں پر نظر رکھنا اب کسی کے لئے بھی آسان نہیں رہا۔ یہ حالات ہتھیاروں کی عالمی تقسیم کے نظام میں بھی تبدیلی لائیں گے۔ اگر کل کے ہتھیاروں کے بنیادی اجزاء شہری پیداواری ذرائع ہی سے حاصل ہونا ہیں تو پھر سوچنا پڑے گا کہ اسلحہ فراہم کرنے والے کون سے ممالک اس دوڑ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں سب سے آگے ہوں گے۔ چمنیوں سے دھواں چھوڑتی ہوئی فیکٹریاں جو اب تک فوجی سازوسامان کی پیداوار میں مصروف ہیں کیا اس دوڑ میں شامل ہوں گی؟ یا پھر اس میدان میں وہی قومیں رہ جائیں گے جن کی شہری معیشتیں اور برآمدات انتہائی ترقی یافتہ ہیں۔ جاپان پر اب تک ملکی آئین کی رو سے اسلحہ کی برآمد کی قطعی پابندی عائد ہے مگر ان معمولی سی معصوم شہری اشیاء کے بارے میں کیا خیال ہے جن میں سوفٹ ویئر اور ایسی خدمات شامل ہیں جنھیں فوجی مقاصد کے لئے تبدیل کرنا یا خاص شکل دینا ممکن ہے۔ کل کے ہتھیاروں کے اہم ترین اجزاء کا انتہائی حیرت انگیز ذرائع سے حصول ممکن ہوگا۔ یہ اب صاف نظر آ رہا ہے۔

اس لئے جب ہم آج کی خبروں کے پس منظر میں بدلتی ہوئی تہذیب کا جائزہ لیتے ہیں جو اس وقت علیحدگی کی تحریکوں، قومی تشخص کے مطالبات، ''نسلی اور لسانی'' صفائیوں کی کوششوں، جرائم کے سنڈیکیٹوں، بھاڑے کے ٹٹوؤں، اسلحہ بدست جنونیوں اور بہت سے صداموں سے اٹی پڑی ہے۔ تو یہ نیا ابھرتا ہوا عالمی نظام زیادہ سے زیادہ خوف ناک صورت اختیار کرتا نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسی دنیا جو تشدد کی لہروں سے بھری پڑی ہے اور اس میں کسی کی بھی......بشمول امریکہ کے، فوجی برتری بالکل غیر متوقع طور پر ختم ہوسکتی ہے۔ جنگ اور دولت آفرینی دونوں میں یکساں طور سے علم کے زور پر طاقت کا حصول ممکن ہے، مگر یوں جس طرح یہ طاقت حاصل ہوتی ہے ویسے ہی اس کا خاتمہ بھی ہوسکتا ہے۔

ہم نے اپنی گزشتہ کتاب ''پاورشفٹ'' میں لکھا تھا: ''یکساں تعریف کے تحت طاقت اور دولت دونوں ہی طاقتور اور امیروں کی ملکیت ہیں۔ یہ صرف علم ہی کا انقلابی کردار ہے کہ اس پر کمزور اور غریب کا بھی دوسروں کی طرح تصرّف ہوسکتا ہے۔ علم ہی طاقت کے حصول کا اہم ترین جمہوری وسیلہ ہے۔''

مگر یہ انتہائی خطرناک بھی ہوسکتا ہے، جنگلی ویسٹ کے چھ شوٹروں کی طرح یہ یکسانیت کی عظیم علامت بھی ہوسکتا ہے۔ اس کا نتیجہ بہرحال مساوات یا جمہوریت کی شکل میں برآمد ہونا ضروری نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم آئندہ کے صفحات میں دیکھیں گے، یہ اس کی بجائے تابکاری کی صورت بھی اختیار کرسکتا ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جن کھلا چھوڑ دیا

بہار کی ایک چمکدار صبح کو حال ہی میں ہم آٹھ انسان یہ فیصلہ کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے کو شمالی کوریا پر ایٹم بم پھینکا جائے یا نہیں۔

ایکہشت پہلو میز کے اردگرد بیٹھے ہوئے ہم سب کے سامنے پلاسٹک کے میز پوش پر کافی کے پیالے، کاغذات اور کھلے ہوئے بیگ پڑے تھے اور ہم تیزی کے ساتھ تازہ ترین خوفناک رپورٹوں کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھے۔ شمالی کوریا کے دارالحکومت پیانگ یانگ میں بغاوت کی ایک حالیہ کوشش کو شدید خونریزی کے بعد دبا دیا گیا تھا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی دس لاکھ سے زیادہ فوج دو دھڑوں میں بٹ چکی ہے اور شہر میں گشت کر رہی ہے۔ کچھ مسلح دستے سرحد یعنی جنوبی کوریا کے دارالحکومت سیول کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شمال سے داغے جانے والے سکڈ میزائل جنوب میں اہداف پر برس رہے تھے۔ وہاں پر موجود امریکی اڈے شمالی کوریا کے کمانڈو یونٹوں کے حملوں کی زد میں تھے۔

ہمیں معلوم تھا کہ برسوں سے شمالی کوریا درمیانی فاصلے پر مار کرنے والے میزائل تیار کرنے میں لگا ہوا تھا اور متعدد ملکوں کی طرف سے احتجاج کے باوجود ایٹم بم بنانے کی کوششوں میں بھی مصروف تھا۔ اب جبکہ بظاہر اس کی حکومت ڈول رہی تھی، اس نے بالآخر وہ سب کچھ کرنے میں پہل کی جس سے دنیا کافی عرصے سے ڈر رہی تھی۔

شمالی کوریا کے دو ایٹم بم ٹھیک 9 بج کر 26 منٹ پر اسی علاقے میں پھٹے جہاں جنوبی کوریا کے مسلح دستے دفاع کے لئے جمع ہو رہے تھے، تین منٹ کے بعد چار مزید ایٹمی دھماکے ہوئے، آدھے گھنٹے کے بعد جنوبی کوریا کی افواج پر توپ خانے کے ذریعے بھی حملہ کیا گیا جس میں کیمیاوی ہتھیار بھی استعمال ہوئے، دوسری کوریائی جنگ ایٹمی شور و شر کے ساتھ شروع ہو چکی تھی۔

ہماری ٹیم......اور ہماری جیسی دوسری ٹیموں کے سامنے جو کام تھا وہ یہ تھا کہ ہم صدر امریکہ کے لئے عملی امکانات کا جائزہ تیار کریں۔ ہمارے پاس کل پچاس منٹ وقت تھا۔ امریکہ تاریخی طور پر جنوبی کوریا کے دفاع کا پابند تھا۔ اس کے سامنے اب وہ سوال تھا جس سے اب تک ہر کوئی بچنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ یہ کہ کیا اب شمالی کوریا کے ایٹمی ہتھیاروں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے استعمال کے جواب میں امریکہ کو بھی اسی جنس میں جواب دینا چاہیے یا نہیں؟

ہمارے اس اجتماع میں ایک بھورے بالوں والی چرب زبان خاتون نے فوری طور سے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس کے ایک طرف ایک دبلی پتلی سیاہ فام خاتون بیٹھی تھی جو کچھ عرصہ خاموش رہی۔ خاتون کے دوسری طرف ایک مہذب، کم گو اور جامع الفاظ میں بات کرنے والا شخص بیٹھا تھا جس کی سفید مونچھیں بڑی محنت سے تراشی گئی تھیں۔ ان تینوں کا تعلق سی آئی اے سے تھا۔ نیلے بلیزر، رجمنٹل ٹائی اور بھورے فلالین کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں ملبوس ایک چوتھا آدمی بھی تھا جو بار بار احتیاط سے کام لینے کا مشورہ دے رہا تھا۔ وہ سی آئی اے کا ایک سابق اہل کار تھا۔ وزیر دفاع کے دفتر سے متعلق گھٹے ہوئے جسم اور گھنگھریالے بالوں والا شخص، ہر تجویز کورد کرتے ہوئے اس کی خامیوں کی نشاندہی کرتا رہا۔ دھاری دار قمیص میں ملبوس ایک اہم ملکی تھنک ٹینک کا نمائندہ جو ایٹمی تحقیقات کے کسی شعبے سے منسلک تھا، غیر ایٹمی جوابی کاروائیوں کی وکالت کرتا رہا۔ اس کا توڑ برکلے کے ایک نوجوان دانشور نے یوں کیا کہ اس کے خیال میں اگر ان سے ابتدا ہی میں سختی سے نمٹ لیا جائے اور فوری اور سخت کاروائی کرنے میں دیر نہ کی جائے تو اس کے نتیجے میں بہت سی جانیں ضائع ہونے سے بچ جائیں گی۔ ہمارے گروپ کی تکمیل ایک فاضل مصنف کی موجودگی سے ہوئی۔ دو دوسری میزوں پر فوجی اور جاسوسی کے شعبے سے متعلق حکام، سیاسی تجزیہ کرنے والے، فیصلے فراہم کرنے والے نظریہ ساز اور کچھ دوسرے ماہرین براجمان تھے اور یہ سبھی بریفنگ کے لئے آئے ہوئے کاغذوں کو الٹ پلٹ کر رکھنے کے ساتھ ساتھ ہماری طرح کچھ بھڑکتے ہوئے سوالات بھی دہرا رہے تھے۔

شمالی کوریا میں طاقت کس کے پاس ہے؟ کون کون سے دھڑے ہیں؟ وہ چاہتے کیا ہیں؟ ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے کی اجازت کس نے دی؟ کیا سفارتی ذرائع سے بات چیت کا کوئی امکان باقی رہ گیا ہے؟ کیا امریکہ کو آغاز میں صرف روایتی فوجیں ہی استعمال کرتے ہوئے یہ تنبیہ جاری کرنی چاہیئے کہ اب اگر مزید ایٹمی ہتھیار استعمال ہوئے تو اس کا جواب اسی جنس میں دیا جائے گا؟ یا یہ کہ کیا تنبیہ کرنے کا وقت ختم نہیں ہو چکا؟ اگر ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے ہی ہیں تو یہ کس قسم کے ہونے چاہئیں؟ اوران کو ڈیلور کرنے کا طریقہ کیا ہوگا؟ زمینی دھماکے(اس سے بہت سی معصوم جانوں کا زیاں ہوگا) بمبار؟ کروزی میزائل؟

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آئی سی بی ایم (نہیں اس سے روس اور چینی خوف زدہ ہو جائیں گے) کیا سبھی فوجی اہداف کو نشانہ بنایا جائے یا کسی ایک کو؟ کیا لیڈر شپ کے کمان بنکروں کو ہدف بنایا جائے؟ وقت دوڑا جا رہا تھا۔ ہم مقررہ وقت کی حد پار کر چکے تھے.....کیا ہمیں بھی ایٹمی ہتھیاروں ہی کا سہارا لینا پڑے گا؟

خوش قسمتی سے یہ تکلیف دہ فیصلہ کرنے کی اذیت میں سے کسی کو نہیں گزرنا پڑا، کیونکہ کوریا کی یہ دوسری جنگ خیالی تھی.....ایک منظر نامہ......یہ ساری مشق ایک تھنک ٹینک کا کھیل تھا جسے زیادہ صحت کے ساتھ، فرضی کاروائی کا نام دیا جا سکتا ہے اور جس کا مقصد امکانی ایٹمی بحرانوں کے خلاف تیاری کرنا تھا۔ اس سے قبل اس قسم کی مشقیں بعض دوسری ٹیمیں برسیلز کے مقام پر نیٹو ہیڈکوارٹر میں اور کچھ ایٹمی ماہروں نے ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح یوکرائن اور قازقستان میں بھی کی تھیں، یہ دونوں ملک سابق سوویت یونین کا حصہ رہ چکے تھے۔

جس وقت ہمارا یہ کھیل ختم ہوا، ہم نہ صرف یہ دیکھ چکے تھے کہ ایسے حالات میں کیا ہو سکتا تھا بلکہ اس پر بھی غور کر چکے تھے کہ ایسے بحرانوں سے کلیتاً بچنے کے لئے کون سے پیشگی اقدامات کئے جاسکتے ہیں لیکن اصلی ایٹمی کھیل بہرحال ابھی ختم نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہر نئے آنے والے دن کے ساتھ کچھ زیادہ ہی نحوست اور بدشگونی کی علامت بنتا جا رہا ہے کیونکہ جنگ کی طرح کے خونی کھیل کو اب تیسری لہر کی تہذیب کی آمد کے ساتھ ساتھ اور علم پر مبنی ٹیکنالوجیز کے جلو میں نئی شکل دی جا رہی ہے۔

مہلک جواب دعوے

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ایٹمی ہتھیار زرعی معاشرے میں وجود میں نہیں آئے اور پہلی لہر کے زمانے کا کسی طرح بھی حصہ نہ تھے۔ یہ عروج پذیر صنعتی عہد کے آخری دور میں سامنے آئے۔ وسیع پیمانے پر ہلاکتوں کے ذرائع تلاش کرنے کی یہ اسی طرح کی آخری کوشش ہے جس طرح اس عہد میں وسیع پیمانے پر صنعتی پیداوار بڑھانے کی راہ ہموار کی گئی، یہ ہتھیار، موت کا کھیل، بلاامتیاز کھیلنے کا ذریعہ ہیں اور یقیناً دوسری لہر کی تہذیب کا انتہائی فوجی اظہار ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آج کے انتہائی ترقی یافتہ ہتھیار ان کے برعکس ہیں، ان کا مقصد جیسا کہ ہم دیکھ چکے کہیں تباہی کو وسعت دینے کی بجائے محدود کرنا ہے، لیکن اس کے باوجود اب بھی جبکہ تیسری لہر کے زمانے کی افواج نقصانات کم کرنے کے طریقوں کو ترقی دے رہی ہیں۔ قطعیت کے ساتھ اہداف مقرر کرنے اور غیر مہلک ہتھیار تیار کرنے میں تیزی سے مصروف ہیں۔ شمالی کوریا کی طرح کی غریب قومیں جو کہ دوسری لہر کے زمانے کی صنعتی ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونے کی کوششوں میں وسیع پیمانے پر ہلاکتوں کے ذرائع کے حصول کے لئے کچھ بنانے، خریدنے، ادھار لینے یا چرانے کی دوڑ میں مصروف ہیں اور ہلاکت آفرینی کا ہر ذریعہ کیمیائی، جراثیمی یا ایٹمی ہتھیار سبھی کچھ پانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ایک دفعہ پھر ہمیں یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ جنگ کی نئی قسم دریافت ہونے سے پہلے موجودہ جنگوں کا خاتمہ ضروری نہیں ہے اور ان پرانے طریقوں میں ان کے مہلک ترین ہتھیار بھی شامل ہیں۔

اگلا چرنوبل

سرد جنگ کے زمانے کی بیشتر مدت میں نام نہاد ایٹمی کلب کی رکن قومیں، گنی چنی تھیں۔ امریکہ اور روس اس کے بنیادی ارکان تھے جب کہ برطانیہ، فرانس اور بعد میں چین کو اس کی رکنیت دے دی گئی۔

سوویت یونین کے اچانک حصے بخرے ہونے کے بعد نو آزاد قازقستان، بیلا رس اور یوکرائن بھی دو ہزار چار سو ایٹمی ہتھیاروں اور 360 بین البراعظمی میزائلوں کے مالک بن گئے۔ کافی تکلیف دہ گفت وشنید کے بعد ان کے اور روس کے درمیان یہ معاہدہ طے پایا کہ یہ ممالک سات برس کی مدت کے دوران میں اپنے ان ہتھیاروں کو تلف کریں گے یا پھر روس کی طرف روانہ کر دیں گے تا کہ وہاں ان کو غیر موثر بنایا جا سکے۔ بہرحال اس معاہدے کے کچھ عرصے بعد یوکرائن نے ان ہتھیاروں میں شامل یورینیم اور پلوٹینیم کے عوض رقم کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ دوسروں نے بھی کھسر پھسر شروع کر دی۔ امریکہ نے اس مقصد کے لئے موعودہ سرمایہ فراہم کرنے میں خاصی سست روی کا مظاہرہ کیا جس کے نتیجے میں ان ہتھیاروں کی ترسیل اور توڑ پھوڑ کے پروگرام میں تاخیر ہوتی گئی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

روسی اخبار ازوستیا کے بیان کے مطابق یوکرائن میں میزائلوں کو ذخیرہ کرنے کے لئے مخصوص مقامات، سہولتیں اور انہیں سنبھالنے کے طریقوں کی اتنی کمی ہے کہ اگلے چرنوبائل کا خطرہ واضح طور سے سامنے نظر آ رہا ہے۔ تابکاری کی جس سطح تک کارکنوں کو کام کرنے کی اجازت ہے، اس وقت وہ اس سے دگنی تابکاری کی موجودگی میں کام کر رہے ہیں۔ ہتھیاروں کے ذخیروں کے بیس مختلف مقامات پر حفاظتی سسٹم کی خلاف ورزیوں کے واقعات ہو چکے ہیں۔ اسی دوران یوکرائن کے ماحولیاتی وزیر نے روس پر جو یوکرائن ایٹمی ہتھیاروں کی سروس اور دیکھ بھال کا ذمہ دار ہے، الزام لگایا ہے کہ روسی اپنی یہ ذمہ داری اس وقت تک پوری کرنے کو تیار نہیں ہیں جب تک یوکرائن انہیں روسی پراپرٹی تسلیم نہیں کرتا، یوکرائن یہ شرط ماننے کو تیار نہیں ہے۔

اس طرح یہ جناتی آئی سی بی ایم امریکہ کو ابھی تک ویسے ہی نشانہ بنائے ہوئے اسی رخ پر نصب ہیں جہاں سرد جنگ کے زمانے میں انہیں نصب کیا گیا تھا۔ قازقستان میں نصب بعض میزائلوں کا رخ چین کی طرف بھی ہو سکتا ہے۔ ابھی یہ بھی واضح نہیں ہے کہ ان کے ''کنٹرول کوڈ'' کی کنجی کس ملک کے پاس ہے یا کس کے پاس نہیں ہے اور اس لئے اگر کوئی ایسا ملک ہے تو وہ کون سا ہے جو آزادانہ طور پر ان کو داغنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

چھوٹے یا ٹیکنیکل ایٹمی ہتھیاروں کا معاملہ بھی خراب ہے، یہ ہتھیار اگرچہ دنیا کو دھماکے سے اڑا تو نہیں سکتے، مگر دنیا کے کم از کم بیس شہر بیک وقت ان کی ژالہ باری کی زد میں آ سکتے ہیں۔ انفرادی، جنگی یا شاطرانہ چالوں سے ایسے ایک بم سے زمین کا ایک مربع کلومیٹر علاقہ اور اس پر موجود ہر ذی نفس تابکاری کی زد میں آ سکتا ہے۔ یہ بم اتنے چھوٹے ہو سکتے ہیں کہ ان کا محیط چند انچ اور لمبائی ایک دو فٹ سے زیادہ نہ ہو، ان میں سے بہت سے توپ کے گولوں کی شکل میں ہیں اور 25 سے 30 ہزار تک کی تعداد میں ان کی موجودگی مصدقہ ہے۔

امریکہ نے جرمنی اور کوریا سے اپنے تدبیراتی ایٹمی ہتھیار واپس اٹھا لئے ہیں اور چونکہ سوویت یونین کی سابقہ ریاستوں نے بھی اپنے اپنے حصے کے ہتھیار روس کو واپس کر دیئے ہیں اس لئے اب پندرہ ہزار ایسے ہتھیار مبینہ طور پر روس کی تحویل میں ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ہو سکتے ہیں جن میں کچھ ایسے بھی ہوں گے جو واپس ہی نہ کئے گئے ہوں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور ایسے بھی جو گنتی میں رہ گئے ہوں۔ پینٹا گان کے ایک اعلیٰ افسر کا کہنا ہے کہ ''ان میں سے کچھ فرسودہ اور پرانے زمانے کے تیارشدہ ہیں جب ان کے ساتھ حفاظتی اقدامات کا اہتمام کرنے کا سرے سے کوئی رواج ہی نہیں تھا بس ان کے اوپر ایک قفل نما خول چڑھا ہوتا تھا۔ ان کی مہک اب اس وسیع و عریض سلطنت پر پھیلی ہوئی ہے۔ کیا یہ سب واپس روس پہنچ چکے ہیں؟ اعداد و شمار کے مطابق اس کے متعلق یقین سے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

بے یقینی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ جب امریکہ کو یورپ میں موجود درمیانی فاصلے تک مار کرنے والے میزائلوں کو ایٹمی افواج کے معاہدے کے مطابق ضائع کرنے کے بعد پینٹا گان کے ایک ایٹمی ماہر کے بیان کے مطابق یہ پتہ چلا کہ ایک پرشنگ لانچر ابھی بچا پڑا ہے جو گنتی کے وقت شمار ہی نہیں کیا گیا۔ تو ظاہر ہے اس سے متعلقہ افراد سخت دہشت زدہ ہوئے۔ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ انہوں نے پورا ذخیرہ تباہ کر دیا ہے، لیکن خدایا! اس کے بعد انہوں نے ایک اور ڈھونڈ نکالا۔ یاد رہے کہ ایٹمی مواد سے لیس پرشنگ کو شمار یا شناخت کرنا چھوٹے اور متعدد دوسرے تدبیراتی ہتھیاروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ آسان ہے۔

آج کے اس بظاہر ''محفوظ'' روس میں یہ چھوٹے ہتھیار کلی طور پر ناکافی سہولتوں کے ساتھ ذخیرہ کئے گئے ہیں۔ روس کی پارلیمنٹ کا رکن اور سابق کاسموناٹ وٹلی سیوااستانوف کہتا ہے: ''موجودہ ڈپو ہتھیاروں سے لبالب بھرے ہوئے ہیں اور کچھ تو ریل کاروں کے ڈبوں میں رکھے گئے ہیں۔ روسیوں کے پاس اس کام کے لئے فنی عملے، ضروری ڈھانچوں اور سب سے بڑھ کر ان ہتھیاروں کی حفاظت کے لئے درکار روپے پیسے کی کمی ہے۔

حکومتیں، جرائم کے سنڈیکیٹ اور دنیا بھر میں موجود دہشت گردوں کے گروہ ان ہتھیاروں میں سے چند ایک پر قبضہ جمانے کی فکر میں ہیں۔ ادھر روسی فوج بشمول اس کے ان دستوں کے جوان ہتھیاروں کی حفاظت پر مامور ہیں، انتہائی کم مشاہرے پانے اور تحفظ کا اہتمام نہ ہونے کی وجہ سے قابل بھروسہ نہیں ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ فوج کرپشن میں پہلے ہی بری طرح دھنسی ہوئی ہے۔ کچھ دوسری قسم کے ہتھیار روسی فوجی غیر قانونی طور پر پہلے ہی ادھر ادھر فروخت کر چکے ہیں۔

ایک ایسا خوفناک منظر نامہ جو پینٹا گان کے ایک ماہر نے ہمارے سامنے پیش کیا، کچھ یوں تھا کہ ایک رشوت خور روسی کرنل ایک انقلابی دہشت پسند گروہ کو جو فرض کر لیجئے ایران

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں مقیم ہے، ہتھیار فروخت کر دیتا ہے۔ جب امریکہ یا اقوام متحدہ اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کیلئے پوچھتے ہیں تو روس اور ایران دونوں کی حکومتیں اس بارے میں لاعلمی کا اظہار کرتی ہیں اور ایسا کرتے وقت شاید دونوں ہی سچ بھی بول رہے ہوں لیکن بہرال ان میں سے ایک یا شاید دونوں کی بات درست تسلیم نہیں کی جائے گی اور یہ کوئی نہیں جانتا کہ اس طرح کی غلط فہیموں سے رشتوں میں آنے والی دراڑ سے کیا نتائج برآمد ہوں۔

ان دنوں (بلاشبہ سبھی) حکومتوں پر اس معاملے میں یقین نہ کرنے کے بہت سے اسباب موجود ہیں، ایرانی جب یہ کہتے ہیں کہ ان کی تمام ایٹمی صلاحیتیں پرامن مقاصد کے لئے ہیں تو اس وقت وہ شاید جھوٹ بولتے ہیں۔ عراق اور شمالی کوریا بھی بالکل یہی بات کہتے ہیں جبکہ خفیہ جاسوسی ذرائع کے مطابق ایران نے ایٹمی تحقیقات کا ایک خفیہ تحقیقی ادارہ قائم کر رکھا ہے اور جیسا کہ اس سے قبل عراق کر چکا ہے' ایران بھی بین الاقوامی اٹامک انرجی ایجنسی کے انسپکٹروں کو چکر دینے میں کامیاب رہا ہو۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب ان انسپکٹروں نے تہران کے قریب واقع موبہم کالیاہ کے مقام کا معائنہ کرنے کی درخواست کی تو انہیں اس نام کے ایک دوسرے گاؤں میں پہنچا دیا گیا۔

حزب مخالف کے ایک بڑے گروہ عوامی مجاہدین کے بیان کے مطابق ایران فی الحقیقت قازقستان سے چار ایٹم بم خریدنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ دسمبر1992ء میں جب اس کتاب کے مصنفین نے قازقستان کے صدر نور سلطان نذر بائیوف سے الماتا میں ملاقات کی تو اس سے اس رپورٹ کے بارے میں واضح طور سے دریافت کیا لیکن صدر موصوف نے اسے محض افواہ قرار دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی......صدر اور اس کی کابینہ کے ارکان سمیت......اصل حقیقت سے آگاہ نہیں ہے۔

کس کا اعتبار کیا جائے؟ آرمینیا کے وزیر داخلہ نے آذر بائیجان سے جنگ کے عروج کے زمانے میں چھ ایٹم بموں کے حصول کی لاف زنی کی تھی۔ شاید وہ بلف کر رہا ہو مگر ہوسکتا ہے درست ہی کہہ رہا ہو اور دنیا نے جارجیا میں واقع ایک ننھی منھی خودمختار ریاست جنوبی اوسیٹیا کی اس دھمکی کا کوئی نوٹس لینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جس میں اس نے جارجیا کی پیرا ملٹری فوجوں کے خلاف سابق سوویت یونین سے حاصل شدہ ایٹم بم استعمال کرنے کی دھمکی دی تھی۔ اب یہ بات دعوے کے ساتھ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ ایک زمانے کی امتیازی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایٹمی کلب کا اب کون ممبر ہے اور کون نہیں ہے۔

حیرت زدہ انسپکٹر

ایٹمی ہتھیار جب تک بڑی طاقتوں اور مستحکم حکومتوں کی ملکیت تھے تو ان کے پھیلاؤ کے مسائل سے متعلق دوسری لہر کے زمانے کی پیش بندیاں نسبتاً سادہ اور سہل معاملہ تھیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، مختلف معاہدوں اور ایجنسیوں کے توسط سے ان کے پھیلاؤ کو روکنے اور اس کے ذمہ داروں کی نگرانی کا کام بڑھایا جاتا رہا۔ ایٹمی عدم پھیلاؤ (این پی ٹی) اور آئی اے ای اے کے معاہدوں پر سے یہ توقع باندھ لی گئی کہ یہ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے میں موثر کردار ادا کریں گے۔ میزائل ٹیکنالوجی کنٹرول رجیم (ایم ٹی سی آر) میزائلوں کے پھیلاؤ کے خلاف بند باندھنے کے لئے ترتیب دی گئی۔ دوسرے اور بہت سے انتظامات کیمیائی اور جراثیمی ہتھیاروں کی روک تھام کے لئے بھی کئے گئے۔

این پی ٹی کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے گئے ہیں اور اسے تخفیف اسلحہ کی تاریخ میں اب تک کا سب سے موثر معاہدہ قرار دیا گیا ہے، کیونکہ اسے 140 ممالک قبول کر کے اس پر دستخط کر چکے کہیں لیکن جو ممالک اس سے چپکے ہوئے ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ اس شیر کے دانت نہیں ہیں، ایٹم بم، پلوٹونیم یا بہت زیادہ افزودہ یورینیم سے بنائے جاتے ہیں۔ تین ہزار ٹن ایچ ای یو میں سے جو اس وقت کرہ ارض کے مختلف حصوں میں تیر رہا ہے۔صرف تیس ٹن ......یعنی مجموعی مقدار کا صرف ایک فی صد......آئی اے ای اے کی نگرانی کے لئے دستیاب ہے۔ ایک ہزار ٹن پلوٹونیم میں سے، جو اب تک کی دریافت شدہ مقدار ہے، صرف ایک تہائی بین لاقوامی تحفظ میں ہے۔ اس کے علاوہ آئی اے ای اے کا بنیادی کام اپنے انسپکٹروں کو شہری ایٹمی انرجی مراکز کے معائنوں کے لئے بھیجنا ہوتا ہے تا کہ وہ یہ یقین دہانی حاصل کریں کہ ان میں شامل یورینیم یا پلوٹونیم کو بم بنانے کیلیئے تو استعمال نہیں کیا جا رہا۔ لیکن اب یہ کوئی بنیادی مسئلہ نہیں رہا کیونکہ عراق اور شمالی کوریا دونوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اصل اور بڑے مسائل کا تعلق ''غیر اعلان شدہ'' یا خفیہ ایٹمی مراکز سے ہے۔ یہ بھی یقینی امر ہے کہ بہت سے ممالک یہ مواد دوسرے ذرائع سے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خلیج کی جنگ کے خاتمے کے بعد سے پبلک ٹیلی ویژن سکرین پر اس قسم کے مناظر دیکھنے کی عادی ہوگئی ہے کہ آئی اے ای اے کی بڑی بڑی ٹیمیں بڑے کرّ وفر سے پرواز کرتی ہوئی بغداد پہنچیں مگر اس عالمی ادارے کی حیثیت وہاں ایک مچھر سے زیادہ نہیں ہے جو موٹی کھال کے تابکاری اثرات میں چھپا بیٹھا ہے۔

کویت پر صدام کے حملے کے تین ماہ بعد نومبر 1990ء میں آئی اے ای اے نے ایک ٹیم بغداد بھیجی۔ اسے وہاں وہی کچھ دکھایا گیا جو ڈکٹیٹر انہیں دکھانا چاہتا تھا اور اس کی بنیاد پر دورہ پر آنے والی ٹیم نے بغداد کے حق میں صفائی کا سرٹیفکیٹ بھی جاری کر دیا۔ اس ٹیم میں صرف دو انسپکٹر شامل تھے جو یہ تصدیق کرنے کے ذمہ دار تھے کہ بغداد میں ایٹمی توانائی کا استعمال پرامن مقاصد کے لئے کیا جا رہا ہے اور انہوں نے یہ تصدیق اس ایٹمی پلانٹ کے بارے میں کر بھی دی جو بعد میں بم سازی کا ایسا مرکز پایا گیا جس کا شمار دنیا کے چند بڑے جارحانہ اور ہمہ پہلو مراکز میں کیا جا سکتا ہے۔

خلیج کی جنگ کے بعد کے زمانے میں جب آئی اے ای اے کی ٹیمیں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی ہدایت پر بغداد گئیں تو اس ایجنسی کی کارکردگی ناکافی اور قابل اعتراض پائی گئی۔ اس کے چیف انسپکٹر ماریز یوز متریرو نے 1992ء میں مبینہ طر پر یہ اعلان کیا کہ عراق کا بم پروگرام ''زیرو'' ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود 1993ء کے آغاز ہی میں اس کے انسپکٹروں نے بہت بڑے پیمانے پر ایسا ساز وسامان دریافت کر لیا جس سے اس ناپختہ بلکہ خود فریبی پر مبنی اعلان کا بطلان ہو جاتا ہے۔

خلیج کی جنگ سے پہلے آئی اے ای اے، 42 کل وقتی انسپکٹروں کی مساوی تعداد سے کرہ ارض پر پھیلے ہوئے شہری ایٹمی توانائی کے ایک ہزار مراکز کی نگرانی کا کام لیتی تھی۔ اس کے مقابلے میں امریکہ نے اپنے ہاں گائے اور مرغی کے گوشت کی صحت مندی کی یقین دہانی کے لئے اور اسے طوطا بخار نیز دوسری زہریلی بیماریوں سے محفوظ قرار دینے کا سرٹیفکیٹ جاری کرنے کے لئے سات ہزار دو سو کل وقتی انسپکٹر مقرر کر رکھے ہیں۔ یعنی دنیا بھر میں ایٹمی بیماری میں تیار مریضوں کی دیکھ بھال کیلئے بھیجے جانے والے ہر ایک انسپکٹر کے مقابلے میں گوشت کی صحت کی دیکھ بھال پر امریکہ میں 171 انسپکٹر مقرر ہیں۔ حقیقتاً امریکہ اپنے ملک میں گائے اور مرغی کے گوشت کو محفوظ بنانے کی یقین دہانی حاصل کرنے کے لئے اس رقم

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے ڈھائی گنا رقم خرچ کرتا ہے جو آئی اے ای اے کرہ ارض کو ایٹمی خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے خرچ کرتا ہے(179 ملین ڈالر کے مقابلے میں473 ملین ڈالر)

خلیج کی جنگ کے بعد این پی ٹی کے معاہدے کومضبوط بنانے کی کوششوں اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی طرف سے اس کی مزید حمایت کے باوجود اس کی خلاف ورزی کرنے والوں اوراس پر دستخط نہ کرنے والوں کے لئے یہ ہنسی اورمذاق کا ذریعہ بن چکا ہے۔ مچھرتو پھرمچھر ہی ہے۔

فحاشی اور ہیروئن

دنیا بھر میں موجود مصنوعی سیاروں، جاسوسی کے فضائی نظام اورنگران برقی آنکھوں کی موجودگی میں یہ سوچنا غلط نہ ہوگا کہ ایٹمی سرگرمیوں کا پتہ لگانا اب مشکل نہیں رہا ہوگا، لیکن جیسا کہ عراق کے معاملے سے ثابت ہو چکا ہے، ایسا سوچنا درست نہیں ہے۔ پیرافین جیسے کیمیائی مادوں اور کافی نیچے زیرزمین رکھے ہوئے ایٹمی ہتھیاروں کو ڈھونڈ نکالنا ہرگز آسان نہیں ہے۔ کسی چھپی ہوئی چیز کو دریافت کرنے والی ٹیکنالوجیز نے ابھی تک چھپانے کی ابتدائی زمانے کی تدبیروں کا توڑ بھی دریافت نہیں کیا۔

اس کے ساتھ ہی امن کے زمانے کے ایٹمی توانائی کے کارخانوں نے ایٹمی فضلے کی عالمی مقدار میں زبردست اضافہ کر دیاہے جس سے ایٹمی ہتھیار بنائے جا سکتے ہیں۔ بین الاقوامی تجارت کے ذرائع بھی برابر بڑھ رہے ہیں......ان میں ایٹمی مواد، مشینوں اور ہتھیاروں کی سمگلنگ کے ذرائع بھی شامل ہیں۔ ماسکو ٹائمز کے بیان کے مطابق روس کی سرحدیں اس وقت چھلنی کی شکل اختیار کر چکی ہیں جن میں سے ہرقسم کا سامان، ہرشکل سے مائع،ٹھوس یا گیس کی صورت میں آنے جانے کا راستہ بنا رہا ہے۔

اس کتاب کے مصنفین نے جب ماسکو میں روس کی ایٹمی توانائی کے وزیر ڈاکٹر مائیخلوف سے ملاقات کی تو ہمیں بہت سی یقین دہانیاں کرائی گئیں مگر بہرحال انہی دنوں وہاں ماسکو کے نزدیک واقع پوڈلوسک انسٹی ٹیوٹ سے3.3 پونڈ افزودہ یورینیم کی چوری کے بعد اسی وزارت میں سکیورٹی کے سربراہ ایف ماخولاف نے صاف طور سے کہا کہ ''یہ چوری ایسے لوگوں نے کی ہے جو یورینیم کی فزودگی کے کام سے براہ راست منسلک ہیں اور جو اس

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے پوری طرح آ گاہ ہیں۔ ان کو پتہ تھا کہ تھوڑی تھوڑی مقدار میں چوری کس طرح کرنی ہے کہ اس کا پتہ نہ چل سکے۔ سمگلر اتنے تجربہ کار نہیں ہیں مگر وہ بھی یہ کام کر رہے ہیں اور ان میں سے کچھ افزودہ یورینیم سمگل کرتے ہوئے آسٹریا، بیلارس اور جرمنی میں پولیس کے ہتھے بھی چڑھ چکے ہیں جہاں پولیس کے نوٹس میں ایٹمی مواد کی نقل وحرکت کی ایک سو کے قریب وارداتوں کی نشاندہی کی گئی۔

انقلابی طریقے سے بدلتی ہوئی اس نئی صورت حال نے حربی ماہر تھامس شلنگ کی 1975ء کی پیش گوئی 1990ء میں درست ثابت کردی۔ اس نے کہا تھا، ''1999ء کے آس پاس کے زمانے میں دنیا بھر میں ایٹمی ہتھیاروں کو محدود رکھنے کی ہماری کوششیں اسی طرح ناکام ہو جائیں گی جس طرح ہم ویک اینڈ پر ہفتے کی شب کو ہونے والی خصوصی فحاشی اور ہیروئن فروشی کو کنٹرول کرنے میں ناکام رہے ہیں۔''

وال سٹریٹ اور فوجی حکمران

یہ صورت حال کچھ قنوطیوں کو یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کو کنٹرول کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس میں رینڈ کارپوریشن کے حربی ماہر کارل بلڈر کی مایوسی کا کسی سے مقابلہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعض ساتھی اس معاملے میں اسے خاصا انتہا پسند قرار دیتے ہیں، لیکن امریکہ کے لئے ایٹمی تحفظ کے ریگولیٹری کمیشن کے پہلے ڈائریکٹر کی حیثیت میں اس کی رائے کو نظرانداز کرنا آسان بھی نہیں ہے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب بلڈر امریکہ میں شہری ہاتھوں میں موجود ہر قسم کے ایٹمی مواد کے تحفظ کا ذمہ دار تھا اور اس میں کچھ ایسا مواد بھی تھا جو بم کی سطح کے برابر اہمیت رکھتا تھا۔

اس کا یقین ہے کہ مستقبل کا بنیادی ایٹمی مسئلہ قومی ریاستوں کا پیدا کردہ قطعاً نہیں ہوگا بلکہ اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہوں گے جنہیں ہم نے اپنی کتاب ''پاورشفٹ'' میں گلوبل گلیڈی ایٹر'' یا عالمی شمشیرزن کے نام سے متعارف کرایا ہے۔ یہ دہشت گرد، مذہبی تحریکیں، کارپوریشنز اور دوسری غیر قومی قوتیں ہیں......جن میں اس کے بیان کے مطابق بہت سی ایٹمی ہتھیاروں تک رسائی حاصل کرلیں گی۔

اس کی بات سنتے اور اس پر غور کرتے ہوئے آپ سوچ سکتے ہیں کہ یہ بھی ہوسکتا ہے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کسی وقت آئرش ری پبلکن فوج کی طرف سے یہ اعلان کیا جا رہا ہو کہ اس کے پاس اپنے ایٹم بم موجود ہیں۔ اس لئے وہ بی بی سی کے ذریعے یہ وارننگ دے رہے ہیں کہ ”اگر آئندہ 72 گھنٹوں میں برطانوی فوج نے شمالی آئرلینڈ خالی نہ کیا تو ایٹم بم......“

بموں سے کھیلنے والے جنہوں نے نیویارک میں واقع عالمی تجارتی مرکز کا ایک حصہ تباہ کیا تھا، پوری وال سٹریٹ کو بھی تہس نہس کر دیتے، اگر کسی زیادہ ہشیار شخص نے انہیں ایک چھوٹا موٹا ایٹم بم پکڑا دیا ہوتا۔ بلڈر کو یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن ایسے گروہ جیسے مثلاً میڈیکلن کا کوکین کارٹل ہے۔ خود اپنے ایٹمی ہتھیار بنانے کی صلاحیت حاصل کر لیں گے۔

اکانومسٹ کی ایک رپورٹ کے مطابق ”اب تک امریکہ سے ایٹمی خطرے کی دھمکی دے کر مال بٹورنے کی کم از کم پچاس کوششیں ہو چکی ہیں اور ان میں سے بعض خطرناک حد تک قابل یقین تھیں۔“

خطرات کی موجودہ فہرست میں اضافہ جس کو اب تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، حال ہی میں سامنے آیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حکومتیں، دہشت پسند گروہ اور منشیات فروش ہی نہیں بلکہ اب فوجی موقعہ پرست اور جنگجو حکمران بھی ایٹمی ہتھیاروں کی تلاش میں نکل سکتے ہیں۔

اسلحہ کنٹرول کرنے والی تنظیموں کی طرف سے دنیا کے بیشتر حصوں میں موجود ایسی نجی فوجوں کی موجودگی کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے جنہیں مقامی تجارتی سیاسی ٹھگ اور بدمعاش کنٹرول کر رہے ہیں۔ جنگجو شمشیر زنوں سے ملتے جلتے گروپ فلپائن سے صومالیہ اور کاکسس ہر اس جگہ موجود نظر آتے ہیں جہاں مرکزی حکومتوں کا کنٹرول کمزور ہو چکا ہے۔ ایسی نجی فوجیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں پرانے اور منتشر شدہ سوویت یونین کی قومی فوجوں کی حیثیت میں وجود میں آ رہی ہیں۔ علاوہ ازیں اس وقت یہ ماننے کے اسباب بھی موجود ہیں کہ روس میں آج مافیا قسم کے تجارتی گروپ فوج کی شکم پری کر رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ نجی فوجیں کرائے کے فوجی اور پہلی لہر کے زمانے کے جنگجو شمشیر زن، سبھی کے سبھی میدان میں واپس آ رہے ہیں۔ ان مقامی جنرل سیموز کے کنٹرول میں ایٹمی ہتھیاروں کی موجودگی کسی بھی ذی ہوش فرد کو لرزہ براندام کرنے کے لئے کافی ہونی چاہیے۔

بلڈر کے ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کا منظر نامہ بہرحال ہمیں ہر انتہا پسندی کے مقابلے پر مجبور کرتا ہے، وہ کہتا ہے، ”بندوق کے بارود کی طرح ایٹمی ہتھیار بھی عام پھیلنے والے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں......میں تو اس سے آگے تک جانے اور یہ کہنے کو بھی تیار ہوں کہ میری زندگی میں نہیں تو شاید سامنے نظر آنے والے مستقبل میں یہ ہتھیار انفرادی سطح تک پھیلتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ آئندہ کسی شخص کے لئے تجارتی بنیادوں پر دستیاب سامان خرید کر اپنا انفرادی ایٹم بنانا بعید از قیاس نہیں......

مافیا خاندان جیسے برانچ ڈیویڈین، کلسٹسٹس، آرکائیو، ٹراٹسکائٹ، سنڈیرو، لومینوسو، مادسٹ، صومالین، یا جنوب ایشیا کے جنگجو شمشیرزن، سربین نازی، حتیٰ کہ انفرادی خبطی تک بھی کسی پوری قوم کو یرغمال بنانے کے لئے ایٹمی حربہ استعمال کر سکیں گے۔ بلڈر کے خیال میں اس سے بھی بدتر صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ''کسی ایسے مخالف کو ایٹمی ہتھیار کا ڈراوا دے کر باز نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ وہ کسی معاشرے کی حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہے۔'' مطلب یہ کہ ایٹمی ممالک ایک دوسرے کے پاس ایٹمی ہتھیاروں کی موجودگی کے ڈر کی وجہ سے اس کے استعمال سے باز رہ سکتے ہیں، مگر انفرادی دہشت پسند گروہوں کو ایسا ڈراوا بھی ان کے استعمال سے نہیں روک سکتا۔ یوں وہ کہتا ہے کہ ''ہمیں عدم موزونیت پر مبنی بے ہنگم قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔''

شکستہ ڈیم

ہتھیاروں کی وسیع پیمانے پر ہلاکت آفرینی کے طوفان کے خلاف جس ڈیم نے بند باندھ رکھا ہے، اس کا انحصار نہ صرف غیر موثر معاہدوں والے نگرانی کے ناکافی سسٹم پر ہے بلکہ برآمدات پر پابندیوں کے ایک نیم دلانہ طریقے پر بھی ہے۔ اس انتظام کو جسے بہت سی حکومتوں نے قانونی شکل دے رکھی ہے اور جس کا مقصد مبینہ طور پر ایسے اجزاء اور مواد کے تبادلے کو ناممکن بنانا ہے جو وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے بموں کی تیاری کیلئے درکار ہو، لیکن ایٹمی ہتھیاروں کے کنٹرول کے متعلق اس کونسل پروجیکٹ کی ڈائنا ایڈسن ووڈ کے بیان کے مطابق: ''صرف امریکہ میں آپ کو بے شمار بلا واسطے کے کام کرنے والے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں لگے ہوئے برآمدی ادارے جگہ جگہ پہنچائیں گے۔''

عالمی سطح پر رابطے کا یہ فقدان اور بھی نمایاں ہے۔ اس مسئلے پر ہر ملک کا اپنا اپنا معیار اور اپنی اپنی توجیہات ہیں، ایسے سامان اور ٹیکنالوجی کی فہرستیں بھی ہر ملک کی الگ الگ ہیں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جن کی ان کے خیال میں برآمد نہیں ہونی چاہیے۔ پابندیوں کے نفاذ کے طریقے بھی مختلف ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف پروگرام گڑ بڑ کا شکار ہیں تو میزائلوں ، کیمیاوی ہتھیاروں اور جراثیمی جنگ کی زہرناکی کے خلاف بننے والے پروگرام اس سے بھی کہیں زیادہ عدم رابطوں یا تعاون کے فقدان کی زد میں ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ ہلاکت آفرینی کی دوسری لہر کی وسیع پیمانے پر موجود روایت کا مقابلہ کرنے کا کوئی موثر سسٹم ابھی تک سامنے نہیں آ سکا۔

ان حقائق کو جب ہم برابر برابر رکھتے ہیں تو ہمارے سامنے ایک ایسی انقلابی صورت حال آتی ہے جس کا ادراک اسلحہ کنٹرول کرنے والی سرکاری ایجنسیوں ، قیام امن کی جدوجہد کرنے والے گروپوں اور ایٹمی عدم پھیلاؤ کے ماہرین کبھی کرہی نہیں سکتے۔

اگر ہم غیر حکومتی گروہوں کی طرف سے پیش آنیوالے بڑھتے ہوئے خطرات کونظرانداز بھی کر دیں اور صرف قومی ریاستوں پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں تو بھی ہمیں اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے کہ اس وقت تک بیس ممالک ایٹمی کلب کے یا تو رکن بن چکے ہیں یا اس کے دروازوں پر دستک دے رہے ہیں۔ سابق سفیر، رچرڈ برٹ کے، جس نے ایٹمی ہتھیاروں کومحدود رکھنے کیلئے امریکہ اور روس کے درمیان معاہدہ کرانے میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں، بیان کے مطابق دنیا کے ساٹھ ستر ممالک جلد ہی ایٹمی ہتھیاروں کے حصول میں کامیاب ہو چکے ہوں گے اور اگر ایٹمی کلب کی بجائے ہم ایک تباہ کن کلب کا خیال ذہن مں لائیں جس کی توسیع شدہ ممبرشپ میں کیمیاوی ہتھیاروں اور جراثیمی جنگ کی صلاحیتوں والے یا اس کے خواہش مند ممالک بھی شامل ہوں تو ظاہر ہے یہ تعداد اس سے کہیں زیادہ بڑھ جائے گی۔ اس کے بعد اب ایسی دنیا کے بارے میں سوچ لینا چاہیئے جس کے ایک تہائی یا آدھے ملکوں نے ہلاکت آفرینی کے کچھ خفیہ ہتھیاروں کو اپنے اسلحہ خانوں میں چھپا رکھا ہوگا۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ خرابی کہاں پیدا ہوئی اور جن بوتل سے باہر کیسے آ گیا تو بہت سے ماہرین اس کی ذمہ داری سرد جنگ کی دنیا کے خاتمے کوقرار دیتے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن یہ جواب نامکمل ہے۔

یہ تیسری لہر کے زمانے کی آمد ہے......جس نے اپنی مبنی برعلم ٹیکنالوجیز، قوموں اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سرحدوں پر اس کے پگھلا دینے والے اثرات، اس کی انفرمیشن اور مواصلاتی صلاحیتیں، سرمائے اور تجارت کی گلوبائزیشن...... کے بل پر تخفیف اسلحہ کے اب تک کے پروگراموں کی بنیاد ہی منہدم کر دی ہے۔

دوسری لہر کے زمانے میں وسیع پیمانے پر ہلاکت آفرینی کے ہتھیاروں کی روک تھام کے تمام پروگرام درج ذیل دس مفروضوں کے پیش نظر ترتیب دیئے گئے تھے۔

1- نئے ہتھیاروں کو چند مضبوط ملکوں تک محدود رکھا جا سکے گا جن کی ان پر اجارہ داری ہوگی۔

2- ایسے ہتھیاروں کی متلاشی اقوام خود یہ ہتھیار بنائیں گی۔

3- چھوٹی قومیں اس میدان میں عام طور سے درکار وسائل سے محروم ہیں۔

4- وسیع پیمانے پر ہلاکت پھیلانے والے ہتھیاروں کی تعریف چند ہتھیاروں پر ہی صادق آئے گی۔

5- ان کی تیاری کا دارومدار خام مال کی تھوڑی سی مقدار پر ہوگا جس کو مانیٹر اور کنٹرول کیا جا سکے گا۔

6- یہ بعض مخصوص اور ناقابل حصول ٹیکنالوجیز کی مدد ہی سے تیار ہوں گے جس کے پھیلاؤ پر نظر رکھی جا سکے گی۔

7- ایسے ''رازوں'' کی اصل تعداد بھی زیادہ نہیں ہوگی جنہیں ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے کام میں لایا جا سکے گا۔

8- آئی اے اور ای اے جیسے ریگولیٹری ادارے انفرمیشن جمع کر کے اسے پھیلا بھی سکتے ہیں جس کی عالمی ایٹمی صنعت کو ضرورت ہوگی، مگر ان معلومات کو روکا جا سکے گا جو ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کا ذریعہ بن سکیں۔

9- موجودہ اقوام متحد رہیں گی اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہ ہوں گی۔

10- ایٹمی ہتھیار پھیلانے کا ذریعہ صرف قومی ریاستیں ہیں۔

یہ سارے مفروضے آج واضح طور پر غلط ثابت ہو چکے ہیں، تیسری لہر کے زمانے کے عروج کے ساتھ ہی، دوسری لہر کے دور کی وسیع پیمانے پر ہلاکت آفرینی نے کلیتاً نئی شکل اختیار کر لی ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لچکدار رویہ

اس انقلاب کے بارے میں دن رات پریشان ہونے والے چند افراد میں سے ایک بحریہ سے منسلک ایک دانشور لادی سی کوئیسٹ بھی ہے، اس کا کیریئر دانشوروں کی روایت کے عین مطابق غیر معمولی رہا ہے۔

مشرقی ایڈہو کے ایک کسان جوڑے کا بیٹا مہم جوئی کا دلدادہ اپنی پرورش اور نشو ونما کے عمل میں نمایاں کردار انجام دینے والے ''نیشنل جیوگرافک میگزین'' کی کاپیاں بغل میں دبائے بڑا ہوا۔ کچھ قسمت اور کچھ ہمت سے اسے ایک نجی کمپنی میں کام مل گیا جو قطب شمال میں موسمی مطالعوں میں مصروف تھی۔ اس مطالعے کا تعلق ڈیولائن کے نام سے کام کرنے والے ان ریڈار سٹیشنوں کو ابتدائی موسمی حالات سے آگاہ کرنے سے تھا جن کی زنجیر گرین لینڈ سے کینیڈا ہوتی ہوئی الاسکا اور سترہویں متوازی خط سے ہوتی ہوئی قطب شمالی کے دائرے سے دو سو میل تک چلی گئی تھی۔ وہاں موسم سرما گزارتے ہوئے اس کے کان میں بھنک پڑی کہ امریکہ کا موسمی بیورو ایسے رضا کاروں کی تلاش میں ہے جو ارجنٹائن کی ایک مہم کے ہمراہ قطب جنوبی کا سفر کرنے کو تیار ہوں۔ ایک لسانی سکول میں کچھ دنوں تک ہسپانوی زبان سیکھنے کے بعد قطب جنوبی جانے والی ارجنٹائن کی پہلی مہم میں شمولیت کے بعد وہاں پہنچ گیا جہاں اس نے قطب جنوبی کے برف زاروں میں 14 ماہ گزارے۔ 23 برس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے وہ دنیا کے دونوں سروں تک ہو آیا تھا۔

سی کوئسٹ نے بعد میں امریکی بحریہ میں شمولیت اختیار کر لی اور اتنی ترقی کی کہ معروف امریکی جنگی جہاز یو ایس ایس آئی او وان کی کمان بھی سنبھالی۔ سی کوئیسٹ کی علیحدگی کے بعد یہ جہاز ایک زبردست حادثے کا شکار ہو کر تباہ ہوا۔ بحریہ سے تعلق کے دنوں سمندروں پر حکمرانی کرنے کے دوران میں سی کوئیسٹ بحریہ کے اعلیٰ سطحی حربی ماہر کے طور پر سامنے آیا اور اپنی ڈرامہ نگار بیوی کارلا کے ہمراہ واشنگٹن آ گیا جہاں پینٹا گان میں جائینٹ چیف آف سٹاف کے لئے خدمات انجام دیتا رہا۔ آخرکار وہ وزیر دفاع کے عملہ میں خصوصی دفاعی کوآرڈی نیٹر کی حیثیت سے شامل ہوا اور ایک چھوٹی سی ٹیم کے ساتھ مل کر کام کرنے لگا۔ اس ٹیم کا کام ان چیزوں پر از سر نو غور کرنا تھا جنہیں توجہ کے قابل قرار دیا جا چکا ہو۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کمیٹی کا ایک کام تو ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے خطرے کی نئی اورانقلابی تعریف ہے۔ سی کوئیسٹ کہتا ہے کہ ''ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو عدم استحکام کے ایسے تصور کے ساتھ نتھی کر دیا گیا ہے۔ خاص طور پر کلیدی خطوں میں واقع اسے ممالک کے لئے اس کو خطرناک فوجی امکانات کی صفیں ترتیب دینے، ان کی صلاحیتوں کو بڑھانے اور ان کے ساتھ وابستہ ٹیکنالوجیز کو بہتر بنانے اور ان کے علم میں اضافہ کرنے کی بنیاد قرار دیا جا رہا ہے۔'' یہ تعریف بجائے خود ماضی سے علیحدگی کا اشارہ کرتی ہے اور اس سے اس اصطلاح کے معنوں میں گہرائی اور وسعت دونوں میں اضافہ ہوتا نظر آ تا ہے۔

''ایٹمی ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ'' کی پالیسیوں کا زور اب تک محدود پیمانے پر ان ہتھیاروں کے ڈلیوری سسٹم اور بعض صورتوں مں فضائی سسٹم پر مرکوز رہا ہے۔ یا سسٹم جسے ''رڈ پھیلاؤ'' کا نام دیا گیا ہے اور جو عام طور سے ایسی صلاحیتوں کا احاطہ کرتا ہے جن میں ٹیکنالوجیز اور علم شامل ہے، لہٰذا وسیع پیمانے پر ہلاکت آفرینی کی کسی ملک کی صلاحیت کا جائزہ لیتے ہوئے اس ملک کے اسلحہ بارود سے زیادہ اس کے فوجی نظریے، اس کی تربیتی صلاحیت اور دوسری غیر مرئی خصوصیات زیادہ توجہ طلب ہونی چاہئیں۔

یہ رپورٹ تیسری لہر کے علم پر مبنی ٹیکنالوجی پر خصوصی توجہ دیتی ہے۔ نئی لچک دار تکنیک جو روز بدلتی ہوئی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھالنے کی اہل ہے، اس نوع کے طریقے ہی کسی کو اس تہذیب کا جائزہ لینے کا اہل بناتے ہیں جس کا ذکر ہم گذشتہ باب میں کر چکے ہیں اور یہی ہتھیاروں کے پھیلاؤ میں موجودہ توازن کو تبدیل کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ سی کوئیسٹ کا بیان ہے: ''صنعتی مال تیار کرنے والی ترقی یافتہ مشینوں کا عالمی پھیلاؤ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ عددی طور پر کنٹرول کی جانے والی مشینری اب تیسری دنیا کے بہت سے ملکوں میں موجود ہے......دوا سازی کا ایک کارخانہ جس کی ایسے ملکوں میں بہت ضرورت ہے......لیکن اس میں جراثیمی ہتھیار تیار کرنے کی باطنی صلاحیت بھی موجود ہوتی ہے۔ اسی طرح عددی طور پر کنٹرول شدہ مشینری جو تیسری دنیا میں اچھی قسم کی کاریں تیار کرنے پر مامور ہے، اعلیٰ معیار کے راکٹ بھی تیار کر سکتی ہے۔

تیسری لہر کے زمانے کی اس مشینری کی تیز رفتار ترقی کی وجہ سے جوہری طور پر فوجی توزان میں بھی زبردست تبدیلی آ گئی ہے، جس سے امریکہ کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ وہ اپنا غلبہ قائم نہیں رکھ سکے گا۔ سوائے ترقی یافتہ ٹیکنالوجیز اور قوتوں کو مستحکم رکھنے کے، سی کوئسٹ کے خیال کے مطابق امریکہ کے پاس حقیقتاً اب کسی قسم کی فنی اجارہ داری موجود نہیں ہے۔''

وہ کہتا ہے، حقیقتاً میرے اس چیلنج کا آج تک کسی نے جواب نہیں دیا کہ میرے سامنے کوئی تین ایسی ٹیکنالوجیز کی نشان دہی کرے جن پر صرف امریکی افواج کی اجارہ داری ہو۔ اب کچھ بھی باقی نہیں رہا...... کسی زمانے میں اگر ہمارے پاس کوئی اہم دریافت ہوتی تو ہم اسے روسیوں سے چھپا کر رکھتے اور اگر وہ کچھ بنا لیتے تو ہم سے دور رکھتے۔ ہم دونوں طاقتیں متوازی ٹریک پر رواں دواں تھیں، باقی سب پیچھے رہ گئے تھے...... اب ایسا نہیں......

حقیقی فولادی اشیاء کے پیچھے بہرحال غیر محسوس واقفیت کا علم ہے۔ معلومات کے شعبے میں عالمی سطح پر ہم ہر قسم کی جارہ داریاں ختم ہوتی دیکھ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ میڈیا اور دیگر ذرائع سے معاشرے میں عام ہونے والے طبی علم کے سیلاب پر اب ڈاکٹر بھی بند نہیں باندھ سکتے، تجارتی اور دوسری ضروریات کے تقاضوں کے مطابق اجارہ داریوں کے خاتمے کا پراسس، بعض حالات میں وسیع جمہوری اثرات کا حامل ہے...... اور یہ بعض دوسرے حالات میں، اس کے ساتھ ہی فوجی اثرات کو تہس نہس بھی کر رہا ہے۔

معمولی معلومات کی آزادی مہم سازوں کے لئے

ایٹمی ہتھیار بنانے کے لئے بہت سی ضروری معلومات (ہو سکتا ہے یہ بہت طاقتور بم بنانے سے متعلق نہ ہو، لیکن کافی طاقتور بم سے اس کا تعلق ہو) ان دنوں ہر اس شخص تک پھیل چکی ہیں جو ان سے آگاہی حاصل کرنے کا خواہاں ہے۔ دہشت پسند، خبطی، مجنوں یا کنگال قومیں سبھی اس دوڑ میں شامل ہیں۔

بم بنانا چاہتے ہو؟ ذاتی کمپیوٹر ہے؟ آئی اے ای اے کے دوستانہ ڈیٹا بنک اور انٹرنیشنل نیوکلر، انفرمیشن سسٹم پر بھروسہ کر کے فوراً کام شروع کر دو۔ فنی لائبریریوں میں پڑے ہوئے وسیع اور کھلے لٹریچر سے مدد حاصل کرو۔ ایک زیرزمین نیوکلیئر کک بک جس کا نام ''بیس منٹ نیوک'' ہے اور جسکی ورق گردانی ہم یہ تحریر لکھتے وقت برابر کر رہے ہیں، خرید

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لو۔ اس کی خرید وفروخت کھلے بندوں جاری ہے بشرطیکہ خریدار کو معلوم ہو کہ یہ کہاں سے ملتی ہے۔ مثالو جسٹ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے انجینئرنگ پروفیسر مائیکل گومیکا کہتا ہے، ''آج جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اچھا ہتھیار کیسے بنایا جا سکتا ہے، صرف ہتھیار بنانے کی بات کرنا کافی نہیں ہے۔''

لیکن محض لچکدار رویہ عام ہونے یا راز آشکارا ہونے ہی سے، آج کی خطرناک حقیقت سامنے نہیں آتی۔ رینڈ کارپوریشن کا کارل بلڈر اس طرف متوجہ کرتا ہے، ''ایٹمی ڈراوے کے فوجی پروگرام اس حد تک ہرگز موثر نہیں ہوں گے جتنی کہ انفرمیشن کے اس دور میں ہونے والی سیاسی اور سماجی تبدیلیاں اثرانداز ہوں گی۔''

مثال کے طور پر کسی قوم کی طرف سے معلومات کے داخلی یا خارجی بہاؤ کو روکنا اب ریاست کے لئے ممکن نہیں رہا۔ انفرمیشن ہر جگہ موجود ہے اور ہر کسی کی رسائی میں ہے۔ دنیا میں اچانک پھیلتے ہوئے عالمی تجارتی مفادات میں شمولیت کا مطلب ایسے ذرائع اختیار کرنے کے مترادف ہے جو ریاستی کنٹرول کم کر رہے ہوں......

قومی طاقت کی جڑیں، صنعتی دور میں قدرتی ذرائع اور سرمایہ کاری کے عمل میں جاگزیں سمجھی جاتی تھیں......انفرمیشن کے عہد میں......یعنی تیسری لہر کے زمانے میں......یہ جڑیں اب انفرمیشن تک آزادانہ رسائی میں وجود پذیر نظر آتی ہیں۔''

یہ وہ گہری قوت ہے جو ماحولیات اور ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو زیادہ گھمبیر بنا رہی ہیں۔ بلڈر کا کہنا ہے کہ ''ایٹمی ہتھیار بنانے کے لئے جس انفرمیشن کی ضرورت ہے، وہ آخرکار قومی ریاستوں کے کنٹرول سے باہر ہو جائے گی اور اس وجہ سے ایٹمی مواد تجارتی ذرائع سے آسانی سے دستیاب ہونے لگے گا۔ اس مواد کی پیداوار اور ریکوری کا مرحلہ بھی آسان ہو جائے گا۔

ایٹمی ہتھیاروں کے بارے میں جو کچھ بھی سوچا جا رہا ہے، وہی کچھ دوسرے ہتھیاروں پر بھی صادق آتا ہے اور یہی حقیقت ان لوگوں کو جو پرامن دنیا دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ اکیسویں صدی کے مخمصے کو قبول کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

جنگوں اور وسیع پیمانے پر ہلاکت آفرینی کے خاتمے کے لئے یا تو علم کی ترقی اور پھیلاؤ میں سست روی کا رویہ اپنانا پڑے گا......جو ناممکن نہ بھی ہو تو غیر اخلاقی ضرور ہے یا پھر نئے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

علم کے حصول، تنظیم اور ترسیل کی رفتار بڑھا کر اسے حصول امن کے راستے پر ڈالنا ہوگا، کل کی تدارک جنگ کی کوششوں میں علم ہی کار آمد ہوگا۔

دنیا ہتھیاروں کے پھیلاؤ کی تہذیب کی وجہ سے جن نئے خطرات میں گھری ہوئی ہے، وہ بہرحال امن کو درپیش اس سے کہیں بڑے خطرات کے مقابلے میں بھی صف آراء ہے......نئی دنیا کے نئے خطرات......اس کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم خوابوں کی دنیا سے باہر نکلیں۔

خوابوں کی دنیا

دیوار برلن کے سقوط کے بعد، دنیا کو جس سرمستی اور بے خودی نے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اس کے اثرات میں یہ پختہ یقین بھی شامل تھا کہ آنے والے زمانے میں جنگیں پھیلتی بھی رہیں تو ترقی یافتہ اقوام ان کی زد سے باہر رہیں گی اور یہ کہ جنگ کی ناخوش گوار اور تکلیف دہ صورت حال مقامی اور علاقائی تصادمات تک محدود رہے گی، جس میں دور افتادہ مقامات پر بسنے والی زیادہ تر غریب اور کالی جلد والی اقوام ہی شریک ہوں گی۔ بلقان میں جنگ شروع ہونے اور نسل کشی کے واقعات سامنے آنے کے بعد بھی یہ سوچ مغربی یورپ کو، جس کے دروازوں پر انسانی خون ارزانی اور فراوانی کے ساتھ بہہ رہا تھا، خواب غفلت سے بیدار نہ کر سکی۔

پہلی اور دوسری لہر کے خطوں میں چھوٹی چھوٹی جنگوں کے امکانات حقیقتاً روز بروز بڑھ رہے ہیں، لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ بڑی طاقتیں امن کی برکتوں سے بہرہ ور اور ان لڑائیوں کے اثرات سے محفوظ رہیں گی۔ امریکہ اور سوویت روس کے درمیان ایٹمی جنگ کے خطرے کے امکانات کم ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جنگوں کے پھیلنے کا خطرہ ہی باقی نہیں رہا۔ وسیع پیمانے پر ہلاکت پھیلانے والے ہتھیاروں کی بڑھتی ہوئی تعداد فوجی مقاصد کے لئے شہری ٹیکنالوجی کے استعمال میں اضافے، ایٹمی عدم پھیلاؤ کے لئے کام کرنے والی طاقتوں کی کمزوری، یہ سب ایسے عوامل ہیں جن سے چھوٹی جنگوں کے بڑی جنگوں اور زیادہ خطرناک شکل اختیار کرنے کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ نیز اس کے ملکی سرحدوں سے آگے بڑھنے کے......بشمول اس نام نہاد خطہ امن کے جہاں اعلیٰ ترقی یافتہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اقوام رہائش پذیر ہیں اور جہاں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اس علاقے میں جنگ کا اب کوئی خطرہ نہیں ہے......امکانات صاف نظر آ رہے ہیں۔

یہ توقع رکھنا کہ کرہ ارض کے ایک حصے میں ہونے والی گڑ بڑ اور تباہی سے عالمی نظام کے کسی دوسرے حصے کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے، درست نہیں ہے۔ تارکین وطن بڑی تعداد میں ملکی سرحدیں عبور کر رہے ہیں اور بعض اوقات وہ اپنے ساتھ نفرتوں، سیاسی تحریکوں اور دہشت گرد تنظیموں کے عناصر بھی لے آتے ہیں۔ ایک ملک کی نسلی اور مذہبی اقلیتیں، بعض اوقات دوسرے ملک کے لوگوں کی نقل مکانی کا سبب بن جاتی ہیں۔

آلودگی اور تباہی سرحدوں کے احترام سے ماورا ہوتی ہیں اور سیاسی بے چینی کا ذریعہ بھی، ان میں سے کوئی ایک یا سب اعلیٰ ترقی یافتہ معیشتوں کو ایسے اختلافات اور تصادمات میں پھنسا سکتی ہیں جن میں یہ ہرگز پھنسنا نہیں چاہتیں، مگر نہیں جانتیں کہ ان کو کیسے محدود رکھا یا روکا جا سکتا ہے۔

یہ موقعہ ایسے خونی تصادمات کی فہرست تیار کرنے کا نہیں ہے، جنہوں نے اس وقت کرہ ارض کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جن میں تنازعات کے پھیلنے بلکہ وبائی شکل اختیار کرنے کے امکانات بھی ہیں، اس طرح غیر مستحکم اور ایٹمی ہتھیاروں سے لیس، روس کو بھی خطرے کی علامت قرار دیا جا سکتا ہے۔

ہم تو شاید اس حقیقت کو بھی مسلسل نظرانداز کئے جا رہے ہیں کہ ایشیا پیسیفک کا علاقہ جو دنیا کی سرگرم اور اہم ترین معیشتوں کا مرکز ہے، تیزی کے ساتھ عدم استحکام کا شکار ہو رہا ہے، سیاسی اور فوجی دونوں لحاظ سے۔

یہ خطہ اگرچہ اس پر بہت سے اہم لوگوں نے توجہ دی ہوگی، پورے کرہ ارض کی اقتصادیات کی بنیاد ہے، لیکن یہی خطہ دنیا کے کسی بھی اور خطے سے زیادہ ایٹمی ہتھیاروں کا علاقہ بنا ہوا ہے۔ اس کے گھیرے میں تازقستان، بھارت اور پاکستان سے لے کر روس، چین اور شمالی کوریا کے ممالک شامل ہیں اور یہ سب یا تو ایٹمی صلاحیت حاصل کر چکے ہیں یا کرنے والے ہیں اور سیاسی لحاظ سے ان میں سے بیشتر دھماکہ خیز صورت حال سے دوچار ہیں۔

ہندوستان میں مذہبی جنونیوں کا غلبہ ہے اوراس کے ساتھ ہی یہ بہت سے مسلح باغی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گروہوں سے بھی برسرِ پیکار ہے۔ چین کا سیاسی مستقبل بجائے خود ایک سوالیہ نشان ہے حالانکہ اس کی فضائیہ روسی مارکہ سکھوئی بمبار طیاروں سے لیس ہے اور فضا میں ایندھن کے حصول کی صلاحیت بھی حاصل کر چکی ہے اور اس کی بحریہ طیارہ بردار جہازوں کے حصول کے لئے بھی پوری تندہی سے کوشاں ہے۔

چین کی ان سرگرمیوں کے جواب میں تائیوان 150 ایف سولہ طیارے امریکہ سے اور پچاس سے ساٹھ میٹروجیٹ فرانس سے خریدتا ہے۔ پورے خطے میں دوسرے ہتھیاروں کی دوڑ بھی جاری ہے۔ یہ سب دیکھتے ہوئے جاپان......جو ایک موقعہ پر دنیا بھر میں ایٹمی یہ ہتھیاروں کی تیاری کا سب سے بڑا مخالف تھا۔ اچانک اعلان کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ ہی ایٹمی ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کا حامی نہیں رہے گا، پیغام بڑا واضح ہے کہ جاپان بھی اب اپنے ایٹمی ہتھیار تیار کرنے کے بارے میں سوچ بچار کر رہا ہے۔ اس کے باوجود اس موجودہ لمحے میں امریکہ کے علیحدگی اور تنہائی پسند، ایشیائی اقوام کی خواہشات کے برعکس، فوجی اخراجات میں کمی کر کے مغربی پیسیفک میں اپنی فوجی موجودگی کا حجم گھٹانے کی بات کر رہے ہیں۔ اصل میں اس طرح وہ اس خطے کے عدم استحکام کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔

لیکن اگر ہم ان مسلسل اور دوسرے علاقائی خطرات کو نظرانداز بھی کر دیں تب بھی ہم بعض ابھرتے ہوئے ایسے واضح نسلی اور گروہی معاملات کا سامنا کرنے پر مجبور ہیں جن میں سے کوئی ایک بھی آنے والے عشروں میں ہمارے لئے دھماکہ خیز ثابت ہوسکتا ہے۔ یہ عالمی نسل پرست ہمیں اس نظریے کے بارے میں شک و شبے میں مبتلا کر رہے ہیں کہ بڑی طاقتیں یا بڑی جمہوریتیں ایک ایسے خطہ امن میں مقیم ہیں جہاں جنگ کے خطرے کے بارے میں سوچا تک نہیں جا سکتا۔ افسوس کہ اب خطہ امن کے اس تصور کو جغرافیائی اقتصادیات کی لاشوں کے ساتھ ہی دفن کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

پگھلتا ہوا سرمایہ

عالمی سطح پر سرمائے کے نظام کے حقیقی طور پر پگھلنے کا ذرا سی دیر کیلئے تصور کیجئے۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سے ابھی تک دنیا کی بڑی معیشتوں کو معمولی سی کساد بازاری ہی کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن سوچئے اگر دنیا منڈی کو تباہ کرنے والی کساد بازاری کا واقعی شکار ہوگئی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تو نام نہاد خطہ امن میں جنگ نہ ہو سکنے کے خیال کا کیا حشر ہوگا؟ جہاں ہم ایسی کساد بازاری کی بات کر رہے ہیں جو تجارتی تحفظات، جنگوں اور دوسرے جغرافیائی اقتصادی مقابلوں کے نتیجے میں شروع ہوتی ہے۔

آج کے سرمائے کا یہ نظام حقیقت میں انتہائی کمزور اور ہمہ جہت خطرات کی زد میں ہے کیونکہ یہ اس وقت تعمیرنو اور تیزی کے ساتھ تیسری لہر کے زمانے کی اقتصادیات کی خدمات انجام دینے کے مراحل میں سے گزر رہا ہے۔ سرمائے کے بہاؤ کو قومی سرحدوں میں آزادی سے حرکت میں لانے کے عمل کو فریب نظر کے شکار سیاستدان اور سرمایہ کاری کے ماہر، ان بہت سے حفاظتی بندوں کو پہلے ہی تہس نہس کر چکے ہیں جو کسی واحد قوم کو تباہی سے بچانے کے لئے تعمیر کئے گئے تھے اور افسوس یہ ہے کہ ان کی جگہ انہوں نے نئے بند باندھنے پر بھی کوئی توجہ نہیں دی۔

عالمی معیشت میں غوطہ کھانے کی اس نسبتاً معمولی اور آخری مثال نیونازی دہشت پسندی اور لاس اینجلس کی آتشزدگی کے واقعات میں نظر آتی ہے۔ اب تو جاپان نے بھی جسے عام طور سے ایک پرامن معاشرہ کا امین سمجھا جاتا ہے، اس وقت سماجی بے چینی کے جھٹکے محسوس کئے جب اس کی ''بلبلہ معیشت'' کا بلبلہ پھوٹ گیا۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر عالمی سرمائے کا موجودہ نظام بکھر گیا تو بظاہر جنگ سے محفوظ خطہ امن کے استحکام اور امن کا حشر کیا ہوگا...... اور یہ بات بڑی واضح ہے کہ سرمائے کے اس نظام کی تباہی کے امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

سرحدی توڑ پھوڑ

فوجی میڈیا، بلقان اور کاکیشیا کے نسلی تصادمات کو آج ''پسماندگی'' کا شاخسانہ قرار دیتا ہے۔ ہم جلد ہی اس نتیجے پر بھی پہنچ سکتے ہیں کہ سرحدوں کی خلاف ورزی محض ''قبائلیت'' یا ''بنیادی نسلی'' احساسات ہی کا نتیجہ نہیں ہے۔

قومی سرحدوں کو دو اور قوتیں بھی چیلنج کر رہی ہیں، علم کی شدت پر مبنی ابھرتی ہوئی تیسری لہر کے زمانے کی معیشت سے برآمد ہونے والی مصنوعات اور خدمات موجودہ قومی سرحدوں کو تیزی کے ساتھ نظرانداز کر رہی ہیں، جیسا کہ ہم سب پہلے سے جانتے ہیں،

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سرحدوں سے ماورا بڑی کمپنیوں کے اتحاد، منڈیاں، سرمائے کا بہاؤ، تحقیقاتی سرگرمیاں، مصنوعات کی تیاری...... یہ سبھی کچھ قومی سرحدوں کو پامال کرتے ہوئے رونما ہو رہا ہے۔ لیکن مبالغہ آمیزی کی حد تک ''گلوبائزیشن'' کا یہ پروپیگنڈہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔

نئی ٹیکنالوجیز کی مدد سے اب بیک وقت بعض مصنوعات اور پیداواری لاگت میں اتنی کمی ہو رہی ہے کہ ان کے تیار کرنے والے اپنی بقاء کے لئے مقامی ملکی منڈیوں کے محتاج نہیں رہے۔ تصویر کھینچنے کے بعد اب اسے ڈویلپ اور پرنٹ کرنے کے لئے کسی کو اپنے کیمرے سے فلم نکال کر نیویارک میں روچسٹر کے مقام پر کوڈک کے پاس بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کام اب گلی کی نکڑ پر واقع دکان سے کم مدت اور کم لاگت میں ہو سکتا ہے۔ یہاں چھوٹے پیمانے پر سستی عدم مرکزیت کی حامل ٹیکنالوجی مہیا ہے۔ ایسی چھوٹی سستی منی ایچر قسم کی ٹیکنالوجیز چاروں طرف تیزی سے پھیل رہی ہیں۔

عدم مرکزیت کی حامل ایسی ٹیکنالوجیز کسی وقت بھی قومی اور علاقائی معیشت کے توازن میں رخنہ ڈال سکتی ہیں ۔ وہ موخرالذکر قسم کی معیشت کو زیادہ قابل قبول بنا سکتی ہیں اور یوں سرحدیں توڑنے والی علیحدگی کی تحریکوں کے لئے تقویت کا باعث بھی۔ اس کے ساتھ ہی ٹیلی ویژن چینلوں کی بڑھتی ہوئی تعداد خواہ یہ فضائی ذریعے اور سٹلائٹ کے واسطے سے کام کر رہی ہو یا کیبل نیٹ ورک کی مدد سے، مقامی پروگراموں میں زیادہ سے زیادہ زبانوں میں پروگرام پیش کرنے کے مواقع مہیا کر رہی ہے جس سے ان ٹیکنیکل اور اقتصادی قوتوں کو مزید مدد ملتی ہے جن کا ہم یہاں ذکر کر رہے ہیں۔

شمالی اٹلی سے سپین اور سکاٹ لینڈ تک یورپ تو پہلے ہی علیحدگی، خودمختاری اور علاقائی گروہوں کی تحریکوں کے سیلاب کی زد میں ہے جو اس کے نقشوں میں تبدیلی پر مصر ہیں اور قومی ریاست کی قوت کے نیچے کی طرف منتقل کرنے کے خواہاں ...... جب کہ برسلز اور یورپی کمیونٹی طاقت کو انفرادی قوتوں سے لے کر اوپر کی طرف لے جانے کی کوششوں میں مصروف ہے۔

اس لئے یہ دوہری تبدیلیاں ایک اوپر سے، دوسری نیچے سے قومی مارکیٹوں اور ان کی طرف سے اپنی سرحدوں کے جواز کی حقیقت پر ضرب لگا رہی ہیں۔ زنبوری نوعیت کے ایسے دباؤ، قوم پرستوں، علاقائیت کے علمبرداروں اور مقامی لوگوں کو بشمول ان کے جو نسلی صفائی کو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اپنا میدان قرار دے رہے ہیں، زیادہ میانہ رو اور معتدل مزاج یورپیوں کے خلاف بھڑکانے میں مدد بہم پہنچا رہے ہیں۔ یہ صورت حال اس خطہ امن میں مسلسل استحکام کے تصور سے قطعاً لگا نہیں کھاتی۔

کینیڈا اور امریکہ کے درمیان واقع سرحد سے زیادہ مستقل شاید ہی کسی دو ملکوں کے درمیان کوئی اور سرحد ہو لیکن کیوبک کے بیشتر باشندے یہ پختہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ باقی ماندہ کینیڈا کے بغیر اقتصادی طور پر زیادہ بہتر زندگی گزار سکتے ہیں۔ کئی عشروں کی جدوجہد کے بعد اگر کیوبک کینیڈا سے علیحدہ ہونے میں کامیاب ہوگیا تو برٹش کولمبیا اور البرٹا بھی کچھ دیر بعد امریکہ میں شمولیت کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ ایک دوسرا منظرنامہ (جو ناتامل قبول تو ہو سکتا ہے ناممکن ہرگز نہیں ہے) ایک نئی سیاسی حقیقت کی تصویر کشی کرتا ہے......اسے قومی ریاست کہیں یا نہیں ......اور وہ ہے کینیڈا کے ان مغربی صوبوں کو امریکہ کی ریاست واشنگٹن اور ریگان اور شاید الاسکا سے مدغم کرنے کا معاملہ۔

ایسی فیڈریشن یا کنفیڈریشن اپنے سفر کا آغاز لامتناہی ذرائع سے کر سکتی ہے جس میں الاسکا کا تیل، البریٹا کی قدرتی گیس اور گندم، واشنگٹن کی ایٹمی فضائی توانائی اور کمپیوٹر انڈسٹری اور ریگان کی لکڑی اور اعلیٰ قسم کی صنعتیں، بڑی بڑی بندرگاہیں اور ایشیا پیسیفک کی تجارت میں اہم خدمات انجام دینے والی نقل وحرکت کی آسانیاں اور اس کے ساتھ ہی انتہائی تعلیم اور تربیت یافتہ محنت کشوں کی موجودگی، یہ سب کچھ مل کر کم از کم تھیوری کی حد تک فوراً ہی اس علاقے کو اقتصادی جن کی شکل میں بدل سکتا ہے جس کے پاس فراواں تجارتی فالتو مال ہوگا جسے عالمی معیشت میں ایک کلیدی عامل کی حیثیت حاصل ہے۔

اندازے قائم کرنے والے کچھ لوگ مستقبل کی دنیا کو آج کی ڈیڑھ دو سو ممالک پر مشتمل دنیا سے علیحدہ اور مختلف شکل میں دیکھ رہے ہیں بلکہ ان کے خیال میں کل کی دنیا میں سینکڑوں نہیں ہزاروں ملک شامل ہوں گے، ان میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں، شہروں پر مشتمل ممالک خطے اور غیر متعددی سیاسی وجود شامل ہوں گے۔ آنے والے عشرے ان سے بھی زیادہ عجیب وغریب امکانات کا سامنا کریں گے کیونکہ موجودہ قومی سرحد میں اس زمانے میں اپنا جواز کھو بیٹھیں گی اور سرحدیں توڑنے والے خطہ امن کے قلب میں مصروف کار ہو جائیں گے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میڈیا گورنمنٹ

یہ خیال کہ جمہوریتیں آپس میں دست و گریبان نہیں ہوتیں، اس مفروضے پر استوار ہے کہ جمہوری ملک ہمیشہ جمہوری ہی رہیں گے۔ یہ سطور لکھتے وقت ہم سوچ رہے ہیں کہ کیا مثال کے طور جرمنی کے بارے میں اس مفروضے پر تکیہ کرنا درست ہوگا۔

جمہوریت پر قیام سے جو مقصد خود بخود متعین ہوتا ہے، اس میں متعلقہ ملک میں سیاسی استحکام یا ممکنہ تبدیلیوں کے عمل میں نظم و ضبط کی موجودگی لازمی متصور ہوتی ہے۔ اس کے باوجود مفروضہ خطہ امن کے بہت سے ممالک تیزی کے ساتھ سیاسی پرسٹورائیکا یا تعمیرنو کے مراحل میں سے گزر رہے ہیں۔

جیسے جیسے یہ ملک زور بازو کی بجائے ذہنی صلاحیتوں کے بل پر وجود میں آنے والی معیشتوں کی طرف گامزن ہوتے ہیں، وسیع پیمانے پر چھانٹیوں اور معمول کی زندگی میں خلل سے انہیں نئی عروج پذیر سیاسی قوت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اعلیٰ ہنر والے دانش مند، محنت کش، غیر ہنرمند پرولتاریہ کی اکھاڑ پچھاڑ کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ چونکہ بنیادی اقتصادی ذرائع اور الیکٹرانک نیٹ ورکس پر علم کا قبضہ ہوتا ہے اور اس انفراسٹرکچر کو میڈیا کنٹرول کرتا ہے اس لئے جن لوگوں کی دسترس میں علم اور ذرائع مواصلات ہوتے ہیں، وہی زیادہ سے زیادہ سیاسی قوت پر قبضہ کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

اس کا ایک اشارہ تو میڈیا کے بڑھتے ہوئے اثرات سے ملتا ہے اور اس کی واضح ترین مثال امریکہ کے1992ء میں ہونے والے انتخابات ہیں، جب ایک واحد ٹیلی ویژن نیٹ ورک سی این این نے صدر جارج بش کی شکست میں فیصلہ کن کردار ادا کیا، حالانکہ اس سے صرف ایک سال قبل اسی سی این این نے خلیج کی جنگ کی زبردست کوریج کرتے ہوئے، بش کی مقبولیت کو بام عروج تک پہنچا دیا تھا۔

سات ماہ بعد یہی ری پبلکن بش دوبارہ صدر بننے کا خواب پورا نہ کر سکے۔ ڈیموکریٹک بل کلنٹن جیت گیا......لیکن اس نے اپنی پارٹی کے پہلے امیدوار کے مقابلے میں کم ووٹ حاصل کئے۔ یہ سابق امیدوار مائیکل ڈکاکس تھا جس نے1988ء میں شکست کھائی تھی۔ کلنٹن تھوڑی سی اکثریت سے اس لئے جیت گیا کیونکہ ایک تیسرے امیدوار راس پیروٹ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے دونوں بڑی پارٹیوں کے امیدواروں کے ووٹ توڑ لئے تھے اس کے علاوہ ری پبلکن پارٹی کے پیرو بخانن نے ری پبلکن پارٹی کے داخلی حلقوں میں اختلافات بڑھا کر صورت حال خراب کر دی تھی۔

ارب پتی سیاستدان پیرو عملاً سی این این کی تخلیق تھا جس نے اس کی انتخابی مہم اپنے کیمروں کے سامنے سے شروع کی اور اس کے بعد اس کو بار بار اپنے کسی نہ کسی چینل کے ذریعے لوگوں کے سامنے لاتا رہا۔ بخانن میں اپنی سیاسی مہم سے قبل سی این این کے ایک روزانہ شو ''کراس فائر'' کا میزبان تھا۔ امریکہ میں اس سے قبل کسی بھی سیاسی مہم میں اتنا اہم کردار کبھی انجام نہیں دیا گیا، واحد چینل کی بات ہی چھوڑ دیجئے۔

لیکن نیا میڈیا انتخابی نتائج تبدیل کرنے کے علاوہ بھی بہت سے اہم کام انجام دیتا ہے۔ پہلے کسی ایک بحران پر کیمرہ مرتکز کر کے پھر تقریباً ایک منٹ بعد دوسرے پر اور یوں میڈیا پبلک ایجنڈا سیٹ کر کے سیاستدانوں کو بحرانوں اور نزاعی امور طے کرنے پر اکساتا رہتا ہے۔ آج اسقاط حمل کی بحث چل رہی ہے تو کل کرپشن کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس کے بعد ٹیکسوں کی بات آتی ہے، پھر جنسی ہراسانی کے واقعات ہیں، حکومتی خسارے کے معاملات ہیں، نسلی تشدد کے قصے ہیں، آفت زدگان کی امداد کے مسائل ہیں، جرائم ہیں...... ان سب کا مجموعی اثر سیاسی زندگی کی رفتار بڑھاتا ہے اور بڑھتے ہوئے پیچیدہ مسائل کے بارے میں حکومت کو تیز رفتاری کے ساتھ فیصلے کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

لیکن جو کچھ ہم نے اب تک دیکھا ہے، وہ سیاسی اقتدار کے لئے میڈیا کی آنے والی مہم کا محض آغاز ہے۔ کلنٹن، بش اور پیروٹ کی مہمیں زیادہ تر طے شدہ ٹی وی شوز پر چلائی گئیں جو اب بھی پرانے بلکہ فرسودہ طریقوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ریڈیو ٹاک شوز بھی اس وقت سے حکومت کی تجاویز، تقرریوں اور سکینڈلوں پر فوری ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے بڑے منظّم طریقے سے سیاسی اختلافات کو ہوا دینے اور منظّم کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ بات چیت جاری رکھنے کے یہ ماہر اپنے خطوط، فون اور وفود کے دباؤ سے بلاشبہ واشنگٹن کو غرق کرنے کی استعداد رکھتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں یہ تو محض آغاز ہے۔ مستقبل کے ٹیلی ویژن سیٹ ان سرگرمیوں کو سہل اور ہمہ جہت بنا دیں گے اور یوں مواصلات کی یک طرفہ قوت میں کمی کا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ذریعہ بنیں گے۔ میڈیا کے آغاز یعنی صنعتی انقلاب کے ابتدائی زمانے ہی سے سیاست دانوں اور حکومتوں کا وسیع پیمانے پر اس پر انحصار رہا ہے۔

آج کی سست رفتار امریکی کانگرس، اسمبلیاں اور عدالتیں پہلی لہر کے زمانے کی پیداوار ہیں۔ آج کی جناتی وزارتیں اور نوکرشاہی کے آثار زیادہ تر دوسری لہر کے عہد کی یادگار ہیں۔ کل کا میڈیا، کیبل، ٹیلی ویژن سے براہ راست نشریات، سیٹلائٹ سے کمپیوٹر نیٹ ورکس اور دوسرے سسٹم تیسری لہر کے زمانے کی پیداوار ہیں۔ جو لوگ انہیں چلا رہے ہیں وہ پہلے سے موجود سیاسی اشرافیہ کو چیلنج بھی کرنے والے ہیں......اور یوں وہی سیاسی جدوجہد کو نئی شکل دینے کا موجب ہوں گے۔

ہر جدید جمہوریت میں سیاست دانوں اور نوکرشاہی کے درمیان اب تک سیاسی جنگ متواتر جاری ہے۔ حصول اقتدار کے لئے جاری یہ مخفی جنگ دائیں یا بائیں بازو کی جماعتوں کی کھلم کھلا جنگ کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہم ہے۔ خال خال مستثنیات کو چھوڑ کر پیرس اور بون سے لے کر ٹوکیو اور واشنگٹن تک سیاسی جدوجہد کی یہی حقیقی شکل ہے۔

بہرحال جیسے میڈیا کا ناخوشگوار سیاسی دباؤ یا اثر بڑھتا ہے۔ اقتدار کی پرانی دوطرفہ لڑائی سہ رخی جنگ کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جس میں پارلیمنٹرین، نوکرشاہی کے کل پرزے اور اب میڈیا کے لوگ ایک دوسرے کے سامنے غیر مستحکم اتحاد میں بندھے ڈٹے کھڑے ہیں۔

اسی دوران میں ہر ملک میں اس کی سرحدوں کے باہر سے عقیدوں کے طوفان، سیاسی پروپیگنڈے، ثقافتی حملے وغیرہ براہ راست نشریات، سٹلائٹ اور دوسرے ترقی یافتہ نظاموں کی مدد سے آندھی کی طرح سرحدوں کے اندر گھس کر میزبان ملک کے سیاستدانوں اور نوکرشاہی دونوں کو یکساں طور پر کمزور کرتے رہیں گے۔ سرحدوں سے ماورا ڈیجیٹل نیٹ ورکس، گرین نیٹ، گاس نیٹ، پیس منٹ اور آئسر نیکس جیسے ناموں سے سیاسی طور پر سرگرم کارکنوں کو تنزانیہ اور تھائی لینڈ سے لے کر امریکہ اور یوراگوئے تک، 92 ملکوں میں رابطے کا کام کر رہے ہیں۔ نیونازیوں کے اپنے نیٹ ورکس میں کل کے میڈیا زدہ سیاسی سسٹم میں اوپر سے احکامات کی بجاآوری پر اتفاق رائے مشکل سے مشکل تر ہوتا جائے گا۔

جیسے جیسے منتخب سیاستدانوں، مقررہ بیوروکریٹس اور میڈیا کے نمائندوں میں جو نہ منتخب ہیں اور نہ جن کا تقرر ہوا ہے، اقتدار کی جنگ تیز ہوتی جائے گی۔ جمہوری ریاستوں کے فوجی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیڈر اپنے آپ کو دوہری پابندیوں میں گھرا ہوا پائیں گے جس سے فوج پر شہری حکومتوں کے کنٹرول کے جمہوری اصولوں ہی کے خطرے میں پڑنے کا امکان واضح طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ چونکہ فوجی خطرے اور بحران اتفاق رائے پر پہنچنے سے پہلے ہی حقیقت کا روپ اختیار کر سکتے ہیں اس لئے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عمل کی نوبت آنے سے پہلے ہی فوج کو بے اثر کر دیا جائے یا پھر یہ جمہوری سپورٹ کے بغیر ازخود بھی جنگ میں کود سکتی ہے۔

سیاسی پریسٹورائیکا دونوں حالتوں میں اس استحکام سے الٹ تصویر پیش کرتا ہے جس میں خطہ امن کو ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔

بین الاقوامی طور پر متروک

اس سے بھی بدتر صورت حال یہ ہوسکتی ہے کہ پرانے سفارتی آداب ہی......معہ اقوام متحدہ اور متعدد دوسرے بین الاقوامی اداروں کے......فرسودہ ہو جائیں۔

ایک نئی اور مضبوط اقوام متحدہ کے قیام کے بارے میں کافی احمقانہ تحریریں منظر عام پر آ چکی ہیں، جب تک ایسے ڈرامائی طریقوں سے......جن پر ابھی تک بحث کا آغاز ہی نہیں ہوا، اس ادارے کا نیا ڈھانچہ وجود میں نہیں لایا جاتا۔ اس وقت تک اقوام متحدہ سے آنے والے کئی عشروں میں کم اہم کردار ادا کرنے کی توقع تو کی جا سکتی ہے مگر عالمی امور میں بڑا اور اہم کردار ادا کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

ایسا اس لئے ہے کہ اقوام متحدہ اب بھی وہی کچھ ہے جو یہ اپنے آغاز میں تھی، یعنی قومی ریاستوں کا ایک کلب، لیکن آنے والے برسوں میں واقعات کے بہاؤ پر ایسے غیرقومی کھلاڑی زیادہ اثرانداز ہونے لگیں گے جن میں عالمی تجارت، سرحدوں سے ماورا سیاسی تحریکیں مثلاً گرین پیس اور اسلام جیسی مذہبی تحریکیں اور بھڑکتے ہوئے نسلی گروپ شامل ہیں جو دنیا کو نسلی بنیادوں پر تقسیم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ مثال کے طور پر سلاوز یا بعض ترک جو ایک نئی عثمانی سلطنت کے خواب دیکھ رہے ہیں جو ترکوں اور ترکی زبان بولنے والوں کو ساحل سے دور قبرص میں رہنے والے ترکوں سے لے کر چین کی سرحدوں سے ملتے ہوئے کرغیزستان تک متحد کر دیے۔

ایسے بین الاقوامی ادارے جو کمزوروں اور ناتوانوں کو اپنے ساتھ ملا کر نہیں چل

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سکیں گے یا غیر قومی ریاستوں کی طاقت کے نئے ذرائع کو تباہ نہیں کر سکیں گے، خود بھی بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔

باہمی انحصار کا ڈراوا

خطہ امن کے جواز میں جو آخری خرافات گھڑی گئی ہے اس کی درستگی بھی ضروری ہے اور یہ ہے پرامن باہمی انحصار کا نظریہ۔

جیو اکنامکس کے ماننے والے اور کچھ دوسرے لوگ یہ منطق بگھارتے ہیں کہ جب قومیں تجارت اور سرمایہ کاری کے لئے ایک دوسرے پر زیادہ انحصار کرنے لگیں تو فوجی تصادمات کا خطرہ کم ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں، جرمنی اور انگلستان کی مثال پر غور کریں، کس طرح کل کے پرانے حریف، اب پرامن بقائے باہمی کے اصول پر عمل پیرا ہیں۔ جس حقیقت کو یہ صاحبان نظر انداز کر دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ جب 1914ء میں جرمنی اور انگلستان کے درمیان جنگ چھڑی تھی تو ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کا تجارتی حصے دار تھا۔ تاریخ کی کتابیں ایسی اور بھی متعدد مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔

ایک اور حقیقت جو بہت اہم ہے اور جس پر اب تک توجہ نہیں دی گئی، یہ ہے کہ جہاں باہمی انحصار قوموں کے درمیان تعلقات استوار کر سکتا ہے وہیں یہ دنیا کو زیادہ پیچیدہ شکل دینے کا موجب بھی ہو سکتا ہے۔ باہمی انحصار کا مطلب یہ ہوا کہ ملک الف ملک ب کے خلاف، نتائج وعواقب اور ردعمل کا وغیرہ مول لئے بغیر کاروائی نہیں کر سکتا وغیرہ غیرہ۔ صورت یہ ہے کہ جاپانی ڈائٹ (پارلیمنٹ) میں لئے گئے بعض فیصلے امریکہ میں کارسازی سے متعلق محنت کشوں یا پراپرٹی کی تجارت میں سرمایہ کاری کرنے والوں پر زیادہ شدت سے اثر انداز ہو سکتے ہیں، بہ نسبت امریکی کانگرس کے فیصلوں کے، امریکہ میں فائبر آپٹیکس کی طرف راغب ہونے کا مطلب اصولاً چلی میں تانبے کی قیمتوں میں کمی اور زمبیا میں جہاں تانبے کی برآمد حکومت کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ہے، سیاسی عدم استحکام ہو سکتا ہے۔ برازیل میں ماحولیاتی قواعد، لکڑی کے داموں میں رد و بدل ملائشیا میں لکڑیاں کاٹنے اور برآمد کرنے والوں کی زندگی میں ہلچل پیدا کر سکتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی مرکزی حکومت اور اس کے مختلف خطوں پر حکمرانی کرنے والے سلاطین کے سیاسی تعلقات بگڑ سکتے ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باہمی انحصار کا عمل جتنا زیادہ بڑھے گا، جتنے زیادہ ممالک اس کے اثر میں آئیں گے، اس کے نتائج بھی اتنے ہی پیچیدہ اور ناقابل عمل ہوتے جائیں گے۔ اس کے باوجود باہمی رشتے پہلے ہی اتنے الجھے ہوئے اور پیچیدہ ہیں کہ اب ذہین ترین سیاستدانوں اور ماہرین کے لئے بھی اپنے ہی فیصلوں کے پہلے یا دوسرے دور کے فیصلوں کو ہضم کرنا ممکن نہیں ہوگا۔

دوسرے لفظوں میں یہ بات یوں کہی جاسکتی ہے کہ فوری نوعیت کے سوا ہمارے فیصلہ کرنے والوں کو خود بھی اس کا پتہ نہیں ہوتا۔ اس کی بجائے بے انتہا پیچیدگیوں کی موجودگی میں ان کی جہالت، مقاصد اور عمل کے درمیان کش مکش کی بناء پر رشتوں کو مزید کمزور کردیتی ہے، محض خام خیالی باقی رہ جاتی ہے۔ اتفاق اس میں زیادہ بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ غیر متوقع نتائج کے خطرات آسمان کو چھونے لگتے ہیں اور غلط اندازے کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ باہمی انحصار دنیا کو زیادہ محفوظ بنا سکے۔ بعض اوقات نتیجہ اس کے الٹ ہو جاتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ ہر وہ مفروضہ جس کی بنیاد پر خطہ امن کی تھیوری تشکیل دی گئی ہے، اقتصادی نمو، سرحدوں کے ناقابل شکست ہونے کی بات، سیاسی استحکام گفت و شنید اور مشاورت کا وقت، بین لاقوامی تنظیموں اور اداروں کی اثر آفرینی وغیرہ......اب انتہائی مشکوک ہو چکے ہیں۔

جہاں بظاہر یہ تمام عوامل ایک دوسرے سے غیر متعلق نظر آتے ہیں، وہاں حقیقتاً ان میں سے ہر ایک یہاں دہرائے جانے والی نئی اور زیادہ خطرناک شرائط میں سے ہر ایک کا راہ براست یا باالواسطہ نتیجہ ہے، دولت آفرینی کے ایک نئے سسٹم کے عروج سے ان بنیادی مسائل سے آگے پیش آنے والی مہلک مشکلات کا اندازہ ہوتا ہے۔ تہذیب اور ایٹمی ہتھیاروں کے معالے کو ساتھ ملانے کے بعد دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس سے آگے ایسے جیوا کنا مک کے امن کے عہد کا پتہ نہیں چلتا جو ایک مستحکم عالمی نظام یا جمہوری خطہ امن کی نوید دیتا ہو بلکہ جنگ کے بڑھتے ہوئے خطرات منڈلاتے نظر آتے ہیں، جن میں چھوٹی طاقتیں ہی نہیں، عظیم اور بڑی قوتیں بھی الجھتی نظر آ رہی ہیں۔

نہ ہی اس صورت حال سے ان طویل المدتی خطرات میں کمی کے آثار ہیں جن کا ہمیں سامنا ہے۔ جیسا کہ ہم آئندہ صفحات میں دیکھیں گے، ہمیں عظیم تر تاریخی پیمانوں اور امکانات سے پُر متعدد چیلنجوں کو بھگتنا ہے......جن میں سے کوئی ایک عالمی جنگ نہ سہی، اس

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے ملتی جلتی کوئی خوفناک چیز ضرور پیش کر سکتا ہے۔

ان خطرات کو کم کرنے کے لئے ہمیں آنے والی جنگوں اور تدارک جنگ کی کوششوں میں بے رحمانہ حد تک حقیقت پسند ہونا چاہیے، خوابوں کی سرزمین سے باہر نکلنے کا وقت آ گیا ہے۔

تین حصوں میں بٹی دنیا

اشرافیہ، صدیوں سے غریبوں کی بغاوت سے خوفزدہ اور اپنے آپ کو اس سے بچانے میں مشغول چلی آ رہی ہے۔ زرعی اور صنعتی دونوں معاشروں کی تاریخ، غلاموں، محکوموں اور محنت کشوں کی خوں ریز بغاوتوں کے واقعات سے بھری پڑی ہے، لیکن تیسری لہر کے زمانے میں اس صورت حال میں ایک حیرت انگیز تبدیلی دیکھنے میں آ رہی ہے اور وہ ہے امراء کی طرف سے بغاوت کے بڑھتے ہوئے امکانات کا خطرہ۔

سوویت یونین جب انتشار کا شکار ہوا تو اس کی بالٹک ریاستیں اور یوکرائن وغیرہ علیحدگی کے لئے سب سے زیادہ سرگرم تھیں۔ یہ سب مغربی یورپ کے قریب واقع تھیں اور ویسے بھی نسبتاً زیادہ خوش حال اور صنعتی طور پر زیادہ ترقی یافتہ تھیں۔

دوسری لہر کے زمانے کی ان ریاستوں کی اشرافیہ.....جن میں زیادہ تر کمیونسٹ پارٹی کی نوکر شاہی سے وابستہ افراد اور صنعتی منیجرز شامل تھے...... اپنے آپ کو اپاہج، معذور اور ماسکو کے محصولات کے بوجھ تلے دبا ہوا پاتے تھے۔ مغرب کی طرف نظر اٹھانے پر جرمنی، فرانس اور دوسری ایسی قومیں ان کی نظر کے سامنے ہوتیں جو روایتی عہد سے آگے بڑھ کر تیسری لہر کے زمانے کی معیشت کی طرف رواں دواں تھیں۔ اس لئے وہ اپنی اقتصادیات کی گرہ بھی مغربی یورپ کے راکٹ ہی سے باندھنا چاہتی تھیں۔

اس کے مقابلے میں سوویت یونین سے علیحدگی کے بارے میں ہچکچاہٹ کی شکار ریاستیں یورپ سے دور غریب ترین اور زیادہ تر زرعی تھیں، بہت حد تک پہلی لہر کی ان مسلم ریاستوں کی اشرافیہ کہلاتی تو کمیونسٹ ہی تھی مگر اس سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا کردار کرپٹ اور مطلق العنان جاگیرداروں سے ملتا جلتا تھا جو ذاتی خاندانی یا دیہی روایات کے زور پر کام چلا رہے تھے۔ وہ ماسکو کی طرف اپنے تحفظ اور وہاں سے جاری ہونے والی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہدایات کے لئے دیکھتے تھے۔ یوں پہلی لہر اور دوسری لہر کے زمانے کے خطے شدید مخالف صفوں میں ڈٹے ہوئے تھے۔

یہ تمام لوگ اپنے ذاتی مفادات کو علم لہرانے، نسلی لسانی حتیٰ کہ ماحولیاتی اپیلوں کے نقاب میں چھپائے رہتے۔ اس کے نتیجہ میں رونما ہونے والے فسادات کے پیچھے بہرحال ایک دوسرے کی شدید مخالفت پر مبنی اقتصادی اور سیاسی خواہشات کارفرما تھیں۔ جب پہلی اور دوسرے لہر کی اشرافیہ کے تضادات اتنے زیادہ ہوگئے کہ گورباچوف کے لئے مصالحت کی گنجائش ہی باقی نہ رہی تو پھر سوویت یونین کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانا ممکن نہ رہا۔

چین کا روگ

دوسری بڑی قوموں کے ایکسرے میں پہلی، دوسری اور تیسری لہر کے زمانے کے اختلافات کی بنیاد پر سامنے آنے والی ایسی ہی خرابیوں کی نشان دہی ہوتی ہے۔

چین کی مثال لے لیجئے۔ آج ایک ارب بیس کروڑ چینیوں میں سے اسّی کروڑ سے زائد چینی دورافتادہ دیہی علاقوں میں بسنے والے کسان ہیں جو آج بھی انہی حالات میں زمین سے رزق پیدا کر رہے ہیں جن میں ان کے آباؤاجداد انتہائی غربت کے عالم میں صدیوں پہلے سے کرتے رہے ہیں۔ گوئی زد ہو اوران ہوائی کے علاقوں میں بھوکے بچوں کے پھولے ہوئے جسم آج بھی بوسیدہ جھونپڑیوں اور غربت کے دوسرے آثار کے ساتھ واضح طور سے دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ پہلی لہر کے دور کا چین ہے۔

چین کے ساحلی صوبے اس کے مقابلے میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں۔ کارخانوں سے لدے ہوئے گوانڈ رنگ میں دھواں اگلتی چمنیاں آسمان کو چھو رہی ہیں اور کاروباری لوگ (بشمول پرانے کمیونسٹوں کے) عالمی معیشت میں پوری طرح دھنسے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے سامنے کی اور قریبی مثالیں ہانگ کانگ، تائیوان اور سنگاپور کی ہیں جو اپنے آپ کو تیزی کے ساتھ دوسری لہر کے زمانے سے تیسری لہر کی اعلیٰ فنی معیشت میں تبدیل کر رہے ہیں۔ سرحدی صوبے ان تینوں نام نہاد ''شیروں'' کو اپنی ترقی کے ماڈل کے طور پر دیکھ رہے ہیں اور اپنی معیشت کو ان کے ساتھ مربوط کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نئے شہر......جن میں سے کچھ دوسری لہر کے سستی لیبر کے زمانے کی پیداواری سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور کچھ دوسری تیسری لہر کے زمانے کی ٹیکنالوجی کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں...... پرامید بھی ہیں اورانتہائی کاروباری بھی۔ اور جو جارحانہ طور پر آزاد ہیں۔ فیکس، موبائل، لگژری کاروں سے مستفید ہونے والے چین کی سرکاری زبان فیڈا ون کی بجائے کاروباری زبان میں بات چیت کرتے ہوئے یہ لوگ وین کوور اور لاس اینجلس سے لے کر جاکرتہ، کوالالمپور اور منیلا تک پھیلی ہوئی چینی قومیتوں کا حصہ ہیں۔ وہ پہلی لہر کے زمانے کے چین کی سرحدوں کے اندر بسنے والے چینیوں سے زیادہ بیرون ملک مقیم چینیوں کے لائف سٹائل پر عمل پیرا اور انہی کی طرح اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔

یہ لوگ بیجنگ کے حکومتی اقتصادی ماہروں کی ناک کے نتھنے پر پہلے ہی اپنا اجتماعی انگوٹھا، رکھ کے ان کے خلاف حقارت کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس میں زیادہ وقت نہیں ہے جب وہ بیجنگ کی سیاسی مداخلت نامنظور کرنے کا اعلان کر دیں گے اور دیہی علاقوں کی بہتری یا زرعی بے چینی دور کرنے کے لئے درکار فنڈز بھی مرکزی حکومت کو دینے سے انکاری ہو جائیں گے۔ جب تک بیجنگ انہیں کلی مالی اور سیاسی آزادی نہیں دے دیتا یہ نئی اشرافیہ اپنی آزادی یا کم از کم اس کے کسی قسم کے چربے کے حصول کے لئے اصرار کرتی رہے گی...... یہ ایک ایسا اقدام ہے جو چین کی توڑ پھوڑ پر بھی منتج ہوسکتا ہے اور خانہ جنگی کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔

سرمایہ کاری کو درپیش شدید خطرات کے پیش نظر جاپان، کوریا، تائیوان اور دوسرے ممالک فریق بننے پر بھی مجبور ہو سکتے ہیں اور یوں وہ اپنے آپ کو اپنی رضا کے بغیر آگ کے ان شعلوں میں گھرا ہوا پائیں گے جن کا اس کے بعد بھڑک اٹھنا لازم ہے۔ یہ منظرنامہ اگرچہ محض قیاس آرائی پر مبنی ہے مگر ناممکن نہیں ہے، تاریخ ایسی لڑائیوں اور بغاوتوں کے ذکر سے اٹی پڑی ہے جن کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔

امراء، علیحدگی کی طرف

بھارت اپنی 85 کروڑ (اب ایک ارب) آبادی کے ساتھ آبادی کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے اور اس کی تین حصوں میں بٹی ہوئی اشرافیہ بھی اسی نوع کے تضادات کی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شکار ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ یہاں بھی کسانوں کی ایک کثیر تعداد صدیوں پرانے زمانے میں بس رہی ہے۔ یہاں ایک خوش حال صنعتی شعبہ بھی نظر آتا ہے جس سے اندازاً دس سے پندرہ کروڑ افراد وابستہ ہیں اور یہیں ہمیں ایک چھوٹا سا مگر تیزی سے آگے بڑھتا ہوا ایسا طبقہ تیسری لہر کے شعبے کی طرف رواں نظر آتا ہے جس کے ارکان انٹرنیٹ اور عالمی مواصلات کے شعبوں سے جڑے ہوئے ہیں جو اپنے گھروں میں اپنے ذاتی کمپیوٹروں پر کام کرتے ہوئے سافٹ ویئر اور اعلیٰ فنی صلاحیتوں سے پیدا کی جانے والی اشیاء کی برآمد کے عمل میں مصروف ہیں اور یوں روزمرہ کی ایک ایسی حقیقت میں گزر بسر کر رہے ہیں جو معاشرے کے باقی ماندہ حصے سے یکسر مختلف ہے۔

ہندوستان کے ٹیلی ویژن کے میوزک پروگراموں پر ایک نظر یا جنوبی دہلی میں واقع لاجپت رائے مارکیٹ کا ایک چکر لگانے سے پرانی اور نئی زندگی کے ان دونوں شعبوں کے درمیان موجود فرق پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ وہاں گاہک سٹلائٹ ڈشوں، لیڈز، اشاروں کی تفہیم کے آلات، ویڈیو ریکارڈر اور ایسے بہت سے دوسرے جدید آلات کی قیمتوں پر جو تیسری لہر کی دنیا کی طرف لے جاتے ہیں، خوانچہ فروشوں سے تکرار کرتے نظر آتے ہیں۔

ہندوستان علیحدگی کی ایسی تحریکوں کی وجہ سے پہلے ہی مشکلات میں گھرا ہوا ہے جن کی بنیاد نسلی اور مذہبی اختلافات ہیں۔ اگر ہم ان کا بنظر غائر جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ چین اور روس کی طرح یہاں بھی اشرافیہ تین حصوں میں بٹی ہوئی نظر آئے گی جن میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا اقتصادی اور سیاسی ایجنڈا ہے اور جو قوم کو مذہب اور نسل کی بنیاد پر اختلافات کی بھینٹ چڑھا رہا ہے۔

برازیل کی ساڑھے پندرہ کروڑ آبادی کا بھی یہی عالم ہے۔ کام کرنے کے قابل افراد کا کم سے کم چالیس فیصدی حصہ زرعی شعبے سے وابستہ ہے اور اس کی غالب اکثریت بہت برے حالات میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ ایک بڑا صنعتی شعبہ اور ایک تیز مگر تیزی سے بڑھتی ہوئی اقلیت جو تیسری لہر کے زمانے سے متعلق ہے باقی کے برازیل پر مشتمل ہے۔

جب شمالی جنوب کے پہلی لہر کے دور سے تعلق رکھنے والے کسان فاقہ کشی کے شکار ہیں اور دوسری لہر کے زمانے کے ساتھ پالو، ریو اور برازیل کی طرف نقل مکانی کر کے آنے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

والے کنٹرول سے باہر تارکین سے یہ علاقہ اٹا پڑا ہے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ ساؤ پالو، ریو اور برازیل کو پہلے ہی گرانڈ ڈرسل میں علیحدگی کی ایک منظم تحریک کا سامنا ہے۔ واضح رہے کہ اس تحریک کا مرکز جنوب کا حصہ نسبتاً خوش حال ہے جہاں خواندگی کی شرح 89 فیصدی ہے اور جہاں پر پانچ گھروں میں سے چار میں فون کی سہولت موجود ہے۔

قومی آمدنی میں جنوب کا حصہ 76 فیصدی ہے لیکن حکومت میں اس کی نمائندگی شمال اور شمال مشرق کے مقابلے ہیں جن کا آمدنی میں حصہ صرف 18 فیصدی ہے، بہت کم ہے۔ جنوب کے رہنے والوں کا اصرار ہے کہ وہ شمال کی مالی مدد کر رہے ہیں۔ وہ مذاقاً یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر برازیل کی سرحدیں ریو کے شمال تک سکڑ جائیں تو یہ انتہائی امیر ملک بن جائے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنی قومی آمدنی کا پندرہ فیصدی براسیلیا بھیجتے ہیں اور وہاں سے انہیں صرف 9 فیصدی واپس ملتا ہے۔

برازیل کے حصے بخرے کی مانگ کرنے والی ایک جماعت کا لیڈر کہتا ہے، ''علیحدگی ہی برازیل کو پسماندگی کی دلدل سے باہر نکالنے کا واحد راستہ ہے'' یہ شہری اختلافات کا ایک راستہ بھی ہوسکتا ہے۔

یہ غصے بھری مگر آگہی بخش آوازیں بھی ہم دنیا کے مختلف حصوں سے سن رہے ہیں جن میں تہذیبوں کے اس تصادم کے نتیجے میں خوش حال لوگ اپنی بات کہہ رہے ہیں اور وہ یہ کہ امراء علیحدہ ہونا چاہتے ہیں۔

بہت سے لوگ اگر بلند آواز میں نہیں بھی کہہ رہے ہیں تو یہ سوچ ضرور رہے ہیں کہ ہم اپنی ضرورت کی اشیاء خرید سکتے ہیں اور اپنا مال باہر بیچ سکتے ہیں تو پھر ہم بھوکے ننگے لوگوں سے کیوں جڑے رہیں جب کہ ہمارے کارخانوں اور دفاتر میں کم تعداد میں اعلیٰ تربیت یافتہ اور ہنرمند لوگوں سے تیسری لہر کے زمانے کے قریب آنے کی وجہ سے مستقبل میں آسانی سے کام چل سکتا ہے۔''

یہ اختلافات تشدد کی راہ اختیار کرتے ہیں یا نہیں اور بڑی طاقتوں پر ان کے اثرات کیا ہو سکتے ہیں، اس کا انحصار، جزوی طور پر اس پر ہے کہ عالمی معیشت کو محفوظ علاقوں میں بانٹنے کی کوششیں کیسے کی جاتی ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایشیا کا چیلنج

بیسویں صدی کے وسط میں امریکہ وہ واحد ملک تھا جس کی دوسری لہر کی معیشت کو دوسری جنگ عظیم نے برباد نہیں کیا تھا اور یوں اسے بہت سی اشیاء کی جن میں موٹر کاروں سے لے کر گھریلو ضرورت کی متعدد، مشینری اور دوسری مصنوعات شامل تھیں برآمد میں اجارہ داری حاصل تھی۔

امریکہ کی مدد سے جیسے جیسے جاپان اور دوسری یورپی اقوام جنگ کی تباہ کاریوں سے بچ کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوتے گئے، کچھ چیزوں کی برآمد میں امریکہ کے مقابلے میں آتے گئے، مگر صرف ستر کے عشرے میں جب جاپان نے تیسری لہر کے زمانے کے پیداواری طریقوں کو منظّم طور سے متعارف کرنے اور دوسری لہر کے زمانے کے بہت سے ذرائع کو کم ترقی یافتہ ایشیائی کی طرف منتقل کرنا شروع کیا تو امریکی اور یورپی منڈیوں پر اس کا حملہ شروع ہوا۔ اس وقت تک اعلیٰ ترین معیاری مصنوعات کی پیداوار میں وہ بہت آگے بڑھ چکا تھا۔

جاپان کی منافع خوری میں جب زبردست اضافہ ہوا تو اس نے بہت سے جنوب ایشیائی ممالک میں سرمایہ کاری بھی شروع کر دی جس سے ان ملکوں میں ترقی کی رفتار بڑھی۔ جلد ہی یہ ممالک بھی جارحانہ برآمدات کرنے والوں میں شامل ہوتے گئے جس سے شدید عالمی مقابلے کے رجحان کو تقویت ملی۔ آج ساحلی چین کی اس قطار میں شمولیت کے بعد، منڈیوں کی لڑائی پوری طرح گرم ہو چکی ہے اور جیسے جیسے یہ ملک اپنی دوسری لہر کے زمانے کی سستی لیبر پر کام کرنے والی فیکٹریوں کی جگہ تیسری لہر کے زمانے کی ترقی یافتہ فیکٹریاں میدان میں لاتے جائیں گے، مقابلہ کی شدت میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا۔

مقابلے کی اس شدید لہر کا سامنا کرتے ہوئے، امریکہ کے کارپوریٹ (بڑی بڑی شراکتی کمپنیاں) ادارے، ٹریڈ یونین کی مدد اور تعاون سے پورے زور شور سے ایسا پراپیگنڈہ کر رہے ہیں جس میں چچا سام سے گھریلو پیداوار کو تحفظ دینے یا ''سب سی ڈائز'' کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ یورپ میں ایشیا سے درآمدات کی ممانعت کا مطالبہ اس کے متوازی بلکہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس سے بھی زیادہ شدید صورت میں سامنے آ رہا ہے۔

جلتی ہوئی تیلی

مورخ ہمیں بتاتے ہیں کہ 1930ء کے عشرے میں ایک کے بعد دوسرے ملک نے تجارتی بند باندھ کر ایک دوسرے کی معیشتوں کو تباہ کیا۔ بے روزگاری کی صورت حال زیادہ خراب کی۔ قومی جذبات کو ممکنہ حد تک بھڑکایا، قوموں کو سیاسی ہیجان میں مبتلا کیا، نازی ازم اور سٹالن ازم کو فروغ دیا اور ایسی تیلی کو آگ لگائی جس نے پوری دنیا کو تاریخ کی سب سے تباہ کن جنگ کے شعلوں کی لپیٹ میں دے دیا۔ اس کے باوجود آج اقتصادی ماہرین اور سیاستدان جو ان یادوں کو تازہ کر رہے ہیں اور بند علاقائی تجارتی بلاکوں میں مضمر خطرات کی نشاندہی بھی' ان کی تکمیل میں بھی مصروف نظر آتے ہیں۔

کسی بھی دوسرے میدان میں منافقت کا مظاہرہ اتنی بے حیائی سے نہیں ہوتا۔ جاپانی، بیرونی مقابلے کو محدود کرنے اور اپنی برآمدات کو عالمی منڈیوں کے ہر شگاف میں سے گزارنے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں اور اس بات سے صاف انکاری ہیں کہ وہ اپنی منڈیوں کا دفاع کر رہے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی انہیں کھول دینے کے وعدے بھی کرتے ہیں۔

آزاد تجارت کی اپنی تمام تر توانائیوں کے الٹ امریکہ نے درآمدات پر تین ہزار قسم کے محصولات عائد کر رکھے ہیں اور سویٹر اور ٹینس کے جوتوں سے لے کر آئس کریم اور اورنج جوس تک کے کوٹے مقرر کر رکھے ہیں۔ یہ کینیڈا اور میکسیکو سے آزاد تجارت کے معاہدے کرتا ہے اور اس عمل میں ایک ایسا زدن بھی تشکیل دے دیتا ہے جو آگے چل کر کسی وقت ایشیائی برآمدات اور سرمایہ کاری کے دروازے بند کرنے پر منتج ہو سکتا ہے۔ یہ ڈالر کے تحفظ کا اہتمام بھی اس طرح کرتا ہے جس سے درآمدات کی شرح بڑھ جاتی ہے اور یوں ملکی مصنوعات بنانے والوں کو وقتی طور پر فائدہ پہنچتا ہے۔ یورپ اپنے طور پر جہاں جاپان کو سب وشتم کا نشانہ بناتا ہے وہاں اپنے کسانوں کے لئے فضائی آلات اور برقی مصنوعات تیار کرنے والی صنعتوں کو سب سڈی مہیا کرنے کے علاوہ بہت سی نقلی اور مصنوعی تجارتی کاروائیاں بھی کرتا ہے۔ کچھ جنوبی ایشیائی اقوام نے بھی اس دوران اپنا الگ بلاک بنانے کی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بڑ بڑ لگا رکھی ہے۔

اقتصادی حوالہ جات کے سلسلے میں پریس کے ذریعے باہمی توڑ پھوڑ کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔نسلی حملے اور نفرت پھیلانے کے دیگر ایسے ذرائع سے بھی کام لیا جاتا ہے جو تشدد کا رنگ اختیار کر سکتے ہیں، اگر ان مصنوعات کے لئے جن کا پہلے کوئی وجود نہیں تھا، جیسے ترقی یافتہ ماحولیاتی ٹیکنالوجیز، تحفظ کے لئے مشروط اطاعت، حتیٰ کہ طے شدہ تجارت کے نقاب اور دوسرے خوش دلانہ فارمولوں کے تحت بڑی بڑی منڈیاں تشکیل نہ دی گئیں تو یہ صورت حال متعدد اقوام کو مایوسی کی حد تک پہنچا کر ایک ایسی دنیا کو جو پہلے ہی ہتھیاروں کے اتنے بڑے ذخیروں سے لبالب بھری پڑی ہے، تباہ کن محاذ آرائی کی حالت تک پہنچا دے گی۔

اس پرسکون سمندر کو تجارتی بلاکوں میں تقسیم کرنے کا مطلب اصل میں اس کے قلب میں ایک نسلی اور لسانی چکر کھینچنا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس طرح اس کا درمیانی حصہ، تضادات کو خوفناک حد تک نمایاں کر دے گا۔نسلی مذہبی اور اقتصادی......اور یہ سب کچھ اس عالمی نظام پر حملہ آور ہوگا جو پہلے ہی کئی جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کے خطرے سے دوچار ہے۔

مردے کی واپسی

اس قسم کے تناؤ کے نتیجے میں عالمی اختلافات یقیناً مزید وسعت اختیار کر جائیں گے اور پہلے سے موجود شگاف زیادہ بڑے ہو جائیں گے۔مذہبی جنون کا فروغ (جو محض بنیاد پرستی سے مختلف چیز ہے) اکناف عالم میں دماغی خلل، تذبذب اور ہچکچاہٹ پیدا کرنے کا ذریعہ بن رہا ہے۔اسلامی انتہا پسندوں کی ایک حقیر سی اقلیت نئی صلیبی جنگوں اور مسلم دنیا کے جہاد کی تیاری کے بارے میں خیالی کہانیوں کی دہائی دے رہی ہے اور یہود و نصار کو جہاد کی زد میں لانے کی بات بھی کر رہی ہے۔ دوسری طرف مغربی یورپ کے فاشسٹ ''خونخوار'' اسلام کے خلاف اپنے آپ کو عیسائیت کا آخری محافظ بنا کر پیش کر رہے ہیں۔

روس سے جہاں فاشسٹوں نے اپنے آپ کو بنیادی نوع کی عیسائیت کے جھنڈے میں لپیٹ رکھا ہے، ہندوستان سے جہاں ہندوؤں کے منظم اور قاتل گروہ مسلمانوں کو ملیامیٹ کرنے کے پروگرام بنا رہے ہیں۔مشرق وسطیٰ تک جہاں ایران اسلام کے نام پر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دہشت پسندی کو فروغ دے رہا ہے، دنیا ان کروڑوں افراد کو حیرت سے دیکھ رہی ہے جو اپنے آپ کو پیچھے کی طرف بارہویں صدی کے اندھیروں میں دھکیلنے کے مشتاق نظر آ رہے ہیں۔

مذہب کا یہ اچانک اور بظاہر ناقابل توجیہہ ظہور بالعموم اودر بنیاد پرستی کی موجودہ لہر کا معاملہ بالخصوص اس وقت آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے جب ہم متحارب تہذیبوں کی روشنی میں اس پرغور کرتے ہیں۔ جس وقت دوسری لہر نے یورپ کے طول وعرض میں صنعتی تہذیب پھیلانا شروع کی تو کلیسا نے جو عملاً زرعی اراضی کے انتہائی وسیع ابتری پر قابض تھا، اپنا پورا بوجھ پہلی لہر کے زمانے کی زرعی تہذیب کے حق میں ڈال دیا اور یوں نئے ابھرتے ہوئے صنعتی اور تجارتی طبقے اور ان کے دانشوروں اور تہذیبی اتحادیوں کے خلاف زرعی اشرافیہ کا حلیف بن کر سامنے آ گیا۔ اس کے جواب میں صنعتی اور تجارتی قوتوں نے مذہب کو رجعت پسند، غیرسائنی اور غیرجمہوری قوت کا نام دے کر اس کی مخالفت شروع کردی۔ یہی نہیں انہوں نے عملاً سیکولرازم کو صنعتی زندگی کا بنیادی نکتہ قرار دیا۔

یہ تہذیبی جنگ جو تقریباً دوصدیوں تک جاری رہی بالآخر جدیدیت کی کامیابی پر منتج ہوئی......یعنی صنعتی تہذیب کی کامیابی کو تسلیم کرلیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سیکولر سکول اور سیکولر ادارے قائم ہونے لگے اور صنعتی ممالک میں مذہبی طاقتوں کا زوال شروع ہوگیا۔ اسی زمانے میں اپریل 1966ء میں ٹائم میگزین نے اپنی کورسٹوری میں یہ سوال اٹھایا تھا، ''کیا خدا فوت ہوگیا ہے؟''

آج بہرحال تیسری لہر کی معیشت کے تیز سفر اور دوسری لہر کی تہذیب کے آخری بحران کے زمانے میں سیکولرازم پر دوطرفہ حملوں کا آغاز ہو چکا ہے۔ ایک طرف سے مذہبی انتہا پسند، جنہوں نے جدید زندگی کے خلاف اپنی نفرت کبھی ختم نہیں ہونے دی اور ہمیشہ ہی قبل از صنعتی دور کی بنیاد پرستی کو واپس لانے کیلئے کوشاں رہے ہیں۔ اس پرحملہ آور ہیں تو دوسری طرف ''نئے زمانے'' کی تیزی سے بڑھتی ہوئی روحانی تحریکیں اور مذاہب بھی سیکولرازم پر برس رہے ہیں جن کے ماننے والوں میں سے بیشتر اگرچہ لامذہب اور باطل پرست ہیں مگر مذہبی لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں۔

اس لئے اپنے اپنے ملک میں اور پوری دنیا میں دوسری لہر کے زمانے کا سیکولرازم اس

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صورت میں اب اپنے آپ ہی مستقبل کی ترقی پسند فلاسفی کے طور پر باقی نہیں رہا۔

عالمی سطح پر مذہب کی طرف دوبارہ رجوع سے اصل میں اس امر کی نشان دہی ہوتی ہے کہ دوسری لہر کے زمانے کے متروک شدہ عقائد سے مایوسی کا شکار ہونے والے لوگ وہ جگہ پر کرنے کی کوشش میں ہیں جو ان عقائد کے مردہ قرار کے جانے کے بعد خالی ہوگئی ہے...... یہ مارکسزم کی شکل میں ہو یا قوم پرستی کے روپ میں، یا اسے سائنسی اندازفکر کا نام دیا جائے...... پہلی لہر کی دنیا کو دوسری لہر کے زمانے کی دنیا کے استحصالی کردار کے خلاف بھڑکایا جاتا رہا ہے۔ اس طرح یہ نوآبادیاتی دور کی تلخ یادیں ہیں جو پہلی لہر کی اسلامی آبادی کو مغرب کا اتنا مخالف بنا رہی ہیں۔ سوشلزم کی ناکامی کے نتیجے میں روس اور یوگوسلاویہ جارحانہ وطن پرستی اور مذہب کی پناہ لینے پر مجبور ہوئے ہیں۔ یہ تارکین وطن کا خوف ہے جس نے مغربی یورپ کے کئی ملکوں کو عیسائیت کے تحفظ کے نام پر نسل پرستی کی طرف دھکیل دیا ہے۔

دوسری لہر کے زمانے کی جمہوری حکومتوں کی کرپشن اور دوسری متعدد قسم کی ناکامیاں جو سابق سوویت یونین کی کئی ریاستوں کو پرانے اور روایتی آمرانہ نظام کی طرف لے جائیں گی یا پھر وہ مسلم جنون پرستی کا شکار ہو جائیں گی۔

مگر مذہبی جذبات خواہ وہ صحیح قسم کے ہوں یا دوسری نوع کے جذبات پر نقاب کی شکل میں ڈالے گئے ہوں، سیاسی بدمعاشوں کے تصرف میں آسانی سے آجاتے ہیں اور یوں انہیں بڑی آسانی سے متشددانہ کاروائیوں میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

بلقان میں دیکھے جانے والے خوفناک نسلی اور مذہبی خواب سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے مقامات پر کیا کچھ اور ایسا ہی ہوسکتا ہے۔

انقلاب جو سنبھالا نہ جا سکے

روز بروز بڑھتے اور وسیع ہوتے ہوئے یہ شگاف، آئندہ آنے والے عشروں میں امن کے لئے عظیم خطرات کی نمائندگی کرتے ہیں اور یہ ہمارے عہد کے بڑے بڑے اختلافات سے برآمد ہوتے ہیں......اور اس چنگاری کی نئی انقلابی تہذیب جسے دنیا کی طاقت کے ڈھانچے کو صنعتی عہد کے بعد دوحصوں میں تقسیم کر کے قابو میں رکھنا ممکن نہیں رہا، ہوا دے کر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شعلہ بنا رہی ہے۔

آنے والے عشروں میں ہم جو دیکھنے جا رہے ہیں وہ عالمی نظام کی تین حصوں یعنی پہلی لہر دوسری لہر میں اور تیسری لہر میں تقسیم شدہ حکومتیں ہیں جن میں سے ہر ایک کے اپنے اپنے انتہائی اہم مفادات ہیں۔ ان کی اپنی اپنی باہمی طور پر دست و گریبان اشرافیہ ہیں۔ اپنے اپنے بحران اور اپنا اپنا ایجنڈا ہے۔ یہ ایک عظیم تاریخی متن ہے جس میں ہم جنگ کی تہذیب، ایٹمی، کیمیائی اور جراثیمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ، میزائلوں کی تیاری اور جنگ کی ایک مکمل، نئی اور تیسری لہر کے زمانے سے تعلق رکھنے والی ایک ایسی قسم کو دیکھ رہے ہیں جس کی پہلے سے کوئی مثال موجود نہیں ہے۔

ہم مستقبل کی تاریخ کے ایک عجیب اور منفرد قسم کے دور کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔ جو لوگ جنگوں کے خطرات کا خاتمہ یا ان میں کمی چاہتے ہیں انہیں یہ نئے عوامل اور ان کے درمیان مخفی تعلق کا ادراک کرنا ہوگا اور تبدیلی کی اس لہر کو محسوس کرنا ہوگا جو ہماری اس دنیا کو نئی شکل دے رہی ہے۔

بے چینی اور گڑ بڑ کے زمانے میں اور آنے والے خطروں کے پیش نظر، ہماری بقا کا انحصار وہ کچھ کرنے پر ہے جو کم از کم گزشتہ دو صدیوں میں کسی نے بھی نہیں کیا، جس طرح ہم نے جنگ کی ایک نئی قسم ایجاد کی ہے، بالکل اسی طرح اب ہمیں ''امن کی ایک نئی قسم'' بھی ایجاد کرنا ہوگی۔

اس کتاب کے آئندہ صفحات اسی بارے میں ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چھٹا حصہ

امن

امن کی شکلیں

مغربی کلچر میں تصادم کی جو کہانیاں مشہور ہیں ان میں سے معروف کہانی داؤد اور جالوت کی لڑائی کی ہے۔ بائبل کے مطابق حضرت داؤدؑ یہودیوں کی اور جالوت فلسطینیوں کی طرف سے برسر پیکار ہوئے' جالوت کا ایک قوی ہیکل جنگجو کی حیثیت سے بہت شہرہ تھا' مگر حضرت داؤد نے اسے غلیل کے ذریعے نشانہ بنایا اور مار ڈالا۔

اس زمانے کے لحاظ سے یہ نئی تکنیک تھی' ان کی یہ لڑائی اس زمانے کے ایک زندگی بخش طریقے کے بارے میں بتاتی ہے جو قدیم انسان نے تشدد کے نتیجے میں ہونے والے جانی نقصان کو کم سے کم حد تک رکھنے کے لئے اختیار کر رکھا تھا۔ وہ یہ تھا کہ بجائے پورے کے پورے قبیلے یا گھرانے کے ایک دوسرے کی تکہ بوٹی کرنے کے بہت سے قدیم اضافی گروہ اپنے جھگڑے انفرادی مبارزت سے نمٹا لیتے تھے۔ دونوں فریق اپنے ایک ایک جنگجو کو میدان میں اتارتے اور جس کا پہلوان چت ہو جاتا اسے ہار ماننا پڑتی۔

ہومر کے عہد میں یونانیوں اور ٹرائے والوں کی جنگ میں یونانیوں کی طرف سے اپنی لاس اور اہل ٹرائے کی جانب سے ہیرس دونوں اس طرح کے فیصلہ کن ڈوئل لڑتے رہے۔ علم الانسان کے ماہرین کو جنوبی الاسکا کے ٹیلمنٹ نیوزی لینڈ کے موری اور برازیل سے لے کر آسٹریلیا تک کے قدیم قبائل میں اسی طرح کی دو بدو انفرادی لڑائیوں کی شہادتیں ملی ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ابتدائی دور کے قبائل میں دوسری مروجہ زندگی بخش اختراع استثناء تھی......مثال کے طور پر عورتوں اور بچوں کو جنگ سے باہر رکھنا یا غیر جانبداروں یا دشمن کی طرف سے بھیجے جانے والے پیغام رسانوں کو مستثنیات میں شمار کرنا جنگ سے استثنا کی ایک صورت انسان نہیں بلکہ خاص مقامات کو اس سے باہر رکھنے کا اصول تھا؛ (نئی ہیبرائڈز میں بتایا گیا ہے کہ باہمی جنگ میں معروف قبائل ایک قابل تنسیخ راہ امن مقرر کر کے اسے جنگ کی سرگرمیوں سے دور رکھتے)؛ جنگ سے الگ رکھنے کے چوتھے طریقے کا ایسے وقت کے تعین سے تعلق تھا جب جنگ بندی لازم ہوتی......مثال کے طور پر یہ جنگ بندی مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لئے کی جاتی۔

پہلی لہر کی تہذیب کے عروج کے ساتھ ہی یہ مروجہ جنگ کی قسم کے ساتھ مطابقت رکھتی ہوئی امن کی ایک نئی قسم بھی وجود میں آ گئی......یہ آلات ا ایک نیا سیٹ تھا یعنی ایسے آلات کا جو جنگ کو روک سکیں اور تشدد سے ہونے والی تکالیف کا ازالہ کر سکیں۔

مثال کے طور پر پہلی لہر کے انقلاب، جس کے نتیجے میں جنگ کا عمل چھوٹے چھوٹے قبائلی تنازعات کی سطح سے بلند ہوا، اس نے جنگی قیدیوں کی تقدیر بھی بدل دی۔ اس وقت تک فاتح قبائل کے نزدیک، زندہ جنگی قیدیوں کی کوئی افادیت نہ تھی، سوائے کبھی کبھار جنگجوؤں کی کمی سے پیدا ہونے والے خلا کو پر کرنے یا نسل کشی کے لئے درکار عورتوں کے، لیکن جب زراعت کے بل پر فالتو زرعی پیداوار حاصل کرنا ممکن ہوا اور پتہ چلا کہ قیدی اپنی بھوک مٹانے کے لئے ضروری خوراک سے کہیں زیادہ جنس پیدا کر سکتے ہیں تو فاتحین کو انہیں کھا جانے یا مار دینے سے زیادہ فائدہ ان کو غلام بنانے میں نظر آیا۔ یہ غلامی کتنی بھی خوفناک تھی۔ بہرحال اس کا شمار پہلی لہر کی ان فائدہ مند باتوں میں کیا جا سکتا ہے جن کے نتیجے میں میدان جنگ میں ہلاکتوں کی تعداد میں کمی ہوئی۔ یہ پہلی لہر کی تہذیب میں امن کی قسم کی ایک جزوی دریافت کی کوشش تھی۔

صنعتی انقلاب برپا ہوا تو اس وقت بھی یہی عمل دہرایا گیا یعنی اس دور نے بھی جنگ کی اپنی قسم دریافت کی اور اس کی مطابقت سے امن کی قسم بھی۔

مثال کے طور پر یورپ میں جب صنعتی عہد کو عروج حاصل ہوا تو اس نے قول و قرار کے رشتوں پر زیادہ زور دیا۔ ہر قسم کے کنٹریکٹ کو تجارتی زندگی کا جزو قرار دیا گیا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سماجی کنٹریکٹ کے نام سے سیاسی نظاموں کو بھی عوام اور ان کے رہنماؤں نے درمیان تعلق کا جواز بنا کر پیش کیا گیا۔ دوسری لہر کے زمانے کی قوموں کیلئے ایک دوسری کے ساتھ معاہدے کرنا قدرتی امر تھا۔ اس طرح دوسری لہر کے زمانے کی ان کی قسم میں سمجھوتے اور معاہدے' کلیدی اجزاء کی حیثیت اختیار کر گئے اور ان میں سے بعض میں فوجی سپاہیوں کے اخلاقی رویوں کا تعین بھی کیا گیا۔

سویڈن کی اپلا یونیورسٹی کے امن اور جنگ کے تحقیقاتی ڈیپارٹمنٹ کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ''اگرچہ انسانی اقدار کا خیال ہزاروں برسوں سے اس دنیا کے رہنے والوں میں موجود چلا آ رہا ہے' مگر یورپی حکومتوں نے سترہویں اور اٹھارویں صدی میں پہلی بار ''جنگ کی مشقیں'' کے نام سے اس سلسلے میں ایسی دستاویز ترتیب دی جس کے ذریعے متحارب جنگجوؤں کے درمیان باہمی سلوک کے معیار مقرر ہوئے۔

قوانین کے اس مجموعے نے معاہدوں' طور طریقوں اور عدالتی فیصلوں کے ایک ''پیچ ورک'' کی بنیاد فراہم کی1964ء مس قوموں کے درمیان اس امر پر اتفاق رائے پایا گیا کہ میدان جنگ میں خدمات انجام دینے والے ڈاکٹروں اور نرسوں کو غیر جانبدار تصور کیا جائے گا اور وہ بیماروں اور زخمیوں کو ان کی قومیتوں کی تمیز کئے بغیر ضروری طبی امداد فراہم کریں گے۔1968ء میں قوموں میں بعض دھماکہ خیز گولیوں کے مسترد قرار دینے پر سمجھوتہ ہوا۔

1889ء میں ہیگ کی پہلی امن کانفرنس میں ہتھیاروں پر پابندی لگانے کے مسئلہ پر بحث مباحثہ ہوا (مگر اس پر اتفاق نہ ہوسکا)؛ بہرحال اس کانفرنس نے جنگ کے طور طریقوں اور ہتھیاروں کے استعمال کی بعض حدود مقرر کرنے پر اتفاق کیا اور غباروں کے ذریعے گولے پھینکنے پر پابندی عائد کرنے کا اصول منظور کیا۔ اس کانفرنس نے قوموں کے درمیان تنازعات طے کرنے کے لئے مصالحتی عدالتوں کے قیام کی منظوری بھی دی۔

اس وقت سے اب تک دنیا معاہدوں' سمجھوتوں کے ذریعے کیمیائی اور جراثیمی ہتھیاروں کا استعمال محدود رکھنے کی متعدد کوششیں کر چکی ہے۔ جنگی قیدیوں سے بہتر سلوک ان کی نسل کشی روکنے اور ایٹمی ہتھیارں پر کنٹرول کرنے کے سمجھوتے بھی برابر ہو رہے ہیں' لیکن امن کے اس کام کا صنعتی نقش ٹھیکیداری کے ان انتظامات کے مقابلے میں کہیں گہرا ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان جدت پسندوں نے جو دوسری لہر کے معاشروں کی تعمیر کے ذمہ دار ہیں' قومی منڈیاں تشکیل دیں اور قومی ریاستوں کی بنیاد بھی رکھی۔ اس زمانے میں جنگ شہری ریاستوں اور شاہی خاندانوں کے درمیان مبارزت تک محدود نہ رہی بلکہ اس سے بڑھ کر اس نے پوری اور مکمل قوموں کے درمیان تشدد کا لبادہ اوڑھ لیا......جن میں قومی معیشتوں پر کنٹرول رکھنے والی حکومتوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ان جدت پسندوں نے ٹیکس جمع کرنے کے حقیقت پسندانہ طریقے بھی وضع کیے (اور یوں قومی حکومتوں کو بڑی جنگیں لڑنے کے مواقع فراہم کرنے کے لئے سرمائے کی فراہمی کا بندوبست کیا)؛ آبادیوں کو قومی ذرائع نقل وحمل اور مواصلات کے ذریعے باہم مربوط کیا اور اپنے دانشوروں اور میڈیا کے ذریعے لوگوں کے دماغوں میں پروپیگنڈے کے زور پر قوم پرستی کے خیالات بھرنے پر بھرپور توجہ دی۔ امن برقرار رکھنے کے لئے انہوں نے بالکل نئے ادارے قائم کئے اور اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ ایسا کرتے وقت ان کی کوششیں قوم کیلئے مخصوص رہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد قائم ہونے والی لیگ آف نیشنز اور دوسری جنگ عظیم کے بعد وجود میں آنے والی اقوام متحدہ کئی معاملات میں ایک دوسری سے مختلف ضرور ہیں مگر دونوں کا قیام قوموں کے حقوق (صرف قوموں کیلئے) کی بھرپور نمائندگی پر زور دیتے رہے۔

''قومی تحفظ'' کے تصور کا جس کے نام پر گذشتہ نصف صدی میں فوجوں کی صفیں کی صفیں کھڑی کی جاتی رہی ہیں' قومی سطح پر امن اور تحفظ پر زور' قوموں کے درمیان امن سے اتنا ہی دور ہے جتنا کہ امن' مذہبی' نسلی گروہوں اور تہذیبوں سے فاصلے پر ہے۔

لیگ اف نیشن جسے اپنے وقت میں انسانی امیدوں کا منبع قرار دیا جاتا رہا ہے' 1930ء تک بے معنی ہونے کی حد تک سکڑ کر رہ گئی اور دوسری جنگ عظیم روکنے کے سلسلے میں کچھ نہ کر سکی۔ اقوام متحدہ اپنے وجود کا زیادہ عرصہ سرد جنگ کی وجہ سے مفلوج رہی۔ اب ایسے وقت میں جب اس کے بنیادی یونٹ ......قومی ریاستیں......گلوبل سطح پر زیادہ نہیں بلکہ پہلے سے کم اہم ہوگئی ہیں۔ یہ سکتے سے باہر آئی ہے۔ بہرحال یہ ادارے جس قسم کی جنگوں کو روکنے کیلئے وجود میں لائے گئے تھے' وہ دوسری لہر کے زمانے کی وسیع ہلاکتوں والی لڑائیاں تھیں۔

یوں دوسری لہر کی تہذیب نے اپنے سے پہلے کی لہر کی تہذیب کی طرح جنگ کی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اپنی قسم کی مطابقت میں امن کی اپنی قسم بھی ایجاد کرلی۔ بالکل اسی طرح جس طرح جنگ کی قسم متعین کرنے کا معاملہ ہے' امن کی نئی قسم کی وجود میں آنیکا یہ مطلب پرانی قسم سے مکمل نجات ہرگز نہیں ہے' لیکن جنگ کی نئی قسم امن کو نئے خطرات کی زد میں ضرور لے آتی ہے اور اس طرح وہ کافی وقت گزرنے کے بعد امن کی ایسی نئی قسم کی ضرورت پر زور دیتی ہے جو نئے حالات سے مطابقت رکھتی ہو اور نئی تہذیب کے تقاضوں کو پورا کرتی ہو۔

آج دنیا کو جس بحران کا سامنا ہے' وہ تیسری لہر کی ضرورت کے مطابق امن کی نئی قسم کے وجود کا فقدان ہے جو آج کے عالمی نظام سے مطابقت رکھتا ہو اور تیسری لہر کے زمانے کی جنگی حقیقتوں سے بھی آشنا ہو۔

آئندہ کے زمانے کے لئے امن کی قسم

قیام امن کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کے لئے پہلے دنیا بھر کی اخلاقی' سماجی اور اقتصادی برائیوں کے خاتمے کا انتظار کیا جائے' جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جنگ غربت' ناانصافی' کرپشن' آبادی میں اضافے اور محرومیوں کا نتیجہ ہے وہ درست ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ فارمولا ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سادہ نظر آتا ہے' لیکن امن کے قیام سے قبل اگر ان برائیوں کا خاتمہ واقعی ضروری ہے تو پھر جنگوں کو روکنا یا محدود رکھنا خیال و خواب کی بات ہوگی۔

مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ایک مکمل اور اچھی سی دنیا میں امن کیسے بحال کیا جائے بلکہ اصل مسئلہ اس حقیقی دنیا کا ہے جو ہمارا مقدر ہے یا اس نئی دنیا کا جسے تخلیق کرنے کی ہم کوشش کر رہے ہیں۔ آج کی حقیقی دنیا میں جب ہم ایک نئے عالمی نظام کی تعمیر کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور جنگ کی ایک بالکل ہی نئی قسم کی تیاری کر رہے ہیں' اس سے مطابقت رکھتے امن کے راستے اب تک تلاش نہیں کر سکے۔

ایک برطانوی ادیب اے سی ایف بیلز نے 1931ء میں اپنی کتاب ''امن کی تاریخ'' کا آغاز ان الفاظ کے ساتھ کیا تھا: ''جنگ اور امن کے بارے میں پردہ واحد خیال جسے آج سامنے لایا جا رہا ہے۔ ایک صدی قبل بھی منظم جماعتوں کے تحت اس کی تلقین کی جا رہی تھی۔'' وہ غالباً 1815ء میں برطانیہ میں پہلی بار قائم ہونے والی ''امن سوسائٹیوں'' کا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حوالہ دے رہا تھا۔ یہ سوسائٹیاں عین اس وقت ظہور میں آئیں جب دوسری لہر کے زمانے کی جنگ کی قسم کی ترقی اور توسیع کا کام نپولین کے ذریعے تیزی سے انجام پا رہا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے دوسری لہر کے زمانے کی امن کی قسم کو بھی ترقی سے ہمکنار کر دیا تھا' لیکن امن کی اس قسم کے جن بنیادی مفروضوں پر اس وقت تکیہ کیا گیا' وہ اب ہرگز قابل برداشت نہیں رہے یا غیرضروری ہو چکے ہیں۔

مثال کے طور پر دوسری لہر کے زمانے کا یہ نظریہ کہ قومی حکومتوں کا وجود ہی فوج کو قابو میں رکھ سکتا ہے' اب فرسودہ ہو چکا ہے۔ اب ہم اکثر ایسے فوجی یونٹ دیکھ رہے ہیں جنہوں نے مرکزی حکومتوں کی اتھارٹی قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔ بعض فوجی دستے جیسا کہ روس میں ہوا تجارتی مفادات کے تابع ہیں' دوسرے جیسا کہ منشیات کی پیداوار اور تجارت کے علاقوں میں دیکھا گیا' ملزموں کی سنڈیکیٹوں کے کام کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو نسلی اور مذہبی تحریکوں کے لئے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو کسی خارجی اتھارٹی کے بغیر ازخود من مانیاں کر رہے ہیں۔ کچھ بوسنیا کے عربوں کی طرح درمیان میں لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تیسری لہر جوں جوں زور پکڑ رہی ہے' ہمیں ایسے ہی کئی دوسرے اور متنوع نظارے دیکھنے کو ملتے رہیں گے لیکن اگر قومی ریاست تشدد پر اپنی اجارہ داری سے محروم ہو رہی ہے تو پھر امن کے لئے نئے خطرات کا اندیشہ کدھر سے ہے؟ غیر اجارہ دار تشدد کو کس قسم کا عالمی نظام ہضم کر سکے گا؟

دوسری لہر کے زمانے کے عملی جنگ مخالفین' فوجی صنعتی کمپلیکس کے خلاف نسلوں سے محاذ آرا ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں جب صورت حال شہری فوجی کمپلیکس میں تبدیل ہو جائے گی اس وقت کیا ہوگا؟ کیا اب اس معمولی سی معصومانہ شہری مصنوعات کے خلاف بھی مہمیں چلانا ہوں گی جن کو فوجی مقاصد کے لئے استعمال کرنا ممکن ہوگیا ہے۔

دوسری لہر کے زمانے میں امن کی تحریکوں کے دوران ہتھیارں کی برآمد ممنوع قرار دینے کی مہمیں چلتی رہی ہیں لیکن اب یہ حقیقت سامنے آ رہی ہے کہ دوسری اور تیسری لہر کے ہتھیار ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔ تو کیا اب وسیع پیمانے پر بے دریغ ہلاکتوں کے لئے تیار کئے جانے والے ہتھیاروں کے ساتھ ان ہتھیاروں کو بھی ضائع کر دیا جائے جو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہلاکتوں کی شرح کم کرنے کے لئے ڈیزائن کئے گئے ہیں' اگر اس فرق پر توجہ نہ دی گئی تو کیا ہم آنے والے زمانوں میں خونریزی میں کمی کی کوششوں کو نقصان پہنچانے کے ذمہ دار نہ ہوں گے؟

جنگ کی مخالفت' اخلاقی طور پر بجائے خودخوش آئند بات ہے لیکن اس دنیا کو جو جنگ آزمائی کی پہلی' دوسری اور تیسری تہذیبوں میں بٹی ہوئی ہے جنگ سے بچنے کے لئے ان تہذیبوں کے درمیان مختلف قسم کے جوڑ توڑ کی ضرورت ہوگی۔ ان میں سے ہر ایک کو امن قائم رکھنے یا امن قائم کرنے والوں سے مختلف قسم کے طور طریقے اختیار کرنے کی توقع رکھنی ہوگی۔

پھر اقوام متحدہ کا ذکر آتا ہے جس پر قیام امن کے سلسلے میں دنیا بھر کے لاکھوں کروڑوں افراد کی نظریں جمی ہوئی ہیں۔ یہ فرض کرنا جیسا کہ بہت سے لوگ کرتے ہیں کہ اگر اقوام متحدہ کے پاس ایڈہاک قسم کی ہر مشق کے لئے آرڈر پر تیار کی جانے والی فوج کی بجائے اپنی مستقل اور ہر مقصد کے لئے کارآمد فوج موجود ہو تو دنیامیں قیام امن کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ دوسری لہر کی سوچ کو نافذ کرنے کی تاریخی غلطی دہرانے کے مترادف ہوگا۔ جنگوں کا تنوع' جنگ مخالف قوتوں میں بھی تنوع کا متقضی ہے نہ کہ ایک واحد اور کارآمد یونٹ کا۔

بدقسمتی ہے یہ فرض کر لینا بھی اتنا ہی غیر مناسب ہوگا کہ اقوام متحدہ اپنے موجودہ ڈھانچے کے ساتھ جنگ کے شعلوں سے دنیا کو محفوظ رکھ سکتی ہے بشرطیکہ اس کے پاس اپنا کافی سرمایہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے ایسے معاملات جو اقوام متحدہ کے بس میں نہیں ہیں وہ انہیں حل نہیں کر سکتی خواہ وہ جتنا بھی سرمایہ اکٹھا کر لے۔

محض یہ حقیقت کہ اقوام متحدہ استثنائی طور سے قومی ریاستوں پر مشتمل ہے آج کی دنیا میں اسے جکڑ جیکٹ پہنانے کے مترادف ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تباہی کے علاقوں میں اقوام متحدہ کو نجی اور غیر منافع بخش ایجنسیوں کی مدد سے کام کرنے کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہے۔ یا مثال کے طور پر اس کی غیر حکومتی تنظیموں تک اپنی مشاورتی حیثیت کی توسیع دینے کی کوشش کو حقیقت کی پردہ پوشی قرار دینا غلط نہ ہوگا۔ ان این جی اوز یا غیر ریاستی اداکاروں کو اقوام متحدہ اب تک زیادہ سے زیادہ شرپسند یا طاقت کا متبادل قرار دیتی رہی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔نیشنل پبلک ریڈیو کے مطابق بوسنیا میں انسانی ہمدردی کی بناء پر ایک امدادی کانوائے کو جو کیتھولک عیسائیوں اور مسلمانوں کے ادارہ کے کارکنوں نے مشترکہ طور پر منظم کیا تھا' اقوام متحدہ کی فوجوں نے تحفظ فراہم کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ عالمی ادارے کے بلیو ہیلمٹ دستوں کا کہنا تھا کہ پرائیویٹ ایجنسیوں کی کوششوں کو تحفظ دینے کا مینڈیٹ ان کے پاس نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ایک ایسی دنیا میں جس کی فوجی قوتیں بڑھتی ہوئی قوت استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں' ان کے بغیر امن قائم کرنا یا برقرار رکھنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اقوام متحدہ کو اگر کل کے آنے والے بوسنیاؤں یا کمبوڈیاؤں میں موثر طور سے کام کرنا ہے تو اسے ان غیر سرکاری اداروں کو اعلیٰ ترین سطح پر طاقت میں حصہ دار بنانا ہوگا۔ عالمی کارپوریشنوں اور ایسے دوسرے اداروں کا ذکر فی الحال جانے دیجئے' مگر بہرحال ان سب کو اقوام متحدہ کی امن کی حکمت عملی کی تیاری میں حصہ تو لینا ہی ہوگا۔

اقوام متحدہ کا ڈائنا سور اگر اپنے آپ کو دوسری لہر کی نوکر شاہی کی تنظیم سے زیادہ لچکدار اور تیسری لہر کی تنظیم میں جو قوموں کے ساتھ غیر ریاستی اداکاروں کی نمائندگی بھی کرتی ہے اپنے آپ کا منقلب بھی نہیں کر سکتا تو پھر عالمی طاقت کے یہ متحارب مراکز' یقیناً اقوام متحدہ نما اداروں کی شکل میں سامنے آ جائیں گے جو ان مختلف گروپوں سے تشکیل دیئے جائیں گے جنہیں اب تک اس سے باہر رکھا جا رہا ہے۔

سفارتی گھبراہٹ

دوسری لہر کے زمانے کے مفروضوں اور اداروں نے دنیا کو تعطل کا شکار بنانے میں اس وقت معاونت کی جب اسے حال ہی میں' بلقان میں ایسے تشدد کا سامنا کرنا پڑا جس میں مظالم' وسیع پیمانے پر زنا بالجبر کی وارداتیں اور نازیوں کی قسم کی نسلی صفائی کی کوششیں منظر عام پر آئیں۔ اس لڑائی کا یہاں مختصراً جائزہ لینا اس لئے ضروری ہے کہ یہ آنے والے ایسے تصادموں کا امکانی نمونہ ہے۔

بلقان میں دنیا نے جو کچھ دیکھا اس کے ایک حصے کا تعلق پہلی لہر کے زمانے کی جنگ سے تھا جس میں حصہ لینے والے نیم مسلح' نیم تربیت یافتہ' رواروی میں منظم ہونے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

والے اور غیر منظّم' ملازمت کی پابندیوں سے آزاد بے قاعدہ فوجی تھے۔ ان میں سے کچھ کو دوسری لہر کے زمانے کی یوگوسلاویہ کی فوج کی مدد حاصل تھی۔ اقوام متحدہ کو یہاں لڑنا نہیں تھا' یورپی اقوام یا امریکی یہاں پہلی یا دوسری لہر کے زمانے کی کوئی جنگ شروع کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ بلقان سیدھی سادھی دلدل ہے' جس میں پھنسنا انہیں منظور نہیں۔

لیکن تیسری لہر کے زمانے کی جنگ آزمانے کی یہاں کوئی کوشش ہی نہیں کی گئی جس سے جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے۔ خونریزی میں کمی آسکتی تھی۔ اس کی بجائے ہم نے جو کچھ دیکھا وہ کوتاہ نظری پر مبنی حکمت عملی' اخلاقی دیوالیہ پن' فضائی قوت کے بے معنی استعمال کی مثالیں اور بے انتہا سفارتی گھبراہٹ تھی۔

یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ بیرونی دنیا جنگ کی ہولناکیوں کو واقعی روکنا چاہتی تھی (جو شبے سے بالاتر ہے) تو یہ تو کبھی کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا کہ فضائی قوت سے جنگ کو ختم کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اصل مسئلہ فضائی' زمینی اور بحری فوج کا نہیں تھا بلکہ پہلی' دوسری اور تیسری لہر کے زمانے کا تھا۔ جیسا کہ ہم ابھی دیکھ سکیں گے۔ حقیقتاً وہاں کچھ ایسے کوائف موجود تھے' جن کی مدد سے زمینی فوجی دستوں یا فضا میں لڑنے والے پائلٹوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے بغیر اس المیے کی شدت میں کمی کرنا ممکن تھا۔

وہاں ہمیں کسی قسم کی فکری گہرائی نظر نہیں آتی......دوسری لہر کے زمانے کے روایتی حوالوں سے ہٹ کر کوئی سوچ سامنے نہیں آتی۔ یہ فرض کرتے ہوئے بھی کہ وہاں زمینی فوجوں کی ضرورت ہے' بہت سے امکانات پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ مثال کے طور پر یہ غور ہی نہیں کیا گیا کہ اگر سیاسی وجوہ کی بنا پر امریکہ' یورپ یا اقوام متحدہ سے وہاں فوج نہیں لائی جاسکتی تو کیا کوئی اور متبادل سرے سے موجود ہی نہیں ہے؟

امن

تشدد پر قوموں کی اجارہ داری جب پہلے ہی ختم ہو چکی ہے تو پھر نجی کارپوریشنوں کی طرف سے منظّم کی جانے والی رضا کاروں اور کرائے کے سپاہیوں پر مشتمل فوجوں کی تشکیل پر جو اقوام متحدہ کی طرف سے فیس لے کر یا ٹھیکے پر لڑ سکتی ہوں' غور کرنے میں کیا مضائقہ ہے؟ ...... ایسی فوج جس میں گزرے ہوئے کل کے کرائے کے کپتان اور فوجی جو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آنے والے کل کے غیر مہلک ہتھیاروں سے لیس ہوں حصہ لیں؟

ایسی حکومتیں جو اپنے جوانوں اور خواتین کو سربیا کے کروٹوں اور بوسینا کے غیر منظم فوجیوں کے جن میں عورتوں سے زیادتی اور بے دریغ قتل کرنے والے بدمعاش شامل تھے ہاتھوں مروانے کے حق میں نہیں تھیں۔ ان کے خدشات میں اس طرح یقیناً کمی ہوسکتی تھی جب اقوام متحدہ کا ادارہ غیر سیاسی پیشہ ور اور کئی قوموں کے رضا کاروں پر مشتمل لڑاکا فوج تیار کرنے کے لئے کنٹریکٹ کرنے کا پروگرام بناتا۔ اس صورت میں اجازت دینے میں ان حکومتوں کو تامل نہ ہوتا۔ فوجی صف بندی کے لئے ایک تیز رفتار یونٹ کا کرائے پر حصول ممکن ہوتا یا اسے اقوام متحدہ کی تحویل ہی میں ٹھیکے پر کام کرنے کے لئے مخصوص کر دیا جاتا۔

ایسی کمپنیوں کو اپنی حدوں میں رکھنے کے لئے بین الاقوامی قواعد وضوابط کی تشکیل اور ان کا نفاذ بھی لازم ہے۔ اس کے لئے عارضی بورڈ آف ڈائریکٹر' ان کے سرمائے کی عوامی دیکھ بھال' خصوصی مقاصد کے لئے سازوسامان لیز پر مہیا کرنے کے خاص انتظامات زیادہ بہتر ہوسکتے ہیں۔ بہ نسبت اس کے کہ انہیں جنگی سازوسامان کے اپنے ذخیرے بنانے کی اجازت دی جائے' لیکن اگر حکومتیں یہ ذمہ داری براہ راست نہیں نبھا سکتیں تو ان کارپوریشنوں کی مدد لی جاسکتی ہے جو یہ کام کرنے کی اہل ہیں۔

اس کے مقابلے میں کوئی شخص آنے والے اس وقت کا تصور بھی کرسکتا ہے جب بین الاقوامی سطح پر کسی دن چارٹرڈ ''امن کارپوریشنوں'' کے قیام کی خبر آ جائے' جن میں سے ہر ایک کو کرہ ارض کے ایک مقررہ حصے پر متعین کیا جارہا ہو۔ انہیں جنگ میں حصہ لینے پر ادائیگی کرنے کی بجائے جنگ کے علاقوں کو محدود کرنے پر ادائیگی کرنے کا پابند رکھا گیا ہو۔ ہلاکتوں کی تعداد میں کمی کو ان کی ''پیداواری صلاحیت'' قرار دیا جائے۔

ان کمپنیوں کو بین الاقوامی طور پر منظورشدہ قواعد اور اختیارات کے ذریعے قیام امن کے غیر رسمی طریقے بروئے کار لانے کا حق دیا گیا ہو......اور یہ قانونی رشوت کے ذریعے پروپیگنڈہ اور محدود فوجی مداخلت کرنے اور اپنے مقررہ خطے میں امن فوج کی تعیناتی کے اختیارات سے لیس بھی ہوں۔ نجی سرمایہ کار ایسی کمپنیوں سے کام لینے پر آمادہ ہوسکتے ہیں۔ مثلاً بین الاقوامی برادری یا علاقائی گروپ کی ان خدمات کے عوض انہیں ایک مقررہ فیس ادا کرنے اور جنگی سرگرمیوں میں ہلاکتیں کم ہونے کی بناء پر سالانہ منافع کا ایک حصہ ادا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرنے پر بھی تیار ہو سکتے ہیں اور اگر کام یوں نہیں بنتا تو پھر شاید دنیا میں ایسے بہت سے اداروں کے بیج بو کر جو قیام امن میں یقین رکھتے ہوں' امن کی منزل قریب لائی جا سکتی ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ اس سے استفادہ کیوں نہ کیا جائے؟

ایسے خیالات اور تصورات بظاہر بڑے احمقانہ لگتے ہیں اور ہوسکتا ہے یہ ایسے ہوں بھی' لیکن اچھے برے جو کچھ بھی ہوں' بہرحال یہ عام حوالے کے فریم کے باہر کے خیالات ہیں اور ان سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ ایک دفعہ جب دوسری لہر کے زمانے کے فریم ورک سے باہر آ جائیں تو تعطل کے نہایت خیال انگیز متبادل ہمارے سامنے آسکتے ہیں۔

کھلے آسمان اور کھلے ذہن

امن کے مقاصد کو کبھی اقتصادی ذرائع سے آگے بڑھایا جاتا ہے تو کبھی انہیں طاقت کے بل پر نافذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اس کے لئے صرف یہی طریقے مہیا نہیں ہیں۔ اکیسویں صدی کے طلوع کے ساتھ ہی قیام امن کے لئے بظاہر جسمانی طور پر کم محسوس ہونے' مگر زیادہ طاقتور ہتھیار یعنی علم سے جراحی کی شکل میں کام لینے کی ضرورت ہوگی۔

امن کے بارے میں سوچتے وقت تیسری لہر کی تہذیب کے مرکزی اقتصادی پہلو کو نظرانداز کرنا...... جو فوجی قوت کے لئے بھی کلید کا درجہ رکھتا ہے...... یقیناً درست نہیں ہے' کیونکہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اب اگر کچھ لڑائیاں علم کی برتری کی بنا پر جیتی جا سکتی ہیں تو کیا جنگ مخالفت کاروائیوں میں بھی اس ذریعے سے کامیابی کا حصول ممکن نہیں ہے؟

آج جبکہ فوجوں نے بھی علم کو حکمت عملی کے طور پر اختیار کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا ہے تو جو چیز نمایاں طور سے نظروں کے سامنے آئی ہے وہ امن کے لئے ایک مضبوط اور مقاصد سے ہم آہنگ حکمت عملی کا فقدان ہے۔

ایسی حکمت عملی کے بنیادی اجزاء مدت سے اپنی جگہ پر موجود ہیں اگرچہ ابھی تک ان کے باہمی رشتے واضح نہیں ہیں۔ یہ خیال کہ فوجی معلومات کے حصول کو آسان بنانے پر شبہات میں کمی ہوسکتی ہے اور ترقی کی بڑھتی ہوئی رفتار کی وارننگ کے لئے تمام متعلقہ فریقوں کو کافی وقت مل سکتا ہے۔ ''کھلے آسمانوں کی تجویز'' کا نتیجہ ہے۔ یہ تجویز امریکی صدر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آئزن ہاور نے سربراہی میٹنگ میں 21 جولائی1955ء کو سوویت وزیراعظم خروشیف کو پیش کی تھی۔

ایٹمی کشیدگی گھٹانے اور اچانک حملے کا خطرہ کم کرنے کے طریقوں پر بات کرتے ہوئے امریکی صدر نے سوویت روس اور امریکہ کو ایک دوسرے کو اپنے فوجی اثاثوں سے آگاہ کرنے اور ان کی مکمل فہرست پیش کرنے کی تجویز بھی سامنے رکھی اس کے ساتھ ہی دونوں ملکوں کو ایک دوسرے کے لئے فضائی نگرانی کی سہولتیں فراہم کرنے کی بات بھی کی جہاں سے تصویریں بنا کر وہ مطالعہ کے لئے اپنے اپنے ملک لیے جانے میں آزاد ہوں۔

سوویت روس نے اس خیال کو فوراً ہی مسترد کردیا' مگر بہرحال اس کے بعد......اس عشرے میں جس میں علم کی بنیاد پر ترقی پانے والی معیشتوں نے نہایت تیز رفتاری سے ترقی کی......ہم نے دیکھا کہ بہت سی قوموں نے' نگرانی کی ان تجاویز کو بڑی خوش دلی کے ساتھ قبول کرلیا اور باہمی مانیٹرنگ اور ڈیٹا جمع کرنے پر بھی اتفاق کیا۔ اس میں کسی ایک ملک کا دوسرے ملک کی حدود میں ''مداخلت'' کا حق بھی یوں تسلیم کیا گیا کہ اس کے انسپکٹر موقع پر جا کر ہتھیاروں پر کنٹرول کے معاہدوں کی پابندی یا خلاف ورزی کا جائزہ لینے کا حق رکھتے ہیں۔مثال کے طور پر1971ء کا سمندری تہہ سے متعلق معاہدہ' اقوام متحدہ یا اس پر دستخط کرنے والے کسی دوسرے ملک کو کسی رپورٹ کے بارے میں تصدیق کرنے کی مانگ کرنے کا پتہ دیتا ہے۔1986ء میں سٹاک ہام کی تخفیف اسلحہ کانفرنس میں35 اقوام نے اس پر اتفاق کیا کہ وہ کم مدت کے نوٹس پر انسپکٹروں کو اپنے اپنے ملک میں مقررہ موقعہ پر جانے کے لئے ضروری سہولتیں مہیا کریں گے اور یہ کہ وہ ایسے مطالبے سے انکار نہ کرنے کے پابند ہیں۔ بہرحال اس میں عراق کا معاملہ ذرا الگ ہے اور اس سے ابھی معاہدے کی کمزوری کا احساس بھی ہوتا ہے کیونکہ عراق اب تک بیرونی انسپکٹروں کی اپنے ملک میں مداخلت کی برابر مدافعت کر رہا ہے لیکن ''ڈیٹا'' انفرمیشن اور علم کو امن کے قیام کیلئے بروئے کار لانے کا اصول بہرحال تسلیم کرلیا گیا ہے......اور اس میں مقررہ جگہ تک رسائی کا حق بھی شامل ہے......جس کو اب بین الاقوامی سرگرمیوں میں پوری مضبوطی سے جما دیا گیا ہے۔

صدر بش نے1989ء میں آئزن ہاور کی متذکرہ تجویز میں از سر نو جان ڈالنے کی کوشش کی۔ اس وقت تک مصنوعی سیاروں اور آسمانوں میں نصب برقی آنکھوں کی وجہ سے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فضائی نگرانی کا کام بہت ترقی کر چکا تھا۔ اس لئے مغرب نے نہ صرف کھلے آسمانوں کی تجویز کو کھلے دل سے پیش کیا بکہ امریکہ ہی نہیں' کینیڈا اور یورپ کی فوجی تیاریوں کا جائزہ لینے کی سہولت بھی پیش کر دی۔ اس موقعہ پر روسیوں نے یہ عندیہ دیا کہ وہ اس پر بات چیت کرنے کو تیار ہیں اور انہوں نے مصنوعی طور پر مرکبات کے ذریعے سے تیارشدہ روزنوں کی مدد سے بنائے جانے والے ریڈاروں کے استعمال کی اجازت دینے پر رضامندی کا اظہار بھی کر دیا۔ واضح رہے کہ اس ریڈار کے ذریعے کسی بھی قسم کے موسم میں اور رات میں بھی چیزیں صاف صاف دیکھی جا سکتی ہیں لیکن سوویت روس کا فضا میں موجود برقی آنکھوں کی کارکردگی محدود رکھنے پر اصرار تھا۔ مغرب جہاں اس آنکھ کو دس فٹ یا اس سے بڑی جسامت کی چیز دیکھنے کے قابل رکھنا چاہتا تھا وہاں روسی اسی حد کو چالیس فٹ تک مقرر کرانے پر مصر رہے۔

لیکن اس قسم کی ساری بات محض فریب نظر کا درجہ رکھتی ہے۔ آسمان میں جیسا کہ ہمارے سامنے ہے' بہت سے دوسرے مصنوعی سیاروں کی مدد سے نگرانی کا کام بڑھ گیا ہے۔ ان میں تجارتی سیارے بھی شامل ہیں اور یہ اب چھوٹی سی چھوٹی شئے کو جس میں نجی دستی ہتھیار تک شامل ہیں آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ سربیاً کروشیا اور بوسنیا کے ہر توپچی کو مستقبل میں شناخت کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ برا موسم یا خراب علاقہ بھی آئندہ اس کام میں رکاوٹ نہ بن سکے گا۔ آسمان تو اب کھلے رہیں گے' حکومتیں خواہ چاہیں نہ چاہیں اور صرف آسمان ہی نہیں سمندر اور خود کرہ ارض بھی اب زیادہ شفاف صورت میں ہمارے سامنے ہوگا۔

فضا کی بنیاد پر نگرانی ٹیکنالوجیز اور زمینی برقی آنکھ پر اٹھنے والے اخراجات پر آہ و بکا کرنے کی بجائے ہمیں ان اخراجات کو سماجی ضرورت سمجھنا چاہیے جو قیام امن کے لئے اہم ترین ضرورت کا درجہ رکھتی ہے۔ اب جس امر کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اس طرح ہم جو انفرمیشن حاصل کرتے ہیں اور اس پر اٹھنے والے اخراجات کو باہمی طور پر تقسیم کر لیں اور جہاں موزوں تجارتی منڈیاں ان کوششوں کو ایڑ لگا کر تیز کرنے کے لئے ناکافی نظر آتیں وہاں کچھ خیال انگیز عبوری طریقے جو شاید ملک اور پرائیویٹ سیکٹر کی باہمی کوششوں سے وجود میں لائے جا سکتے ہیں۔ ترقی کے کام میں تیز رفتاری کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک ایسی دنیا میں جو علاقائی طور پر اسلحے کی دوڑ میں لگی ہوئی ہے ڈیٹا' انفرمیشن اورعلم کا باہمی تبادلہ امن کے لئے تیسری لہر کے زمانے کا واضح ہتھیار ہے۔

ٹیکنالوجی کی تلاش میں

اسلحے کی دوڑ ہمیشہ جنگ پر منتج نہیں ہوتی ......کیونکہ تاریخ کی ایک ایسی ہی اور سب سے بڑی دوڑ سے جو امریکہ اور سوویت روس کے درمیان جاری رہ چکی ہے۔ یہی ثابت ہوتا ہے۔ اس میں صلاحیت کے زیادہ عزم وارادے کا دخل ہوتا ہے لیکن ہتھیارں کی اندھا دھند خریدوفروخت ' اسلحے کے ذخائر جمع کرنے کی کوششیں' کشیدگی کے علاقوں میں ہتھیاروں کے یکا یک عام پھیلاؤ اور فوجی توازن میں اچانک تبدیلیوں سے جو بالعموم خلاف توقع نمودار ہو جاتی ہیں' متشددانہ کارروائیوں کے خطرات یقیناً بڑھ جاتے ہیں' اس لئے اقوام متحدہ نے ہتھیاروں کا ایک رجسٹر تیار کرنے کی تجویز پیش کی ہے جس میں رکن ممالک کی طرف سے ہتھیاروں کی درآمد اور برآمد کے بارے میں سرکاری طور پر اعداد وشمار کا ریکارڈ رکھا جائے۔ امریکہ میں تخفیف اسلحہ کے بعض دعویداروں نے تو یہ بھی تجویز کر دیا ہے کہ جو ممالک ہتھیاروں کی ترسیل کے بار میں اقوام متحدہ کو آگاہ نہ کریں' ان کی امداد بند کر دی جائے۔

رجسٹر کے اس تصور میں بہت سی خامیاں ہیں کیونکہ ہتھیاروں کے انتہائی خطرناک سودے تو ایسے ہوں گے جن کے متعلق کسی کو بتایا ہی نہیں جائے گا اور اس سے اس خیال کو بھی تقویت ملتی ہے کہ اس کھیل کے اصل کھلاڑی تو حکومتیں ہیں۔ اس لئے اس بارے میں انہیں سے معاملہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال اس سب کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ رجسٹر کی تجویز سے قیام امن کے لئے معلومات کی منظم طریقے کے فراہمی کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

اس سے بھی زیادہ ضرورت' وسیع پیمانے پر ہلاکتوں والے ہتھیاروں کے پھیلاؤ میں سست روی کے اہتمام کے لئے انفرمیشن فراہم کرنے پر توجہ دینے کی ہے۔ خاص طور پر ٹیکنالوجی کے استعمال کے سلسلے میں واحد مقصد کی بجائے دوہرے بلکہ کثیرالجہات مقاصد کے بروئے کار آنے کے پیش نظر تو یہ اور بھی ضروری ہوگیا ہے اور یہ محض ہتھیار ہی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں جن کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا ضروری ہے بلکہ ٹیکنالوجی بشمول پرانی ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ پر نظر رکھنا بھی لازم ہے۔

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کیا عراق ایٹمی ہتھیار تو نہیں بنا رہا' آئی اے ای اے اور نگرانی کے دوسرے جاسوسی اداروں کے ساتھ صدام حسین نے نہ صرف دھوکہ دہی سے کام لیا (اعداد و شمار کی عدم موجودگی بھی آڑے ائی) بلکہ نگران ٹیموں کے' دھوکہ کھانے میں ایک احمقانہ مفروضے پر یقین کرنے کا دخل بھی تھا۔عراق جانے والی نگران ٹیموں نے اس خیال ہی کو مسترد کر دیا کہ عراق یورینیم 235 کو یورینیم 238 سے علیحدہ کرنے کے لئے ''کیلوٹران'' ٹیکنالوجی سے کام لے سکتا ہے اور وہ اس لئے کہ اس مقصد کا حصول زیادہ موثر ذرائع اور زیادہ اسانی سے ممکن ہے لیکن صدام کسی ایک طریقے سے کام نہیں لے رہا تھا بلکہ مختلف طریقوں پر عمل پیرا تھا اور ان میں ایک وہ طریقہ بھی تھا جسے ترقی یافتہ دنیا فنی لحاظ سے فرسودہ قرار دے چکی ہے۔

امریکہ کی اٹا مک انرجی ایجنسی کے ایک سابق سربراہ گلین ٹی سیبورگ نے اس واقعہ کو انتہائی حیرت انگیز قرار دیا ہے- بین الاقوامی امن کے کارنیگی این ڈاؤمنٹ کے ماہر لیونارڈ ایس سیسپکٹر کے الفاظ میں اس واقعہ کو انتہائی خوفناک غلطی کا نام دیا جا سکتا ہے۔اس پر سب سے تلخ اور زہریلا تبصرہ لاس اماس کی لیبارٹی کے ایک سابق افسر' جے کامن مارک کا ہے۔ واضح رہے یہ وہی لیبارٹری ہے جہاں دنیا کے پہلے ایٹم بم تیار ہوئے تھے۔ مارک کا کہنا ہے' ''جاسوسی پر آخر اتنا خرچ کرنے کی کیا تک ہے جب کہ اس سے حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔''

اگر کچھ اور نہیں تو عراقی تجربے سے یہ ضرور ثابت ہو جانا چاہے کہ ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے بارے میں بہترین انفرمیشن اکثر داخلی ذرائع ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ نافرمان عراق ہی تھا جس نے صدام کے کیلاٹران استعمال کرنے کے متعلق مغرب کو گمراہ کیا۔

انفرمیشن کا معاملہ اگر جنگ مخالفوں کے اقدمات میں مضمر ہے تو اس کی زبردست اہمیت قبول کرنے میں آخر کیا قباحت ہے؟ اس صورت میں بین لاقوامی امن کے لئے کام کرنیوالا ادارہ کارینج این ڈاؤمنٹ یا کوئی دوسرا فاؤنڈیشن یا اقوام متحدہ یا پھر خود آئی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اے ای اے' دنیا بھر کے لئے ایسا اعلان کرنے میں کیوں دیر کر رہا ہے کہ ایٹمی سمگلنگ یا ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے سلسلے میں جو کوئی بھی اسے معتبر اطلاع فراہم کرے گا اسے دس لاکھ ڈالر انعام دیا جائے گا۔ کروڑ پتی بنانے کی یہ پیش کش بہت سے سیٹی بجانے والوں کو میدان میں لاسکتی ہے۔ اس قسم کا انعام یقیناً اس انتظام سے کہیں زیادہ موثر ثابت ہوسکتا ہے جس پر اب تک عمل کیا جا رہا ہے اور جس کی رو سے دنیا کو ایٹمی جنگ کے خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے مانیٹرنگ کا اہتمام وسیع پیانے پر کیا جاتا ہے۔ اگر آئی اے ای اے' ابھی تک چند ایسی معلومات کی خریداری پر متوجہ نہیں ہوئی تو اس کی وجہ کیا ہے؟

مصنوعی ہتھیاروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بارے میں بہرحال اب یہ بھی ضروری ہوگا کہ اس جال کو بہت زیادہ وسعت دے کر اس قسم کے جنگی مواد اور مشینوں کی نقل وحرکت کی نگرانی کا اہتمام کیا جائے' اس راہ میں اگر ناقابل حل نہیں تو مشکل مسائل یقیناً حائل ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ جاننا شاید زیادہ ضروری ہوگا کہ کسی جارح کے قبضے میں کون سے ہارڈویر کے مقابلے میں سافٹ ویئر کتنے اور کیسے ہیں' پھر اس کے بعد یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اب کیسی کاروائی ضروری ہے' جنگ کے تقاضوں کیلئے اب منطق' زبان' مصنوعی جاسوسی حتیٰ کہ متبادل نظریہ علم کے بارے میں بھی اسی طرح سوچنا ہوگا جس طرح وہ ان سب چیزوں کو نفاذ امن کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

مستقل میں نئے ہتھیارں کی نقل وحرکت کے بارے میں بھی نئے نئے اندیشوں کا سامنا ہوگا...... جو ہمیں اپنے دوسرے روایتی رویوں پر از سرنو غور کرنے کیلئے مجبور کریں گے......مثال کے طور پر یہ غور طلب بات ہے کہ مستقبل میں سمارٹ ہتھیار حاصل کرنے والا خریدار ان پر کسی حد تک اعتماد کر سکے گا؟

ایسا دن بھی آ سکتا ہے (اگر ابھی تک نہیں آیا) جب ہتھیار ان میں نصب شدہ ایسے اجزاء کے ساتھ فروخت کئے جائیں جو اس حد تک سمارٹ ہوں گے کہ وہ ان کی کارکردگی کو محدود رکھنے یا غیر موثر بنانے پر قادر ہوں گے اور اس کے لئے پہلے ہی سے ان میں یہ گنجائش رکھ لی جائے گی کہ وہ مخصوص حالات میں خصوصی اور مقررہ رویہ ہی اختیار کریں گے۔

امریکی' فرانسیسی یا روسی یا دوسری ترقی یافتہ معیشتیں جو ہتھیار سازی کرتی ہیں'

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مثال کے طور پر ہتھیاروں کی تیاری کے وقت ہی ایک مخفی اور ازخود تباہ ہونیکی صلاحیت رکھنے والا ''چپ'' (کھچی یا تاش) برآمدی ہوائی جہازوں' راکٹ لانچروں؛ ٹینکوں اور میزائلوں کے اندر فٹ کر دیں گے...... ایسی صورت حال سے بچنے کے لئے کہ یہ خریدار کبھی دشمن بھی بن سکتا ہے یا یہ مال کسی دشمن کو فروخت کر سکتا ہے...... مخفی ہدایات کے مطابق وقت مقررہ یا مخصوص علامات ظاہر ہونے پر انہی ہتھیاروں کے اندر سے ایک پائلٹ برآمد ہوکر اس بمبار طیارے کو بٹن دبا کر تباہ کر دے گا۔ مستقبل کی ٹیکنالوجیز جن کی بنیاد عالمی پوزیشن کے مطابق خلا میں رواں مصنوعی سیاروں کے ذریعے فراہم ہونے والے اعداد و شمار ہیں ہتھیاروں کے ایک ایسے سسٹم کی پروگرامنگ یقیناً کر سکتی ہیں جو اسے ہتھیاروں کو جن کے تیار کرنے والوں نے ان کی سرگرمیاں چند مخصوص جغرافیائی علاقوں کے لئے محدود کر دی ہوں' عین ممکن ہے کہ اس کے ادھر ادھر ہونیکی صورت میں وہ اہداف پر نشانہ لگانیکے قابل ہی نہ رہیں یا پھر ان کا نیوی گیشنل سسٹم ہی ناکارہ ہو جائے۔

سوال یہ ہے کہ اس قسم کے اندازے کیا خالص سائنسی ہیں یا انہیں خام خیالی قرار دیا جائے؟ دفاعی صنعت سے متعلق ایک باخبر اعلیٰ سرکاری افسر کے بیان کے مطابق یہ خام خیالی ہرگز نہیں ہے۔ اس نے ہمیں بتایا' مشرق وسطےٰ کے ممالک کو ہم جو جہاز فروخت کرتے ہیں' ان میں سے ہر ایک پر ایک ''ٹیک'' یا ''چپ'' فٹ کرکے ان کی شناخت کا اہتمام کر سکتے ہیں۔ کسی مخاصمانہ کاروائی کی صورت میں ہم اس ''چپ'' سے رابطہ کر سکیں گے اور اس جہاز کی کارکردگی کو بشرط ضرورت بری طرح تہس نہس بھی کر سکیں گے۔ کسی نہ کسی شکل میں آئندہ ایسا ہوکر رہے گا۔ یہ بات بتانے والا یہ افسر ہی واحد شخص نہیں تھا۔

کیا خریدار اس مخفی نصب شدہ جزو کا پتہ لگا سکتا ہے؟ ''ایسا بہت مشکل' انتہائی مشکل بلکہ قریب قریب ناممکن ہے۔'' ایک متعلقہ اعلیٰ افسر کا جواب تھا۔

اگر یہ بات درست ہے تو اسے علم پر مبنی بڑی کایاں جنگی مثال قرار دیا جا سکتا ہے' لیکن اگر ہتھیار ساز ادارے برآمدات کے دوران جراحی کے عمل پر جزوی طور سے بھی آمادہ ہو جائیں تو پھر ایسا بھی ممکن ہے کہ چند کمپیوٹر ہیکرز یا کریکرز چلئے امن کے مقاصد کی خاطر ہی سہی...... ہتھیار سازی کے وقت وہاں تک رسائی حاصل کر کے ایسی ''ری پروگرامنگ'' ہی کر ڈالیں کہ ہر جنگ کے لئے یہ ہتھیار سرے سے موثر ہی نہ رہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قتل، جن کا سراغ نہ مل سکا

علم اور دماغ کے انخلا کا مسئلہ بھی غور طلب ہے جو جاری ہے اور جس میں مزید اضافے کی توقع ہے۔ نجی شعبے میں قوانین کا ایک نیا مجموعہ تیار ہو رہا ہے جس کا تعلق دانشورانہ املاک سے ہے۔ حال ہی میں جنرل موٹرز نے اپنے ایک سابق ایگزیکٹو کے خلاف اس الزام میں مقدمہ دائر کر دیا ہے کہ وہ اپنے سات کمپیوٹر ڈسکوں اور دستاویزات کے چودہ صندوقچے بھی واکس ویگن کمپنی کے پاس لے گیا ہے۔ آئی بی ایم نے بھی اپنے ایک سابق ملازم کو عدالتی احکامات کے ذریعے کمپیوٹر ڈسک تیار کرنے والی ایک دوسری کمپنی کسی گیٹ کے لئے کام کرنے کی ممانعت کی ہدایت حاصل کر لی ہے۔ دماغی قوت کے انخلاء کو روکنے یا باقاعدہ شکل دینے کی یہ کوششیں کچھ کمپنیوں کی طرف سے خالصتاً تجارتی وجوہ کی بناء پر کی گئی ہیں۔

اس مقابلے کی وجہ محض پیسہ ہے۔ زیادہ سنجیدہ سطح پر ہم پہلے ہی یہ دیکھ چکے ہیں کہ مغربی حکومتیں چندے کی شکل میں فنڈ جمع کر کے روس میں کام کرنے والے بعض ماہرین کو ادائیگی کر رہی ہیں تاکہ وہ وہاں سے نقل مکانی کر کے دوسرے ملکوں میں جانے اور اپنے ساتھ وہ کچھ لے جانے سے باز رہیں جو ان کی کھوپڑیوں میں جمع ہے......مثلاً ایٹمی ہتھیاروں سے متعلق معلومات ہوسکتی ہیں۔

علم کنٹرول کرنے کی ایک تند و تیز شکل اور بھی ہے۔1980ء میں یہوا المیشاد نامی شخص پیرس کے ہوٹل میری ڈین میں مردہ پایا گیا۔ مارچ1990ء میں جیرانڈ بل نام کا ایک دوسرا آدمی برسلز میں گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔قتل کی ان دونوں وارداتوں کا آج تک کوئی سراغ نہیں ملا۔

پتہ بہرحال یہ چلا کہ مصری النسل المیشاد صدام حسین کے ایٹم بم بنانے کے منصوبے کا ایک کلیدی فرد تھا اور کینیڈا کا شہری بل، صدام حسین کے لئے ''سپر گن'' بنانے کا کام کر رہا تھا۔ یہ امر یقینی ہے کہ اقتصادی اور فوجی لحاظ سے علم کی قدر و قیمت جیسے جیسے بڑھتی جائے گی، دنیا بھر میں قتل کی ایسی وارداتوں میں اضافہ ہوتا جائے گا جن کا سراغ نہیں مل سکے گا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک انتشار زدہ دنیا میں یہ سوچنا غلط نہ ہوگا کہ ممالک یا نجی ادارے بھی ایسے فنی ماہروں کے سروں کی قیمت لگا سکتے ہیں جو ممنوعہ ہتھیاروں کی تیاری میں اپنی مہارت کسی کو دے سکتے ہیں۔ کسی روز اس نوع کی غارت گری کی اجازت علاقائی یا عالمی اتھارٹی کی طرف سے بھی دی جا سکتی ہے اور اسے امن کی ضرورت قرار دیا جا سکتا ہے۔ زیادہ قرین قیاس اگرچہ یہی ہے کہ ایسی وارداتیں غیر سرکاری طور پر ہی ہوں گی۔ انتشار زدہ جھگڑوں میں علم کی ترسیل کا انتظام کسی نہ کسی طرح امن اور امن برقرار کے لئے کام کرنے والوں کے نزدیک انتہائی اہمیت اختیار کر لے گا۔

ہتھیاروں کی تجارت

کل کی جنگ اور امن کی اقسام کچھ نازک اور دل آزار قسم کے اخلاقی سوالات اٹھاتی ہیں اور سخت فیصلوں کا تقاضا بھی کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر......متوقع شر پسندوں سے ٹیکنیکل قسم کی بعض معلومات مخفی رکھنے کے علاوہ ترقی یافتہ قوموں کی اکثریت کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ وہ دوستی کی حدوں سے ماورا دوسری قوموں کو بھی فنی معلومات مہیا کرتی رہیں۔

اگر کچھ ''کنگال'' ریاستیں وسیع پیمانے پر ہلاکت پھیلانے والے ہتھیار بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں تو پھر باقی ماندہ دنیا کو بڑے نازک فیصلوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ یعنی اب جبکہ ایسی ریاستوں میں سے کسی کے پاس اپنے ہتھیار ہیں تو کیا ہم اس کے پھیلاؤ کی ذمہ دار حکومت سے خواہ وہ کتنی ہی ظالم کیوں نہ ہو یہ توقع رکھیں کہ وہ اسے محتاط کنٹرول میں رکھے گی تا کہ یہ غیر ذمہ دار ہاتھوں میں نہ چلے جائیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر کیا ہمیں موثر کنٹرول ٹیکنالوجی جیسے کہ ''پرمسوایکشن لنک'' سے' اس ملک تک پہنچانے اور اس کی تحویل میں دینے کے لئے تگ و دو کرنی چاہیے۔ یا پھر کسی بری حکومت کو فنی لحاظ سے بے خبر رکھنا ہی بہتر ہوگا خواہ اس کی وجہ سے وسیع ہلاکتوں والے ہتھیاروں پر کنٹرول ختم ہونے کا خطرہ ہی کیوں نہ ہو؟ یہاں بھی ہمیں قیام امن کی کوششوں میں مرکزی نکتہ علم کا کنٹرول ہی نظر آتا ہے۔

اس سے بھی آگے سوچنے کی بات یہ ہے کہ تیسری لہر کے زمانے کے علم کی بنیاد پر تیار ہونے والے ہتھیار قطعیت کے ساتھ زیادہ موثر اور اصولاً دوسری لہر کے زمانے کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وسیع پیمانے پر ہلاکتیں پھیلانے والے ہتھیاروں کے مقابلے میں سپاہیوں اور شہریوں کی نسبتاً بہت کم تعداد کو ہلاک یا زخمی کرتے ہیں۔ تو اگر فنی طور پر اعلیٰ ترقی یافتہ قومیں' فوجی لحاظ سے کم ترقی یافتہ قوموں کو تیسری لہر کے زمانے کے ہتھیار فروخت کرنے لگیں تو کیا یہ دنیا کچھ بہتر شکل اختیار نہیں کر لے گی۔ بشرطیکہ اس کے ساتھ ہی وہ دوسری لہر کے زمانے کے وسیع طور پر ہلاکتیں اور تباہی پھیلانے والے ہتھیاران سے واپس لینے کی شرط عائد کر دیں اور انہیں بین الاقوامی نگرانی میں تباہ کر دیں۔ بہرحال غیر مہلک ہتھیاروں کی تجارت کے بارے میں غور وفکر کرنا ضروری ہے۔اس قسم کے خیالات صرف ان بازاری مسائل کی طرف ہی اشارہ کرتے ہیں جن کا سامنا کل کی افواج اور امن کے لئے کام کرنے والوں کو یکساں طور سے کرنا ہوگا۔

جب ہم امن کے لئے حکمت عملی کی بات کرتے ہیں تو یہ سوچنا ضروری ہو جاتا ہے کہ اس میں تربیت کا کیا کردار ہوگا؟ کیا اقوام متحدہ میں متعین سپاہیوں یا قیام امن کیلئے کوشاں دوسرے افراد یا آفت زدہ علاقوں میں ریلیف کا کام کرنے والوں کے لئے بین الاقوامی تربیتی مراکز کا قیام ضروری ہے؟ اس سلسلے میں کمپیوٹر سے کام لینے کے بارے میں سوچنا کیسا رہے گا؟ ابلاغ' آفت زدہ علاقوں میں ریلیف کا کام اور قحط زدہ علاقوں میں ہنگامی حالات کی صورت میں نیز مختلف تہذیبی مناقشات میں کیا یہ مراکز مفید ہو سکتے ہیں؟ سب سے بڑھ کر یہ امر غور طلب ہے کہ نمونے کے تجزیے اور اعداد وشمار کی فراہمی کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے جنگ مخالف اقدامات کو حال سے مستقبل کی طرف لے جانے میں مدد مل سکتی ہو......خون کا پہلا قطرہ حاصل کرنے کے بعد اندھا دھند کوششیں کرنے کی بجائے پیشگی سوچ بچار کے طریقے آزمانے زیادہ ضروری ہیں۔ یہ ضرورت دروں بینی کا تقاضا کرتی ہے اور یہ محض فوجی توازن' فوجوں کی نقل وحرکت اور اس نوع کی کاروائیوں تک محدود نہیں رہنی چاہیئے بلکہ سیاسی دھڑوں اور ان کے سٹرکچرکل دباؤ اور ان مجبوریوں پر بھی توجہ ضروری ہے جو انہیں فیصلے کرنے پر مائل کرتی ہیں۔

بالآخر یہ حقیقت ہمیں پھر بلقان کی طرف لے جاتی ہے۔ امن کے لئے کوئی حکمت عملی' انفرمیشن' مس انفرمیشن اور ڈس انفرمیشن کے اہم ترین ذریعے یعنی......میڈیا کو نظرانداز نہیں کرسکتی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جنگ کا آغاز کیسے؟

امریکی اور یورپی حکومتوں نے مصیبتوں میں گھرے ہوئے بوسینا' کروشیا اور سربیا کے عوام کے دفاع کیلئے اپنی زمینی افواج یا پائلٹوں کو میدان میں لانے کے خطرے سے گریز کیا۔ ان میں سے کوئی بھی حکومت کسی حد تک یہ وضاحت بھی نہیں کر سکی کہ اس نے اب تک کلیتاً محفوظ اور سستے اقدامات یعنی جنگ ختم کرنے یا کم از کم اس کی تباہ کاریوں کو محدود رکھنے پر کیوں توجہ نہیں دی۔ یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ ایسے لوگوں کے درمیان جو صدیوں سے اکٹھے رہ رہے ہیں اور باہمی رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں' ہزاروں برس کی پرانی اور دبی ہوئی نفرتوں کے احیاء کے نتیجے میں ہونے والی اس جنگ کو جان بوجھ کر ہوا دی گئی۔

چونکہ سرد جنگ کے بعد کے زمانے میں یوگوسلاویہ کے کمیونسٹ حاکم عوام کی نظروں سے گر گئے تھے......اس لئے اب انہوں نے مارکسٹ نظریات کی بجائے مذہبی اور قبائلی نظریات میں پناہ لینا شروع کر دی۔ غیر ذمہ دار دانشوروں نے اقتدار سے چمٹے رہنے کی کوشش میں ان حاکموں کو نسلی اور مذہبی برتری کی مثالوں کی فراہمی کے ساتھ ساتھ بہت سے نازک جذباتی نعروں سے بھی لیس کر دیا اور میڈیا نے توپ خانے کا کام سنبھال لیا۔

بلغراد کے واحد آزاد اخبار ''ویمے'' کے ایڈیٹر مائیلوس واسک کے الفاظ میں ''تشدد کے یکدم پھوٹ پڑنے کو مصنوعی جنگ قرار دینا غلط نہ ہوگا جو حقیقتاً ٹیلی ویژن پر شروع ہوئی۔ چند برس تک اس کیلئے تند و تیز قسم کے خطرناک' عدم برداشت پر مبنی توسیع پسندوں کے نعرے اور جنگی پروپیگنڈے کے ذریعے لڑائی شروع کرانے کی خاطر نفرت اور حقارت کی فضا کافی حد تک شعوری طور سے فراہم کی گئی۔''

یہ سمجھنے کے لئے کہ وہاں کیا کچھ ہوا' اس نے جنگ کے دوران وہاں جانے والے امریکیوں کو بتایا' ''ایسے امریکہ کا تصور کر لیجئے جس کے پاس بہت کم ٹی وی سٹیشن ہوں اور وہ ہر جگہ ایک ہی اداریہ دہرا رہا ہو' ایسا اداریہ جسے ڈیوڈ ڈیوک نے ڈکٹیٹ کرایا ہو۔ آپ کو بھی آئندہ پانچ برس میں ایسی ہی جنگ سے واسطہ پڑ سکتا ہے......'' البانیہ کا صحافی وائیو لٹینا اروس کہتا ہے' ''یوگوسلاویہ کی توڑ پھوڑ کا عمل میڈیا کی جنگ کے طور پر شروع ہوا۔''

مرکزی میڈیا پر تمام علاقوں میں جن فوجیوں کا قبضہ تھا جو معتدل خیالات کو سنسر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرنے، ضائع کرنے یا جان بوجھ کر ان خیالات کے حامل لوگوں کو دور رکھنے پر قادر تھے۔ اس کے باوجود امن کے حامی گروپ، چھوٹے چھوٹے اخبارات اور رسالے، نفرت کی آگ کے شعلوں کو بجھانے کی پوری تندہی سے جدوجہد کرتے رہے۔ بلغراد کے جنگ مخالفت ایکشن مرکز کے ڈائریکٹر ویسناپسک دنیا بھر میں دہائی دیتے رہے کہ دنیا وہاں پر ایسے لوگوں کی موجودگی بھی تسلیم کرے جو قومی نفرت اور جنگ کی پالیسیوں سے اتفاق نہیں کرتے، ''بلغراد میں امن مارچ بھی ہوئے، حتیٰ کہ بوسنین سرب کے ایک مضبوط گڑھ بینیالوکا میں، عین دوران جنگ میں بوسنیوں، سربوں اور کروٹوں کے ایک گروپ نے مل کر ایک ایسی تنظیم قائم کی جس کا نام تھا، ''نسلی اور مذہبی نفرتوں کا مقابلہ کرنے کا فورم۔''

اس کے باوجود مغربی ممالک میں سے کسی ایک نے بھی......امریکہ، فرانس، جرمنی اور انگلستان سمیت......باقی دنیا کا ذکر تو جانے دیجئے......جنگ کے مقامی مخالفوں کا جن کا خون بہنے پر یہی حکومتیں روزانہ واویلا بھی کرتی رہی ہیں انہیں کسی بھی قسم کی سیاسی یا مالی امداد نہیں دی۔ نہ ہی اقوام متحدہ نے میڈیا کی کوئی ایسی حکمت عملی وضع کرنے کی ضرورت محسوس کی جس سے نفرت کے پروپیگنڈے کا زہر کم کر کے تشدد کی کاروائیوں کو اعتدال کے راستے پر ڈالنے کی کوشش کی جاسکتی۔

ہتھیاروں کی نقل وحرکت پر پابندی کے فیصلے پر عمل کرانے کے لئے بحری جہاز ساحل پر کھڑے تھے، لیکن ان پر جو نشری سہولتیں موجود تھیں یا نزدیکی ممالک جیسے اٹلی یا یونان وہاں سے خود اقوام متحدہ، بڑی آسانی کے ساتھ معقول مزاجوں کی دبی اور گھٹی ہوئی آوازوں میں جو زور پیدا کرسکتی تھی اور یوں سابق یوگوسلاویہ کے مختلف حصوں کے درمیان توزان کا سامان پیدا کرسکتی تھی، اس کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ ہتھیاروں پر پابندی کے ساتھ ساتھ نفرت کے پروپیگنڈے پر پابندی عائد کرنے کا کسی کو کیوں خیال نہیں آیا؟ اقوام متحدہ اور بڑی طاقتیں اگر چاہتیں تو نفرت کے ان پروگراموں کو ''جام'' کیا جاسکتا تھا۔ وہ ان تمام مواصلاتی اور پوسٹل رابطوں کو بھی کنٹرول کرسکتی تھی جو متحارب ریاستوں کے اندر سے باہر اور باہر سے اندر پیغام رسانی میں مصروف تھے، لیکن ان میں سے کچھ بھی نہ ہوا۔

امریکی جنگی نفسیات کے ماہر اگر خلیج کی جنگ میں عراق میں تین کروڑ کے قریب دستی اشتہار فضا سے گرا سکتے تھے تو کیا ان کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ چند ہزار قسم کے سستے ریڈیو ''امن کی فریکوئنسی'' پر ٹیون کر کے سابق یوگوسلاویہ کے ان علاقوں پر گرانے کا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بندوبست بھی کرتے جہاں نفرتوں کی یہ جنگ جاری تھی تاکہ محاذ آرائی میں مصروف لوگ اپنی اپنی طرف کے جھوٹ کے سوا کچھ اور بھی سننے کے قابل ہو سکتے؟

امریکہ میں جنوبی کیلے فورنیا کے امن ایکشن بورڈ کی چیئر پرسن گریس آرون' امریکی اطلاعاتی ایجنسیوں سے برابر التجائیں کرتی رہی کہ وہ میدان جنگ کے ساحلی علاقوں میں خبریں نشر کرنے کا اہتمام کریں تاکہ سابق یوگوسلاویہ کو تمام ریاستوں کے شہری، جنگ کے بارے میں صحیح اور متوازن خبروں سے آگاہ ہوسکیں اور اس کے خیال میں یہ انتظام محض جنگ کے علاقوں ہی کے لئے نہیں بلکہ بلغراد اور زغرب کے لئے بھی ضروری ہے۔

کچھ دوسرے حلقوں کی طرف سے ریڈیو فری یورپ اور ریڈیو لبرٹی سے یہ خطرہ مول لینے کی استدعا کی گئی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ لوگ سوچتے رہے بی بی سی کہاں تھا؟ یا سی این این؟ یا امن کے پجاری' جاپان کا رویہ کیا تھا۔ این ایچ کے کہاں تھا؟ ان کی نشریات کے سیدھے سادھے ترجمے ان لوگوں کے ہاتھ مضبوط کر سکتے تھے جو جنگ کے خاتمے کے خواہاں تھے۔

جنگ کے آغاز کے دو برس بعد امریکہ کو یہ اعلان کرنے کی توفیق ہوئی کہ وہ ریڈیو فری سربیا شروع کرنے والا ہے......مگر صرف شارٹ ویو پر اور اس کے لئے یہ عذر لنگ پیش کیا گیا کہ میڈیم ویو کی نشریات کے لئے ٹارگٹ کے علاقے میں بڑا ٹرانسمیٹر درکار ہوگا۔ انگلستان میں مارکونی کمپنی نے ڈیم نیلی ملبا کا ایک کنسرٹ1920ء میں ریڈیو پر نشر کرنے کا انتظام کیا تھا جو یونان تک سنا گیا' مگر مثال کے طور پر1993ء میں اٹلی یا نزدیکی سمندروں سے زغرب اور بلغراد تک نشریات پہنچانے میں مشکلات کا عذر پیش کیا گیا۔ اس وقت سربیا اور مونٹیسگو میں 5لاکھ سٹلائٹ ڈشیں موجود تھیں۔ کروشیا میں چالیس ہزار ڈشین ان کے علاوہ تھیں مگر کسی بھی بین الاقوامی ایجنسی نے ان سے مدد لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اس ڈیجیٹل دور میں جہاں ہم مستقبل کی مواصلاتی ٹیکنالوجی کے حصول کے لئے عالمی سطح پر موثر ملٹی میڈیا اور جناتی میڈیا کے پہاڑ کی طرف تیز رفتاری سے بھاگے جا رہے ہیں' وہاں امن کے پروپیگنڈہ کا مرحلہ ابھی تک شارٹ ویو ریڈیو تک ہی محدود ہے۔

جس چیز کی واضح طور سے ضرورت ہے اور محض امریکہ ہی کو نہیں بلکہ خود اقوام

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

متحدہ کو بھی' بشرطیکہ یہ ادارہ قیام امن کی کوششوں کو جاری رکھنے کا واقعی خواہاں ہو' وہ ہے' ایسے نشریاتی اداروں کا فوری اہتمام جنہیں کہیں بھی پہنچایا جا سکتا ہو اور جو خبریں ان لوگوں تک پہنچانے کا اہل ہو جو ان سے کٹے ہوئے ہیں......اور یہ کام محض ریڈیو ہی کے ذریعے نہیں بلکہ ٹیلی ویژن کو بھی اس مصرف میں لانا ضروری ہے۔

آرون کے بیان کے مطابق جو اب تک جنگ اور امن کے موضوع پر پانچ کیبل پروگرام امریکہ میں نشر کرنے کے لئے پروڈیوس کر چکی ہے' بلقان گروپ پروپیگنڈے کی حد تک ناقابل یقین طور پر کائیاں اور منجھا ہوا ہے۔ جنگ میں حصہ لینے والے سبھی فریقوں کی طرف سے اس کو ویڈیو ٹیپ مہیا کئے گئے ہیں' ان میں سے کچھ تو یقیناً جعلسازی سے تیار کئے گئے ہیں اور کچھ سربیا کے ٹیلی ویژن پروگراموں پر مشتمل تھے جنہیں خصوصی مصنوعی سیاروں کی مدد سے امریکہ میں اس مقصد کی خاطر ٹیپ کیا گیا کہ یہ وہاں مقیم سربوں کے حمایتوں میں تقسیم کئے جائیں۔

جنونیوں اور ان کی حکومتوں کی طرف سے جنگ کے ہر علاقے میں سخت زیادتیوں کے باوجود صحافیوں' ٹی وی مبصرین' کیمرے کے عملے اور کچھ دوسرے لوگ وہاں حق کی آواز بلند کرنے کی کوشش برابر کرتے ہیں۔ آرون کہتی ہے' ''امن کے لئے کام کرنے والے گروپوں اور میڈیا کو کم سے کم کچھ ایسا ساز و سامان ہی دے دیا جاتا جو ان کے کام میں معاون ہوتا......مثلاً لیپ ٹاپ کمپیوٹر' سونی 8 کیمرے' ویڈیو ٹیپ ریکارڈز' لیزر پرنٹرز' موڈیم' سوفٹ ویئر اور بیرونی دنیا کی انفرمیشن سروسز کے لئے معاوضے پر ان کی خدمات کی فراہمی......''

اس نے یہاں جس نکتے پر زور دیا ہے' اس کی وسعت بلقان کی حدودں سے کہیں آگے ہے۔ ''ہم علاقائی فسادات کی وبا پھیلتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ اسے دبانے کے لئے ترقی یافتہ قوموں نے اگر صرف فوجی قوت کا سہارا لیا تو وہ یقیناً دیوالیہ ہو جائیں گی' اس لئے قیام امن کی خاطر سمارٹ ہتھیار کیوں نہ استعمال میں لائے جائیں۔''

مثال کے طور پر ٹیلی ویژن کی وزارتیں' منشیات کے کاروباریوں' دلالوں' فسادی گروہوں کے ارکان اور کرپٹ سپاہیوں کی بجائے اقوام متحدہ کے ''ییلو ہیلمٹ'' سپاہیوں کو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیرو بنا کر کیوں نہ پیش کیا جائے......یا ان کو دنیا کے سامنے نمایاں طور سے کیوں نہ لائیں جو ''نسلی صفائی'' کی کوششوں کے راستے میں اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر حائل ہو رہے ہیں؟

جنگ کو روکنے یا محدود رکھنے کے لئے خالی علم کے ہتھیار میڈیا کے استعمال سمیت کافی نہیں ہوں گے، لیکن ان کے استعمال کیلئے ایک منظم حکمت عملی وجود میں لانے اور اس کو ترقی دینے میں ناکامی ناقابل معافی گناہ ہوگا۔ شفافیت، نگرانی، ہتھیاروں کی نقل وحرکت کی مانیٹرنگ، انفرمیشن ٹیکنالوجی کا استعمال، جاسوسی، مواصلاتی خدمات کے سلسلے میں امتناعی کاروائیاں، پروپیگنڈہ، وسیع پیمانے پر ہلاکتوں کے طریقوں کی جگہ کم ہلاک کرنے والے یا غیر مہلک ہتھیاروں کی طرف رجوع، تربیت اور تعلیم وغیرہ یہ سب کے سب مستقبل کے امن کی قسم متعین کرنے کے ضروری اجزاء ہیں۔

فوج اور امن قائم کرنے کے داعی اگر چہ مختلف سمتوں میں کھڑے نظر آتے ہیں مگر ایسا وقت میں ہوتا ہے جب ان دونوں کے مفادات یکساں قسم کے نظر آتے ہیں۔ بلقان میں جنگ کے مقابلے میں استحکام کی خواہش کی خاطر اگر امریکہ کے نزدیک اخلاقی اور سٹریٹجک جواز موجود ہے تو پھر فوج، علمی حکمت عملی کے مقاصد کو آگے بڑھاتے ہوئے امریکہ میں قیام امن کے لئے کام کرنے والوں کے ساتھ مل کر جنگ کے علاقوں میں اپنے مقابلے کے محاصرے میں گھرے ہوئے لوگوں کے لئے بھی یقیناً کام کرسکتی ہے۔ قیام من کی کوششوں میں مصروف عمل لوگ بلقان کے معقول مزاج لوگوں کو مواصلاتی ساز وسامان کی فراہمی کے لئے فوج سے ایسے جہاز طلب کر سکتے ہیں جن پر نشریاتی ٹرانسمیٹر نصب کئے جا سکتے ہوں۔

امن اور اس کے قیام کی کوششوں کے علم پر انحصار کی سطح یقیناً زیادہ بلند ہے۔ ڈاکٹر ایلن وٹنی سمتھ نے ایک مقالے میں جو اس نے امریکہ کی فوجی خفیہ سروس کے ماہروں کی کانفرنس کے لئے لکھا تھا اور جیسا کہ ہم بھی اپنے برسوں کے کام میں اس کے موضوع پر صاد کر چکے ہیں، کہا ہے کہ ''انفرمیشن اور مواصلات تک وسیع رسائی اقتصادی ترقی کی لازمی شرط ہے، اس لئے کہ غربت امن کی دوست نہیں ہوتی۔'' ڈاکٹر ایلن نے جو مائیکرو انفرمیشن سسٹم نامی ادارے کی ڈائریکٹر ہے اپنی فوجی اور ڈیجٹل قوت کے انقلاب کو انفرمیشن یا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انفرمیشن ٹیکنالوجی کے حصول کے لئے دنیا سے کٹ کر استعمال کرنے کی (جہاں تک ممکن ہو سکے) سخت مخالفت کی ہے تا کہ غیر ترقی یافتہ ممالک کے لوگ بھی عالمی برادری کا حصہ بننے کا خواب پورا کر سکیں......

وہ کہتی ہے، ''ہمیں اپنا یہ علم قومی تحفظ کے مفاد میں باقی کی دنیا میں خوش حالی لانے کے لئے صرف کرنا چاہیے۔ پیشتر اس کے کہ اس دنیا کے تمام لوگ تارکین وطن، مہاجر یا مغرب کے پنشنر بن کر رہ جائیں۔''

بعض کانوں کو اس کے یہ الفاظ بلاشبہ خیالی محسوس ہوں گے لیکن یہ تیسری لہر کے زمانے سے ہم آہنگ ہیں اور قیام امن کے داعیوں اور سپاہیوں کے لئے یکساں طور پر اہم ہیں ہمارے لئے ان بغاوتوں کا مقابلہ کرنے کو جو کہ ارض کے مروجہ نظام کے تین حصوں میں بٹنے کے بعد سامنے نظر آ رہی ہیں، یہی طریقہ اہم ہے۔

دنیا کا پرانا نظام جو صنعتی صدیوں کے درمیان تعمیر ہوا، پہلے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے۔ ہم اس پر برابر بحث کرتے رہے ہیں کہ دولت آفرینی کے ایک سسٹم اور جنگ کی ایک نئی قسم کے وجود میں آنے کے بعد امن کی ایک نئی قسم کی دریافت ضروری ہے۔ لیکن امن کی یہ نئی قسم جب تک اکیسویں صدی کی حقیقتوں کا ادراک نہیں کرتی، یہ نہ صرف غیر متعلق ہوگی بلکہ خطرناک بھی۔

مستقبل کے لئے امن کی ایک نئی قسم ڈیزائن کرنے کی خاطر بہرحال ہمیں اکیسویں صدی کے عالمی نظام کا ایک ابتدائی نقشہ درکار ہے۔ اس کتاب کے بقیہ چند صفحات میں اس نقشے کو ڈھونڈنے کی کوشش کی جائے گی۔

اکیسوں صدی اور گلوبل سسٹم

موجودہ دور میں شاید ہی کسی دوسرے لفظ کے استعمال میں اتنی بے احتیاطی برتی گئی ہو جتنی کہ گلوبل کی اصطلاح کے استعمال میں۔ انسانی آبادیوں اور ماحولیات کو ''گلوبل مسئلہ'' قرار دیا جا رہا ہے۔ میڈیا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کو ایک گلوبل گاؤں کی شکل دینے کے عمل میں مصروف ہے۔ کمپنیاں بڑے فخرے سے اعلان کرتی ہیں کہ وہ گلوبل ہو رہی ہیں، اقتصادی ماہرین گلوبل بالیدگی اور گلوبل کساد بازاری کی اصطلاحوں میں گفتگو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرتے ہیں۔ سیاستدان، اقوام متحدہ کے ماہرین اور میڈیا کے پنڈتوں میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو 'گلوبل سسٹم' پر لیکچر جھاڑنے پر تیار نہ نظر آتا ہو۔

ایک عدد گلوبل سسٹم کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ وہ ہرگز نہیں ہے جو اکثر لوگوں کے ذہن میں جاگزیں نظر آتا ہے۔ جنگوں کو روکنے، محدود کرنے یا ان کا تصفیہ کرانے کی کوششیں، خواہ یہ فوجوں کی طرف سے کی جارہی ہوں یا امن کے لئے کام کرنے والے رضا کاروں یا کسی اور کی طرف سے، اس امر کی متقضی ہیں کہ اس سسٹم کے بارے میں بھی کچھ سمجھ بوجھ حاصل کر لی جائے جس کے دائرے میں یہ لڑی جا رہی ہیں۔ اگر اس سسٹم سے متعلق ہمارا نقشہ فرسودہ ہو چکا ہے تو بجائے اس کے کہ اس کی ایسی تصویر کشی کی جائے جیسی کہ وہ آنے والے دنوں میں شکل اختیار کر رہا ہے، گزرے ہوئے کل کی تصویر پیش کرنے کی صورت میں امن کی بہترین حکمت عملی اختیار کرنے کے باوجود الٹ نتائج ہی نکل سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اکیسویں صدی کی سٹریٹیجک سوچ کا آغاز کل کے گلوبل سسٹم کے نقشے سے کیا جائے۔

سرد جنگ کے خاتمے کا الزام

اس سسٹم کے نقشے کی تیاری کی بیشتر کوششیں سرد جنگ کے خاتمے سے شروع ہوتی ہیں، جیسے کہ اس تبدیلی میں اس قوت یعنی سرد جنگ کے خاتمے ہی کا سب سے زیادہ دخل ہو۔ سرد جنگ کے خاتمے کا گلوبل سسٹم پر اثر ضرور ہے لیکن اس کتاب کا دعویٰ یہ ہے کہ سوویت یونین کے انہدام سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کی حیثیت محض ثانوی ہے اور یہ کہ حقیقتاً اگر دیوار برلن نہ گری ہوتی اور سوویت یونین بھی موجود ہوتا، تب بھی آج گلوبل سسٹم کو موجودہ انقلابی کشمکش اور ابھار کا سامنا کرنا پڑتا۔ آج کی تمام تر تبدیلیوں، انقلابوں اور ہنگاموں کے لئے سرد جنگ کے خاتمے کو ذمہ دار قرار دینا خام خیالی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہم کرہ ارض پر اچانک ایک نئی تہذیب کو ابھرتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور یہ علم کے زور پر دولت آفرینی کا ایک ایسا ذریعہ اپنے ساتھ لا رہی ہے جو آج کے گلوبل سسٹم کو تین حصوں میں تقسیم کر کے، اس میں بنیادی تبدیلی لانے کا باعث بن رہی ہے۔ اس سسٹم کی ہر شئے اپنے ترکیبی اجزاء سے انقلابی طور پر الگ ہو رہی ہے...... اور ان

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے باہمی رشتے اور ان کے باہمی عمل کی رفتار ان ملکوں کے مفاد کے عین مطابق ہے جنہیں اس کی ضرورت ہے اور یہ ایسی جنگوں کو جنم دے رہی ہے جو اس کے نتیجے میں شروع ہو سکتی ہیں اور جنہیں روکنے کی ضرورت ہے۔

نرم سرحدوں والے ممالک کا عروج

بات چیت کا آغاز انہی عناصر سے کرتے ہیں۔ عالمی نظام کا بنیادی یونٹ گزشتہ تین صدیوں سے قومی ریاست رہا ہے، لیکن گلوبل سسٹم کا یہ عمارتی بلاک اب بجائے خود تبدیلیوں کی زد میں ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے ارکان کی موجودہ تعداد میں سے اندازاً ایک تہائی ممالک کو اب بڑی اہم باغیانہ تحریکوں، علیحدگی پسندوں یا جلاوطن حکومتوں کا سامنا ہے۔ میاغر سے لے کر جس کے مسلمان اور مسلح کیرن باغی ملک چھوڑ کر ملائشیا کی طرف بھاگ رہے ہیں جہاں ٹوارگ قبائل آزادی کے مطالبے پر ڈٹے ہوئے ہیں اور آذربائیجان سے زائرے تک موجودہ ریاستیں قوم پرستی کے دور سے پہلے کے قبائلی نظام کے سے حالات کا سامنا کر رہی ہیں، اگرچہ اس نظام کا مطالبہ کرنے والوں کے نعروں میں قوم پرستی کا ذکر بھی موجود ہوتا ہے۔

وارن کرسٹوفر نے وزیرخارجہ کا عہدہ سنبھالنے سے قبل سینیٹ کی تعلقات خارجہ کی کمیٹی میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا (وارن کرسٹوفر کو کسی طرح بھی دہشت گردی میں ملوث یا افواہیں پھیلانے والا شخص قرار نہیں دیا جا سکتا) اگر ہم جلد ہی ایسا کوئی طریقہ نہ ڈھونڈ سکے جس پر عمل کر کے مختلف نسلی گروہ کسی ملک میں اکٹھے رہ سکیں......تو پھر آج کے سوسوا سو ملکوں کی بجائے اس کرہ ارض پر آئندہ ہمیں پانچ ہزار ملکوں کا وجود برداشت کرنا ہوگا......

سنگاپور میں ہم نے کیمرج اور ہارڈورڈ کے تعلیم یافتہ 37 سالہ بریگیڈیئر جنرل، ڈپٹی پرائم منسٹر اور ایک تیزطراز دانشور جارج یاؤ سے اس موضوع پر بات چیت کی۔ اس کا خیال ہے کہ مستقبل کا چین سنگاپور جیسی سنکڑوں شہری ریاستوں پر مشتمل ہوگا۔

آج کی بہت سی ریاستوں کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا یقینی ہے یا پھر یہ طے ہے کہ ان کی شکل بدل جائے گی اور اس عمل کے نتیجے میں جو نئے یونٹ وجود میں آئیں گے، وہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جدید اصطلاح میں قوم کہلانے کے روادار نہیں ہوں گے بلکہ متنوع قسم کی شکلوں میں سامنے آئیں گے جن میں قبائلی وفاقوں سے لے کر تیسری لہر کے زمانے تک کی شہری ریاستیں شامل ہوں گی۔ اس وقت میں اقوام متحدہ بھی جزوی طور پر شاید سابق ریاستوں کے کلب یا معاشرتی لغزش کی پیداوار قوموں پر مشتمل ادارے کی صورت ہی میں باقی رہ سکے۔ دوسری قسم کے سیاسی یونٹ بھی قوموں کی تہمت اپنے اوپر شاید آرائشی سازوسامان کی صورت ہی میں قبول ہیں۔

لیکن افق پر صرف یہی تبدیلی لہراتی نظر نہیں آ رہی ، اعلی ٹیکنالوجی کی دنیا میں قوم کی اقتصادی بنیاد بھی اندر سے کھوکھلی ہو کر کھسک رہی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں وہاں اب قومی منڈیاں ، مقامی ، علاقائی اور گلوبل منڈیوں کے مقابلے میں کم اہمیت کی حامل رہ گئی ہیں۔ پیداوار کی سطح پر بھی اب یہ بتانا قریب قریب ناممکن ہوگیا ہے کہ کسی خاص ملک نے کونسی کار یا کمپیوٹر تیار کیا ہے کیونکہ اس کے پرزے اور سافٹ ویئر مختلف ممالک اور ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں۔ نئی اقتصادیات کا اہم ترین شعبہ اب قومی نہیں رہا۔ اب نیم قومی یا قومیتوں سے بالاتر یا پھر بین لاقوامی شعبوں کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

اس سے بڑھ کر غور کے قابل اور کیا بات ہوگی کہ جب غریب، کمزور اور کچھ بننے کی کوشش میں لگے ہوئے گروپ سلیت کا مطالبہ کر رہے ہیں تو دنیا کی انتہائی طاقت ور اور اقتصادی لحاظ سے ترقی یافتہ ریاستیں اپنا مقام کھو رہی ہیں۔ انتہائی طاقتور حکومتیں اور ان کے بنک بھی اب الیکٹرانک سرمائے کی یلغار کے مقابلے میں اپنی کرنسیوں کی شرح کنٹرول کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ وہ تو اب اپنی سرحدوں کی حفاظت بھی اس طرح نہیں کرسکتیں جیسے ماضی میں کرتی رہی ہیں۔ درآمدات اور تارکین وطن پر جب وہ اپنے دروازے بند کرنے کی کوشش کرتی ہیں......اگرچہ یہ دونوں ہی مشکل کام ہیں......تو ٹیکنالوجی کے لحاظ سے اعلیٰ ترقی یافتہ یہ قومیں باہر سے سرمائے، دہشت گرد، اسلحہ، منشیات، کلچر، مذہب، پاپ میوزک، نظریات، انفرمیشن اور بہت کچھ اور کے اندر کی طرف آنے والے بہاؤ کو روکنے میں کلیتاً ناکام رہتی ہیں۔1950ء میں دنیا بھر کے ڈھائی کروڑ افراد نے اپنے اپنے ملکوں کی سرحدوں سے باہر کا سفر کیا تھا،1980ء کے ایک سال میں یہ تعداد ساڑھے بتیس کروڑ تک پہنچ گئی تھی......غیرقانونی طور پر سفر کرنیوالوں کی کثیر تعداد اس کے علاوہ تھی۔ یہ طے ہے کہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قومی ریاستوں کی پرانی اور سخت سرحدیں تیزی کے ساتھ منہدم ہو رہی ہیں۔

یوں صورت یہ بنتی ہے کہ گلوبل سسٹم کے جس عنصر کو اب تک سب سے اہم اور بنیادی سمجھا گیا ہے وہ ٹوٹ رہا ہے۔ اس میں اور بھی بہت سی ریاستیں شامل ہیں لیکن تمام تر دعووں کے باوجود وہ قوموں کی تعریف پر پوری نہیں اترتیں۔

کچھ ایسی ہیں جیسی کہ کا کیشیا میں واقع سابق سوویت ری پبلک ''شکیر''۔ جو قوم بننے سے پہلے ہی کچھ بننے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے اور جس کا تعلق پہلی لہر کے زمانے کے معاشروں سے ہے جو مقامی جنگ باز سرداروں کی وجہ سے مختلف حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ دوسری سطح دوسری لہر کے زمانے کی اقوام پر مشتمل ہے اور تیسری لہر کے زمانے کی قوموں میں وہ ابھرتی ہوئی اقوام ہیں جو ایک نئی قسم کا سیاسی وجود رکھتی ہیں۔ نرم سرحدوں والی قومی ریاستوں کے زمانے کے بعد کی ریاستیں ہیں حقیقتاً یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ قوموں کی بنیاد پر تشکیل پانے والے گلوبل سسٹم کی سہ سطحی بنیاد پر قائم ریاستوں میں تبدیلی کا عمل ہے۔

اعلیٰ ٹیکنالوجی کے جزیرے

اس نئے سسٹم کی تیسری سطح پر جلد ہی شامل ہونے والوں میں علاقائی ''ٹیکنو پولز'' شامل ہیں۔ یورپی کمیونٹی کے لئے پیش گوئی کرنے والے ادارے سائنس اور ٹیکنالوجی کے ڈائریکٹر ریکارڈو پیٹریلا کے الفاظ ہیں، ''عبوری تجارتی کمپنیاں......ایسے نیٹ ورک تشکیل دے رہی ہیں جو قومی ریاستوں کے فریم ورک کو آسانی سے پھلانگنے کے قابل ہوں گے......''

''اکیسویں صدی کے وسط تک جرمنی، اٹلی، امریکہ اور جاپان جیسی قومی ریاستیں، سماجی اور اقتصادی وجود کے طور پر مزید اہمیت کی ہرگز حامل نہیں رہیں گی، نہ ہی ان کی فیصلہ کن سیاسی اہمیت باقی رہے گی۔ ان کی بجائے ایسے علاقے جیسے کیلیفورنیا کی اورنج کاؤنٹی، اوساکا (جاپان) فرانس کی وی لائی اون ریجن یا جرمنی کا روبرگ بیتے وغیرہ علاقے سماجی اور اقتصادی لحاظ سے غلبہ حاصل کر لیں گے......یہی علاقے مستقبل کی فیصلہ کن قوت ہوں گے......اور یہی علاقائی حکومتوں کے ساتھ اتحاد کرنے والی علاقائی کمپنیوں کے پشت پناہ ہوں گے...... وہ کہتا ہے: ''یہ یونٹ مفلس وفادار انسانیت کے بحر بیکراں میں اعلیٰ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ٹیکنالوجی پر مشتملمجمع الجزائر کی حیثیت اختیار کر لیں گے۔''

یہ علاقائی یونٹ ان علاقوں میں جہاں تیسری لہر ترقی یافتہ شکل میں پہنچ چکی ہے، اقتصادی طور پر بھی قابل عمل ہو جائیں گے۔ دوسری لہر کے زمانے کی معیشت میں جہاں قومی مارکیٹوں کے لئے وسیع پیمانے پر پیداوار کے طریقے رائج ہیں، اقتصادی لحاظ سے یہ یونٹ قابل عمل نہیں رہیں گے۔ ان میں اب تک پہلی لہر کے زمانے کے معاشروں کا سخت مرکزیت پر مبنی کردار کا عکس نظر آتا ہے، البتہ اب اس میں اعلیٰ ٹیکنالوجی کے اثرات بھی نمایاں ہونے لگے ہیں۔

افسر، راہب اور مُلّا

گلوبل سسٹم میں قوت اور طاقت کے حصول کے دو اور داعیوں میں بڑی بڑی کارپوریشنیں اور مذاہب شامل ہیں اور ان دونوں کی پہنچ اور امکانات میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ یونی لیور جیسی کارپوریشن جس کی پانچ سو ذیلی کمپنیاں 75 ممالک میں کام کر رہی ہیں یا ایک دن میں جس کی آمدنی کا 75 فیصد حصہ امریکی سرحدوں کے باہر سے آتا ہے یا آئی بی ایم، سیمنز اور برٹش پٹرولیم ایسے ادارے ہیں جنہیں ''قومی'' کہنا اب محض مذاق ہوگا۔

اے ٹی اینڈ ٹی، ٹیلی فون کی دنیا میں سب سے بڑی کمپنی ہے جس کا اندازہ ہے کہ دنیا میں دو ہزار سے تین ہزار تک جناتی کمپنیوں کو اس کی خدمات درکار ہیں۔ اقوام متحدہ 35 ہزار فرموں کو عبوری قرار دیتی ہے......ان کمپنیوں سے مزید ڈیڑھ لاکھ کمپنیوں کا الحاق ہے۔ اس طرح یہ نیٹ ورک اتنی وسعت اختیار کر گیا ہے کہ اب دنیا کی تجارت کا تقریباً چوتھائی حصہ اسی کی ملحقہ کمپنیوں کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ اس بڑھتے اور پھیلتے ہوئے اجتماعی وجود کو قومی ریاست کی حدوں تک محدود رکھنا ممکن ہی نہیں ہے اور یہی کل کے گلوبل سسٹم کا اہم ترین جزو بھی ہے۔

اس طرح عالمی مذاہب کا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ ہے۔ اسلام سے لے کر روسی بنیاد پرستی اور نئے زمانے کے روزافزوں مذہبی فرقے جو شمار ہی میں نہیں آتے، لیکن یہ سب اکیسویں صدی کے عالمی نظام میں کلیدی کھلاڑیوں کے فرائض انجام دیں گے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گالف کھیلنے والوں سے محنت کشوں تک

ٹیکنالوجی میں حصہ دار بننے والی علاقائی قوتیں، کارپوریشنز اور مذاہب جو دوسری قسم کا یونٹ ہے، ریاستوں سے زیادہ اہمیت اختیار کر رہا ہے۔ عبوری ایسوسی ایشنیں اور تنظیمیں اب ہزاروں کی تعداد میں اس طرح سامنے آ رہی ہیں جیسے بارش کے بعد کھمبیاں یکا یک نمودار ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر کو اگرایٹمی طبیعیات دان گالف کے کھلاڑی، آرٹسٹ، لوہے کے کارخانوں کے یونین بردار کارکن، ادیب مختلف صنعتی گروپوں سے جن میں پلاسٹک کی صنعت، بنکنگ، صحت کے مسائل سلجھانے والے، ٹریڈ یونینسٹ اور ماحولیاتی گروپ وغیرہ سبھی شامل ہیں، ان سب کے مفادات اب قومی مفادات سے الگ ہیں اور ان سب کی اپنی گلوبل تنظیمیں اور اپنے اپنے ایجنڈے ہیں۔ این جی اوز یا غیر سرکاری ادارے، عالمی نظام کی تربیت وتشکیل بھی اب زیادہ بھرپور حصہ لے رہے ہیں اور ایک خاص طبقے کی حیثیت میں متعدد دوسری عبوری اور سیاسی تحریکوں میں بھی حصے دار ہیں۔

اس کی ایک واضح مثال ''گرین پیس'' نام کا ادارہ ہے۔ یہ ایک ایسی ماحولیاتی تنظیم ہے جس کو بہت زیادہ سرمایہ فراہم کیا گیا ہے۔ اس کا شمار بھی نئے اور اہم سرگرم عمل گلوبل کھلاڑیوں میں سے ایک میں کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بیشتر انتہائی نستعلیق، کمپیوٹروں اور منعکس مشینوں وغیرہ سے لیس ہیں اور ان کی رسائی سپر کمپیوٹر نیٹ ورکس اور خلائی رابطوں میں استعمال ہونے والی نشریاتی آلوں اور ترقی یافتہ مواصلات کے دیگر تمام ذرائع تک ہے۔ جب ڈریسڈن (جرمنی) میں ''سر منڈے غنڈوں نے'' ہمسائے میں مقیم ایک تارک وطن پر حملہ کیا تو اس واقعہ کی خبر کام ٹیک نام کے ایک برقی نیٹ ورک کے جو جرمنی اور آسٹریا کے پچاس مقامی کمپیوٹروں کو ملا کر بنایا گیا تھا، ذریعے باہر نکلی۔ وہاں سے یہ برطانیہ کے گرین نیٹ کے ہاتھ لگی جس کا الحاق شمالی اور جنوبی امریکہ سے لے کر سابق سوویت روس کی ری پبلکس میں واقع ''پروگریسو'' نامی نیٹ ورکس کے ساتھ ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چشم زدن میں ڈریسڈن کے اخبارات فیکس کے ذریعے، اس حملے کے خلاف آنے والی احتجاجی پیغامات کے طوفان میں غرق ہوکر رہ گئے۔

لیکن ملکی سرحدوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کام کرنے والے نیٹ ورکس، محض امن کے لئے کام کرنے والے اور تشدد کے مخالفوں ہی کی اجارہ داری میں نہیں ہیں بلکہ یہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نیٹ ورکس تو ماحولیاتی انتہا پسندوں سے لے کر بائبل پڑھنے والے پاکبازوں، فاشٹوں، جرائم کے سنڈیکیٹوں اور ہیرو کے سنیڈرو لیومی فوسو کے چاہنے والے دہشت پسندوں سبھی کے لئے رابطے کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور یہ سب تیزی سے پھیلتی ہوئی ایک عبوری شہری سوسائٹی کا حصہ نظر آتے ہیں جو شاید ہمیشہ شرافت کا مظاہرہ نہیں کرسکیں گی۔

گلوبل سسٹم یہاں بھی تین حصوں میں بٹا ہوا نظر آتا ہے۔ پہلی لہر کے معاشرے میں عبوری تنظیمیں کمزور یا نہ ہونے کے برابر ہیں، دوسری لہر کے زمانے کے معاشروں میں ان کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے اور تیسری لہر کے زمانے کے معاشرے میں ان کی تعداد انتہائی تیز رفتاری سے بڑھتی ہے۔

مختصر طور پر بات یہ بنتی ہے کہ پرانے گلوبل سسٹم کی جو قومی ریاستوں کے ''چپ'' کے گرد بڑی صفائی اور نزاکت سے تعمیر کیا گیا تھا، جگہ اکیسویں صدی کا گلوبل کمپیوٹر لے رہا ہے..... جو ایک سہ سطحی ''مادر بورڈ'' کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں ہزاروں لاکھوں نوع بنوع قسم کے چپس نصب کئے ہوئے ہوتے ہیں۔

عالمی نظام کے عناصر کو اب ایک نئے طریقے کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے۔ روایتی دانش آج بھی بہ اصرار، ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اقوام عالم کا ایک دوسرے پر انحصار زیادہ بڑھ رہا ہے، مگر یہ بیان گمراہ کن اور سادہ لوحی پر مبنی ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ کچھ ممالک باقی دنیا سے بہتر طور پر مربوط ہیں اور کچھ معمولی اور کمتر انداز میں۔

پہلی لہر کے ممالک میں سے کچھ ملک کسی دوسرے ملک یا ملکوں سے زرعی سامان اور خام مال خریدنے کے لئے اس پر انحصار ضرور کر سکتے ہیں۔ زمبیا اپنا تانبہ فروخت کرتا ہے، کیوبا چینی بیچتا ہے اور بولیویا ٹن باہر بھیجتا ہے لیکن ان کی معیشتیں یک رخی ہیں۔ ایک فصل پر مشتمل زراعت، ایک یا چند ایک ذرائع پر زیادہ توجہ ایک فالج زدہ صنعتی شعبہ اور سروسز کے غیر معیاری ہونے کی وجہ سے انہیں باہر کی دنیا سے تعلقات قائم کرنے کی ضرورت کم محسوس ہوتی ہے۔ ایسے ممالک بالعموم باہمی انحصار اور باہمی میل جول کے معاملے میں سست روی کا شکار رہتے ہیں۔

رہے دوسری لہر کے زمانے کے ممالک، چونکہ ان کی معیشتیں اور سماجی ڈھانچے زیادہ پیچیدہ ہوتے ہیں، اس لئے انہیں باہر کی دنیا سے رابطوں کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کے باوجود صنعتی اقوام میں باہمی انحصار محدود پیمانے پر ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ امریکہ کا 1930ء تک، دوسرے ملکوں کے ساتھ صرف 34 معاہدوں کے ذریعے رابطہ تھا۔ 1968ء میں جب اس کی معیشت تیسری لہر کے زمانے میں داخل ہو چکی تھی، امریکہ 282 ایسے معاہدوں کا پابند تھا۔ دھواں اگلتی کمپنیوں والے ممالک ظاہر ہے، عام طور سے باہمی انحصار کے زیادہ ضرورت مند ہوتے ہیں۔

تیسری لہر کے زمانے کے ممالک اس کے مقابلے میں ہائی ٹیکنالوجی والے ممالک کو بہتر اور اعلیٰ سطحی رابطوں پر مجبور کرتے ہیں۔ داخلی لحاظ سے جیسا کہ ہمیں معلوم ہے، یہ ممالک اقتصادی توڑ پھوڑ اور تعمیرنو کے تکلیف دہ عمل میں سے گزر رہے ہیں۔ جناتی کارپوریشنیں اور سرکاری نوکرشاہی، تنظیم نو، توڑ پھوڑ یا اہمیت میں کمی کے مسائل سے دوچار ہوتی ہیں۔ ان کی جگہ لینے کے لئے نئی قومتیں سامنے آتی ہیں۔ ہر قسم کے چھوٹے چھوٹے یونٹ تعداد میں بڑھتے ہیں اور عارضی اتحاد قائم کرنے کے علاوہ کنسوریشم وغیرہ کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے اور اس طرح معاشرے میں شرحی اور قدری تنظیموں سے باہر نکلنے والے اور سبھی باہر سے اندر آنے والے راستوں کو بند کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ وسیع پیمانے کی پیداوار کا معاشرہ جوں جوں سکڑتا ہے، منڈیاں بھی چھوٹی سے چھوٹی ہوتی جاتی ہیں۔

یہ داخلی عمل جس کا تفصیلی ذکر اس کتاب کے شروع ہی کے ایک باب میں ہو چکا ہے، اپنی جگہ معاشرے کے خارجی رشتوں پر اثرانداز ہوتا ہے۔ جوں جوں یہ کھلتا ہے، کمپنیاں، سماجی اور نسلی گروہ، ایجنسیاں اور ادارے باہر کی دنیا سے مختلف اور متنوع قسم کے تعلقات قائم کر لیتے ہیں، جیسے جیسے وہ مختلف ماخذ رکھنے والے اداروں کی شکل اختیار کرتے جاتے ہیں، جتنا زیادہ وہ سفر کرتے ہیں، مال کی درآمد برآمدتنی بڑھاتے ہیں باہر کی دنیا سے رابطہ بڑھاتے اور دنیا کے دوسرے حصوں سے معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں ویسے بھی وہ مشترکہ منصوبے بناتے، اتحادیوں سے معاہدے کرتے، کنسوریشم تربیت دیتے اور سرحدوں سے باہر کے لوگوں کے ساتھ مل کر کمپنیاں بنانے میں لگ جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس طرح وہ اعلیٰ سطحی رابطوں کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ 1970ء کے عشرے کے آغاز کے ساتھ ہی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

امریکہ اور دنیا کے دوسرے ملکوں کے درمیان سمجھوتوں اور معاہدوں میں تیز رفتاری کھل کر آئی۔ آج امریکہ ایسے ایک ہزار سے زائد معاہدوں کا پابند ہے اور سمجھوتوں کی تعداد تو لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ ان میں ہر ایک کو بجا طور سے فائدہ مند قرار دیا جاتا ہے لیکن ان میں سے ہر ایک امریکہ کے رویے پر کچھ پابندیاں بھی عائد کرتا ہے۔

اس لئے اس طرح ہمارا رابطہ ایک نئے اور پیچیدہ گلوبل سسٹم سے پڑتا ہے جس کی ترتیب میں خطوں، کارپوریشنوں، مذاہب، غیر سرکاری اداروں اور سیاسی تحریکوں کا عمل دخل ہے، ان میں سے ہر ایک کے مفادات الگ الگ ہیں اور یہ سبھی ایک دوسرے پر اثر ڈالنے کے مختلف مدارج میں ہیں۔

اعلیٰ سطحی ارتباط ایک حیرت انگیز اور خلاف قیاس حقیقت کو، جسے اب تک نظرانداز کیا گیا ہے، جنم دیتا ہے...... یہ حقیقت ہے کہ اپنی ترقی یافتہ معیشتوں کی بقا کے لئے جاپان، امریکہ اور یورپ کو باہر کی دنیا سے باہمی انحصار پر مبنی قریبی تعلقات قائم کرنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ یوں ہم ایک بڑی عجیب قسم کی دنیا تخلیق کر رہے ہیں جس میں انتہائی طاقتور ممالک خارجی جکڑ بندیوں میں سختی سے بندھے ہوئے ہیں۔ اس حیرت زدگی کے عالم میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سب سے زیادہ طاقتور ملک آزادی عمل سے محروم ہیں جبکہ چھوٹی ریاستیں جن کا خارجی رشتوں پر انحصار کم ہے۔ ان کے ذرائع خواہ محدود ہی کیوں نہ ہوں لیکن اکثر وہ اپنی صف بندی کرنے میں، نسبتاً زیادہ آزاد نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ ننھی منھی ریاستیں بھی اکثر امریکہ کو مشکلات میں ڈال دیتی ہیں۔

گلوبل کلاک کی رفتار

اس کے علاوہ جوں جوں ہم ''مادر بورڈ'' میں مختلف اور متنوع قسم کے اجزا جوڑتے اور ان کو مختلف طریقوں سے ملاتے ہیں تو ظاہر ہے، اس عمل میں ہم اس کے داخلی کلاک کو بھی از سرنو سیٹ کر رہے ہوتے ہیں۔ یوں نیا گلوبل سسٹم، تین ایسی رفتاروں میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے جو ایک دوسری سے قطعاً مختلف ہیں۔

تاریخ کے اس لمحے کو کوئی چیز اس کے گزشتہ دور سے اتنے حیرت انگیز طریقے سے علیحدہ نہیں کرتی جتنی کہ تبدیلی کی رفتار میں تیزی۔ کئی برس قبل جب ہم نے پہلی کتاب

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''فیوچر شاک'' میں اس نکتے پر زور دیا تھا، اس وقت تک اس بارے میں ابھی دنیا کو قائل کرنے کی ضرورت تھی کہ حالات و واقعات میں تیز رفتاری آ گئی ہے۔ آج اس بارے میں شک و شبے کا اظہار کرنے والے لوگ بہت کم نظر آتے ہیں۔ یہ حقیقت کہ اب واقعات کی رفتار میں ایسی تیزی آ گئی ہے جو آسانی سے محسوس کی جاسکتی ہے۔

اس تیز رفتاری کا جو جزوی طور پر مواصلات کی تیز رفتار کی رہین منت ہے۔ ایک مطلب یہ بھی ہوا کہ لفظی گرم بازار، حقیقت کا روپ بھی اختیار کر سکتی ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ دنیا ایک ہی رات میں جنگ کی لپیٹ میں آ جائے۔ ڈرامائی واقعات فوری عمل کا تقاضا کرتے ہیں اور بیشتر اس کے کہ حکومتوں کو ان کے ہضم کرنے کی توفیق ہو۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ سیاستدانوں کو ان چیزوں کے بارے میں فیصلے دینے پر زیادہ مجبور کیا جا رہا ہے جن کے بارے میں تیزی سے رونما ہونے والے واقعات کی وجہ سے ان کے علم میں برابر کمی ہو رہی ہے۔

لیکن رابطوں کی طرح تیز رفتاری کا عمل بھی پورے گلوبل سسٹم میں جاری و ساری نہیں ہے۔ زندگی کی عام رفتار تمام چیزوں سمیت یعنی تجارتی لین دین کی رفتار سے لے کر سیاسی تبدیلی کی لہر تک، ٹیکنالوجیکل اختراعات اور وسرے مختلف النوع معاملات کی رفتار زرعی معاشرے میں انتہائی کم ہے۔ صنعتی معاشروں میں یہ اس سے زیادہ ہے اور تیسری لہر کے زمانے کی معیشتوں کی طرف بڑھتے ہوئے ممالک پوری برق رفتاری سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

یہ انقلابات اس دنیا کے بارے میں انتہائی مختلف قسم کی آراء کے اظہار کا سبب بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر بیشتر امریکیوں کے لئے جن کی زندگی کی رفتار کرہ ارض پر سب سے تیز ہے اور جن کے وقت پر سخت پہرے ہیں، یہ سمجھنا اور عرب اسرائیلیوں کے محسوسات سے ہم آہنگ ہونا قطعاً مشکل ہے۔ جو اپنی دو ہزار برس پرانی پوزیشنوں کے دفاع میں جنگ لڑ رہے ہیں۔ امریکیوں کے نزدیک تو تاریخ تیزی کے ساتھ اپنے آپ ہی میں گم ہو جاتی ہے اور محض فوری اور وقتی حقیقتیں ہی باقی رہ جاتی ہیں۔ وقت کے شعور اور وقوف کے پس منظر میں ایسے اختلافات جنگ کے بارے میں سٹریٹیجک سوچ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ امریکیوں کے بے صبرے پن سے واقف ہونے کی بناء پر صدام حسین کو یقین تھا کہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

امریکیوں میں لمبی جنگ لڑنے کا حوصلہ نہیں ہے، (وہ درست بھی ثابت ہوسکتا تھا لیکن اسے امریکیوں سے جو جنگ لڑنی پڑی وہ خاصی مختصر تھی)۔ اس طرح جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، تیسری لہر کے زمانے کی جنگ کی شکل فضائی پہنائی کی حقیقتوں کے عناصر پر زیادہ زور دیتی ہے لیکن اس کا زیادہ انحصار مواصلات اور نقل وحرکت کی رفتار پر ہے۔

اس کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہم سہ سطحی گلوبل سسٹم تعمیر کر رہے ہیں لیکن یہ ایسا سسٹم ہوگا جس کا قیام تین مختلف رفتاروں پر ہوگا۔

بقا کے تقاضے

اس عمل تثلیث یا تین حصوں میں بانٹے جانے کی مشق سے ایسی تبدیلیاں رونما ہو سکتی ہیں جن کی وجہ سے متعدد ممالک آنے والے زمانے میں زندہ رہنے یا ختم ہو جانے کے مراحل سے دوچار ہوں گے۔ تمام ممالک اپنے اپنے شہریوں کا تحفظ چاہتے ہیں۔ اس کے لئے انہیں توانائی، خوراک، سرمایہ اور سمندر اور فضائی ٹرانسپورٹ کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن اس سے بڑھ کر کچھ اور دوسرے عناصر بھی ہیں جن کی وجہ سے ان کی ضرورتوں کا دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔

پہلی لہر کے زمانے کی معیشتوں کے لئے زمین، توانائی، آبپاشی کے خاطر پانی تک رسائی، خوردنی تیل، برے وقتوں کے لئے خوراک، تھوڑی بہت شرح خواندگی اور نقد آور فصلوں یا خام مال کے لئے منڈیاں ہی عام طور پر ان کی بقا کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ صنعتوں اور برآمد کے قابل مال کے نہ ہونے اور علم کی بنیاد پر وجود میں آنے والے جذبات کے فقدان کی وجہ سے وہ اپنے قدرتی ذرائع ہی کو جن میں بارش اور جنگلات سے لے کر ماہی گیری کے لئے جوہڑ تک شامل ہیں، اپنا اثاثہ سمجھتی ہیں۔

دوسری لہر کے زمانے کی ریاستیں جن کا ابھی تک سستی جسمانی لیبر اور وسیع پیمانے کی پیداوار پر انحصار ہے، مستحکم قومی معیشتوں کی محتاج ہیں۔ یہ چونکہ زیادہ تر شہری معاشروں میں قیام پذیر ہیں اس لئے انہیں بہت زیادہ خوراک درآمد کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ خواہ یہ ان کے اپنے دیہی علاقوں سے لائی جائے یا بیرون ملک سے، فی پیداواری یونٹ کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لئے ان کو توانائی کی زیادہ کھپت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے کارخانے چلتے رہیں، اس کے لئے ان کو بڑی مقدار میں خام مال بھی درکار ہوتا ہے۔ فولاد، سیمنٹ، لڑکی، لوہا، پیٹرو کیمیکل وغیرہ کے کارخانوں کے لئے وہ گلوبل کارپوریشنوں کی ایک چھوٹی سی تعداد کے گھر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فضائی آلودگی اور دوسری ماحولیاتی خرابیوں کی ذمہ دار بھی وہی ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں اپنی وسیع پیمانے پر ہونے والی پیداوار کی کھپت کے لئے برآمدی منڈیوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔

تیسری لہر کے قومی کردار کے بعد کی ریاستی شکل، گلوبل سسٹم کی سب سے نئی سطح ہے۔ زرعی ملکوں کی طرح انہیں وسیع رقبوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صنعتی ممالک کی طرح انہیں خود اپنے وسائل کی محتاجی کا سامنا بھی نہیں ہوتا۔ (جب دوسری لہر کے جاپان کے پاس یہ ذرائع موجود نہیں تھے کہ اسے کوریا، منچوریا اور وسائل سے پُر کچھ دوسرے علاقوں پر قبضہ کرنا پڑا تھا۔ لیکن تیسری لہر کے زمانے کا جاپان نوآبادیاتی اور اپنا خام مال نہ ہونے کے باوجود پہلے سے کہیں زیادہ امیر ہے)۔

تیسری لہر کے زمانے کی ''پوسٹ نیشنز'' یا قومی کردار کے بعد کی شکل والی قوموں کو بہرحال توانائی اور خوراک کی ضرورت تو ہے لیکن اب انہیں جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ایسا علم ہے جسے وہ دولت میں بدل سکیں۔ انہیں دنیا کے ڈیٹا بنکوں، مواصلاتی نیٹ ورکس تک رسائی ان پر کنٹرول کی ضرورت ہے۔ انہیں خفیہ ذرائع پر مبنی پیداوار اور خدمات، مالی سروس، انتظامی مشاورت......سافٹ ویئر، ٹیلی ویژن پروگرامنگ......بنکنگ، ریزرویشن سسٹم، کریڈٹ، انفرمیشن، انشورنس، ریسرچ، نیٹ ورک انتظامیہ، انفرمیشن سسٹم، استحکامی رابطوں، اقتصادی جاسوسی،......تربیتی نظام اور ایسی تمام انفرمیشن اور ٹیلی کمیونیکیشنز ٹیکنالوجی کے لئے جس پر ان سب کا انحصار ہو، منڈیوں کی بہرحال ضرورت ہے۔

دانشورانہ پیداوار کے بچاؤ کے لئے قزاقی سے تحفظ بھی انہیں درکار ہے اور جہاں تک ماحولیات کا تعلق ہے، انہیں بغیر بگڑی ہوئی پہلی لہر کے زمانے کے ممالک کی صاف شفاف فضا چاہیے جس میں ان کے جنگل، آسمان اور سبزہ زار، عالمی مفاد میں محفوظ رکھے جا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سکیں، خواہ اس کے لئے کسی وقت اقتصادی ترقی کی رفتار کم ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔

پہلی، دوسری اور تیسری لہر کی معیشتوں کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کا عکس ''قومی مفاد'' کے ایک قطعاً مختلف تصور میں ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس کی وجہ سے آنے والے برسوں میں متعلقہ ممالک ہیں، شدید کشیدگی پیدا ہونے کے امکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

جب ہم ان تمام تبدیلیوں کو یکجا کرتے ہیں......ایسے یونٹوں کے درمیان جو سسٹم تشکیل دیتے ہیں، ان کے رابطوں، ان کی رفتار اور ان کی بقا کی ضرورتوں کے درمیان اختلافات ظہور پذیر ہوتے دیکھتے ہیں تو ہم ایسی انقلابی تبدیلی تک پہنچ جاتے ہیں جو سرد جنگ کے زمانے سے پیدا ہونے والی ضرورتوں سے کہیں آگے کی چیز ہے۔ مختصراً یوں ہم اکیسویں صدی کے گلوبل سسٹم تک آ جاتے ہیں اور یہ وہ اکھاڑہ ہے جس میں کل کی جنگ اور تدارک جنگ کی لڑائیاں لڑی جائیں گی۔

توازن کا خاتمہ (تاریخ کا نہیں)

اس گلوبل سسٹم کے بارے میں دوسری لہر کی تھیوری یہ مفروضہ پیش کرتی تھی کہ یہ ایک متوازن سسٹم ہے اور یہ کہ خرابی کی صورت میں ازخود اصلاح کرنے والے عناصر اس کے اندر موجود ہیں اور یہ بھی کہ اگر کبھی یہ غیر مستحکم نظر آتا ہے تو اسے محض قاعدے میں استثناء کی مثال سمجھنا چاہیے۔ بدقسمتی سے جنگیں، بغاوتیں اور ابھرتی ہوئی تحریکیں، محض اضطراب اور بے قراری کا اظہار ہیں جو بظاہر کبھی کبھار کسی منظم سسٹم میں دیکھنے میں آ جاتا ہے، اس کی قدرتی شرط امن ہی ہے۔

اس کرے پر نظم و ضبط کے بارے میں گلوبل آرڈر کا یہ تصور، دوسری لہر کے زمانے کے سائنٹفک نظریے سے مطابقت رکھتا ہے۔ یوں اقوام عالم، نیوٹن کے بلیرڈ کی گیندوں کی طرح ہیں جو ایک دوسری سے ٹکرا کر واپس آ جاتی ہیں۔ طاقت کے توازن کی پوری تھیوری اس نظریئے پر قائم ہے کہ اگر کوئی قوم زیادہ طاقت ور ہو جاتی ہے تو دوسری قومیں اس کے مقابلے میں اتحاد کر کے اسے واپس اس کے حصار میں بھیج دیتی ہیں اور یوں دوبارہ توازن بحال کر دیتی ہیں۔

مفروضوں کا اس سے ملتا جلتا ایک اور مجموعہ، اب خوش حال مغرب میں بہت

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مقبول ہے۔ اس میں یہ لبرل نظریہ بھی شامل ہے کہ جنگ کوئی نہیں چاہتا...... اور یہ کہ باہمی حریف ممالک ہماری ہی خواہشوں کا آئینہ ہیں...... اور یہ بھی کہ حکومتیں عام طور سے خطرے مول لینے سے گریز کرتی ہیں...... تمام اختلافات پرامن بات چیت کے ذریعے طے کئے جا سکتے ہیں، بشرطیکہ فریقین بات چیت جاری رکھنے پر آمادہ ہوں کیونکہ گلوبل سسٹم بالآخر حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

ان سب دعووں کے باوجود آج ان میں سے کوئی بھی مفروضہ درست نظر نہیں آتا۔ کوئی بیرونی خطرہ نہ ہونے کے باوجود بعض حکومتیں جنگ شروع کرنے کی خواہش مند ہوتی ہیں ارجنٹائن کے جرنیلوں نے 1982ء میں فاک لینڈ/ملویناس کی جنگ، خالصتاً سیاسی بنیادوں کی بناء پر شروع کی۔ اس وقت وہاں کسی قسم کا کوئی بیرونی خطرہ قطعاً موجود نہیں تھا۔ بہت سے سیاسی رہنما خطرات سے بھاگتے نہیں بلکہ سیاسی طور پر خطرات کے سائے ہی میں پھلتے پھولتے ہیں۔ ان کے لئے بحران سے بہتر اور کیا موقعہ ہو سکتا ہے؟

عالمی سٹیج پر زیادہ سے زیادہ کھلاڑی وہی کردار ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جسے ایک نہایت ذہین اسرائیلی پالیسی سائنٹسٹ یہزیکل ڈروانے ''کریزی سٹیٹ'' کا نام دیا تھا۔ یہ صورت خصوصی طور سے اس وقت سامنے آتی ہے جب گلوبل سسٹم کسی انقلاب کی زد میں آتا ہے۔

غیر ملکی پالیسی ساز ایسے بہت سے پنڈت جس چیز کو اب تک سمجھ نہیں پائے وہ یہ ہے کہ جب سسٹم توازن سے زیادہ دوری پر چلے جاتے ہیں تو پھر وہ عام تواعد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بازاری رویہ اپنا لیتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ خام مال کی صورت میں تھوڑی سی سرمایہ کاری بھی جناتی اثرات کی شکل میں ظاہر ہو جاتی ہے، ننھے سے ملک ڈنمارک میں، انتخابات کے موقعہ پر، ایک چھوٹے سے گروہ کے منفی ووٹ، یورپ کے استحکام کے پورے عمل میں، تاخیر کا سبب بن گئے تھے۔

دور افتادہ مقام پر لڑی جانے والی کسی چھوٹی موٹی جنگ میں اکثر غیر متوقع طور پر رونما ہونے والے واقعات اس کو چنگاری سے بگولے میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک بڑی جنگ، اقتدار کی تبدیلی اور تقسیم میں کوئی تبدیلی لائے بغیر اختتام پذیر ہو سکتی ہے۔ 1980-85ء کی ایران عراق جنگ میں مجموعی طور سے چھ لاکھ افراد ہلاک یا زخمی ہوئے لیکن یہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کسی قابل قدر تبدیلی کے بغیر ہی ختم ہوگئی، سرمایہ کاری یا سرمائے سے پیداوار کے حجم کے درمیان رابطوں میں مسلسل کمی کا رجحان نظر آتا ہے۔

عالمی نظام امن و امان ''پریگا گنین'' کا سا کردار اختیار کر رہا ہے۔ یعنی یہ زیادہ سے زیادہ اس طرح کے جسمانی، کیمیاوی اور سماجی نظام میں تبدیل ہوتا نظر آتا ہے، جس کی تفصیل نوبل پرائز حاصل کرنے والے سائنس دان، ایلیا پریگا گنین نے بیان کی تھی۔ اس شے کی دریافت کا سہرا اسی کے سر ہے جسے اس نے ''منتشر یا ضائع ہونے والے ڈھانچوں'' کا نام دیا تھا۔ ان میں سسٹم کے تمام اجزا تبدیلی کے مسلسل عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔ ہر سسٹم کے کچھ اجزاء، انتہائی خارجی دباؤ کی زد میں آ جاتے ہیں...... تیل کی قیمتوں میں تبدیلی، مذہبی جنون میں اچانک اضافہ اور ہتھیاروں کے توازن میں تبدیلی وغیرہ۔

بازگیری کے مثبت کنڈل بڑھتے رہتے ہیں...... مطلب یہ کہ بعض ''پراسس'' شروع ہونے کے بعد اپنی زندگی کا تعین خود کرتے ہیں اور یوں سسٹم میں استحکام پیدا کرنے کی بجائے اسے غیر مستحکم بنانے کا باعث ہوتے ہیں، نسلی انتقام کا جذبہ ایسے فسادوں کو جنم دیتا ہے جو بعد میں ایسی نسلی جنگوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو کسی مقررہ خطے کی برداشت کی حد پار کر جاتی ہیں، داخلی اور خارجی پالیسیوں کا ارتکاز، سسٹم کسی طور پر تباہی پر منتج ہوسکتا ہے...... یا ہر اعلیٰ سطح پر تنظیم نو کا متقاضی ہوتا ہے۔

آخری بات یہ کہ اس نازک موقعہ پر سسٹم کو استدلالی یا حقیقت پسندانہ قرار دینے کی بجائے اس کی کوئی بھی دوسری تعریف کی جاسکتی ہے۔ حقیقتاً یہ موقعہ کی اثر پذیری یا تغیر قبول کرنے کے ہمیشہ کے مقابلے میں زیادہ قریب ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس کا رویہ سخت اور شاید اندازوں سے دور ہوتا ہے۔

آیئے، پھر ہم اسے اکیسویں صدی کے گلوبل سسٹم کے لئے خوش آمدید کہیں۔ اس صاف عالمی نظام میں شمولیت کے لئے نہیں جسے ایک زمانے میں صدر بش (سینئر) نے آگے بڑھایا تھا یا سرد جنگ کے خاتمے کے استحکام پر دوسرے سیاستدانوں نے جس کا وعدہ کیا تھا۔ اس میں ہمیں وہ طاقتور تشکیلی پراسس مصروف عمل نظر آتا ہے جس سے ہمیں اپنی زندگیوں ہی میں ایک نئی تہذیب اپنی بقا کی خصوصی ضروریات سمیت، اس کے اپنے کردار اور اپنی جنگی قسم کے آثار صاف نظر آ رہے ہیں اور یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ جلد ہی ان سے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مطابقت رکھتی ہوئی امن کی قسم بھی سامنے آ جائے گی۔

ہم تاریخ کے ایک عجیب وغریب دور میں زندہ ہیں، تمامتر محرومیوں اور مایوسیوں کے عقب میں سے، آج کرہ ارض پر ہونے والی انتہائی مثبت اور انسانی جذبوں سے بھرپور تبدیلیاں رونما ہوتی نظر آ رہی ہیں۔ ایشیا پیسفک کے تمام خطوں کو تیسری لہر کے پھیلاؤ نے چکا چوند کر دیا ہے اور جہاں ان میں تجارتی اور سٹریٹجک تناؤ پیدا کیا ہے وہاں ایک ارب سے زیادہ انسانوں کو غربت کے گڑھے سے باہر نکالنے کا سامان بہم پہنچایا ہے۔1968ء اور 1990ء کے درمیان دنیا کی آبادی میں انتہائی تیز رفتاری سے اضافہ ہوا لیکن اس کی وجہ سے ہونے والی تباہی کی متوقع پیش گوئیوں کے باجود دنیا میں خوراک کی فی کس پیداوار عالمی ادارہ خوراک وزراعت کے اعداد وشمار کے مطابق یقیناً زیادہ تیز رفتاری سے بڑھی ہے اور کم خوراکی کا شکار ہونے والے لوگوں کی تعداد میں 16 فیصدی کمی ہوئی ہے۔

تیسری لہر کے زمانے کی ٹیکنالوجی کے، جس کی بنیاد کم توانائی کے استعمال اور کم آلودگی کی فضا پر ہے، استعمال سے ہم دوسری لہر کے صنعتی پیداوار اوراس کی پھیلائی ہوئی ماحولیاتی آلودگی سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ کام جو اب تک اندھی نفرت کا محتاج اور دماغ کی تباہی کا ذریعہ تھا اور کچھ ہی خوش قسمت لوگوں کے حصے میں آتا تھا، اب ایسی شکل اختیار کر سکتا ہے جس سے اچھے مقاصد کا حصول اور دماغی صلاحیتوں میں اضافے کی راہ بھی ہموار ہو سکے گی۔ ڈیجیٹل انقلاب جو تیسری لہر کے زمانے کی رفتار بڑھانے کے لئے مہمیز کا کام دے رہا ہے، اربوں افراد کی تعلیم کا اہتمام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

جنگ کے خطرات' شہری فسادات حتیٰ کہ ایٹمی حملوں تک کے متعلق اس کتاب کے صفحات میں جگہ جگہ بکھری ہوئی تنبیات کے باوجود اچھی خبر یہ ہے کہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے جانے کے بعد اگرچہ دنیا میں پچاس سے ساٹھ ہزار تک مزید ایٹم بم تیار کئے جا چکے ہیں اور اگرچہ زیر زمین ایٹمی دھماکے بھی برابر کئے جاتے رہے ہیں' لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان ہزاروں بموں میں سے کہیں غصے میں کوئی ایک بم بھی استعمال میں لانے کی کوشش نہیں ہوئی۔ انسانی زندگی کی بقا اور تحفظ کے جذبے نے اس انگلی کو قابو میں رکھا ہے جو ایٹم بم کا بٹن دبانے میں استعمال ہوسکتی ہے۔

مگر زندہ رہنے کیلئے اکیسویں صدی کی صبح طلوع ہونے پر محض جذبوں پر انحصار

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کافی نہیں ہے، ہم سب......شہریوں اور فوجیوں دونوں کیلئے یکساں طور پر علم، دولت اور جنگ کے درمیان رابطوں کے انقلابی عمل کا فہم لازمی ہے۔ یہ کتاب اگر اس رشتے کو اجاگر کرنے میں کامیاب رہی ہے تو اس کے تحریر میں لانے کا مقصد یقیناً پورا ہو گیا ہے۔ اس کے حصول کے لئے ہم نے جنگ اور تدارک جنگ کا ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے۔ اگر ہم باخبری کے شعور میں اضافہ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں یا زیادہ پرامن دنیا کے راستے میں حائل فرسودہ نظریات کو باطل قرار دینے میں ہماری کوششیں بارآور ہوئی ہیں تو ہمیں اس پر یقیناً خوشی ہوگی۔

یہ امر یقینی ہے کہ اگر ہم نے گزرے ہوئے کل کے زمانے کی دانش ہی سے کام لینے کا سلسلہ جاری رکھا تو اکیسویں صدی کے امکانات تیزی سے معدوم ہو جائیں گے۔ اس کتاب کے آغاز میں بیان کئے ہوئے لیون ٹراٹسکی کے ان الفاظ کو ہم نے اگر ایک لمحے کے لئے بھی فراموش کیا تو یہ امکانات زیادہ تیزی کے ساتھ ختم ہو جائیں گے۔ ٹراٹسکی کے الفاظ یہ ہیں: ''تمہیں جنگ سے دلچسپی ہو نہ ہو، جنگ کو تم سے ضرور دلچسپی ہے۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اظہار تشکر

دوسری بہت سی کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی بہت سے لوگوں کی مدد کے بغیر تحریر نہیں کی جاسکتی تھی۔فوج اور اس کے کلچر سے ناواقف ہونے کی وجہ سے فوجی افسران' دفاعی حکام' فوج کے تعلیمی ماہرین اور دوسرے متعلقہ لوگوں کی طرف سے ہمارے ساتھ اس موضوع پر جسے ہم انقلاب فرانس کے بعد جنگ اور امن کے کردار کے بارے میں انتہائی ڈرامائی ابھار سے متعلق موضوع قرار دیتے ہیں' بات چیت کرنے پر رضامندی ہمارے لئے بڑی خوش گوار حیرت کا باعث تھی۔ ہر جگہ ہم سے یہی پوچھا جاتا رہا کہ آنے والے عشروں میں تشدد میں کمی کیسے کی جاسکتی ہے۔

جن لوگوں نے ہماری مدد کرنے میں وقت صرف کیا یا اپنے نظریات کو ہمارے خیالات کے ساتھ ہم آہنگ پایا ان میں گریس آرون' ڈاؤ نے اندویوز' جون اور کوئیلا' جون بریڈ' کارل بلڈر' ڈک چینی' رے کلائن' جون کنالی' کلاڈس ڈینز برگ' مچل ڈیور' ولیم فارسٹر' لیوئس فرینکلن' پیرے گیلائس' نیوٹ گنگرچ' ڈان گولڈن' ینٹل گورے' جیئرم گرین رڈ' سیٹوہنسر' جیری ہیریسن' اے ہنری' ظالمے خلیل زاد' ٹام کنگ' اینڈی مارشل' اینڈی میسلگ' جینی اینڈ کرس موریس' جم پنکرٹن' جوناتھن پولاک' جوناتھن ریگن' ڈیوس رون فیلڈ' ٹم رائن' لیری سی کوئسٹ' سٹرارٹ سلاڈ' ڈون سٹیری' رابرٹ سٹہل' بل سٹرف' پال سٹریس مان' ڈین دکھنگ اور ہنری یو آن شامل ہیں۔ جیسا کہ متن میں بتایا گیا ہے' ڈان مریلی کی بیوہ بیٹی مریلی ہم پر انتہائی مہربان رہیں۔

اپنے گھر میں ہم اپنی بیٹی کرنساٹا فلر کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں جس نے مشکل حالات میں ہمارے تحقیقاتی کام کو چیک کرنے اور ببلوگرافی اور انڈکس تیار کرنے کی ذمہ داری سنبھالی۔ وقت مقررہ میں کام پورا کرنے کے لئے اس نے ان تھک محنت کی۔ ابتدائی مہینوں میں ڈیپرا براؤن نے اس وقت تک مسودے کی دیکھ بھال کی جب اسے خود ایک بالکل مختلف موضوع پر اپنی کتاب لکھنے کے لئے ہمیں چھوڑ کر جانا پڑا۔ آخری لمحوں کی بھاگ دوڑ میں رابرٹ بیسائل نے لائبریریوں کے اعداد و شمار کا شکار کرنے اور دلیری واسکوئز نے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسودے کی تیاری میں ہماری بہت مدد کی۔ بہرحال کسی ''درپردہ'' غلطی کے لئے جو اگر مسودے میں باقی رہ گئی ہے' مصنفین ہی ذمہ دار ہیں۔

جوآن گومز نے اس سارے عرصے میں یہ امر یقینی بنائے رکھا کہ کاغذ کا ہر ٹکڑا وہیں پر رہے جہاں اس کی جگہ ہے۔ اور یہ کہ ہماری کار بھی اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ وہیں ہوں جہاں ان کی ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ انٹرویو وغیرہ کے لئے صحیح طور سے وقت مقرر ہو۔ دنیا بھر سے آنے والے فون اور فیکس کے ذریعے ملنے والے پیغامات کا جواب ذہانت' مہربانی اور خوش دلی سے دیا جائے۔ اس نے ہزاروں قسم کے معمولی مگر اتنے ہی اہم دوسرے معاملات میں بھی ہماری معاونت کی۔

ہمارے پرانے دوست اور اب ٹسل براؤن میں ہمارے ایڈیٹر جم سلبر مین نے مسودے کو بہتر بنانے میں بڑی محنت کی۔ ہمارے ایجنٹ پیری نومٹن سے ہمیں بے حد و حساب مدد ملی اور کرٹس براؤن لمیٹڈ میں اس کے ساتھیوں گریس وری' ڈیو باریور اور ٹم نولٹن بالخصوص بہت مددگار ثابت ہوئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں